جلد اول

سورۃ النبا سے سورۃ الناس تک

اس میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے۔ (القرآن)

گلدستۂ تفاسیر

RAJ INTERNATIONAL Educational Institute (Regd) Trust

رب زدنی علما، یا علیم علمنی

سیف اللہ ضیاء

راج انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ

www.quranraj.com

گلدستۂ تفاسیر

تفاسیرِ قرآن حکیم

سے چُنے ہوئے موتی

تعوذ اَعُوذُ بِاللّٰہ	تسمیہ بِسۡمِ اللّٰہ	الحمد سُورۃ فاتحہ	آیت الکرسی	تیسواں پارہ

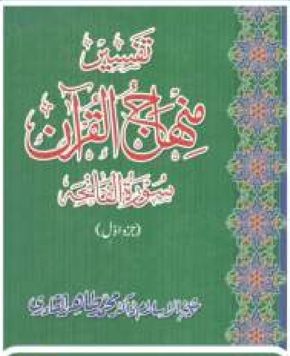
تفسیر منہاج القرآن سورۃ الفاتحہ

انوار البیان

معالم العرفان

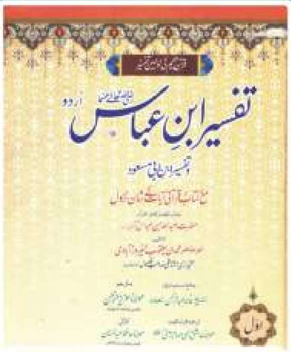
تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ

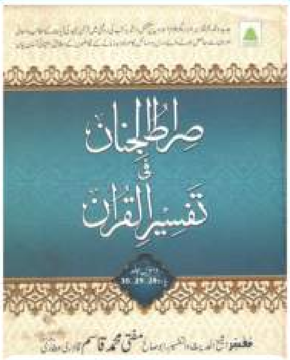
صراط الجنان فی تفسیر القرآن

تفسیر مظہری

ضیاء القرآن

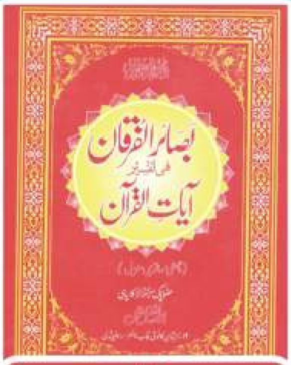
بصائر الفرقان

RAJ INTERNATIONAL Educational Institute (Regd.) Trust

حاجی سیف اللہ ضیاء

www.quranraj.com

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام	گلدستۂ تفاسیر قرآن حکیم سے چُنے ہوئے موتی
اہتمام	سیف اللہ ضیاء
کمپوزنگ	محمد ندیم رحمانی، آمنہ شفیق
اشاعت	اگست 2025ء
تعداد	ایک ہزار
قیمت	-/1000 روپے

ملنے کا پتہ

راج انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ دفتر نمبر 5، دوسری منزل،
ملک کمپلیکس بلیو ایریا، اسلام آباد
www.quranraj.com

دنیا کے کسی بھی ملک سے کتاب منگوانے کے لیے رابطہ کریں۔
0300-8551394
saifullahzia1@gmail.com

اَللّٰھُمَّ صَلِ عِلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیتَ
عَلٰی اِبرَاھِیمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبرَاھِیمَ اِنكَ حَمِیدٌ مَجِید°
اَللّٰھُمَّ بَارِك عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اَلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکتَ
عَلٰی اِبرَاھِیمَ وَعَلٰی اَلِ اِبرَاھِیمَ اِنكَ حَمِیدٌ مجِید°

اے اللہ! محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر درود بھیج اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اہل خانہ پر، جیسا کہ آپ نے ابراہیم علیہ السلام پر درود بھیجا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اہل خانہ پر بیشک آپ قابل حمد ہو، اے اللہ! محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر برکت عطا کریں اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اہل خانہ پر، جیسا کہ آپ نے ابراہیم علیہ السلام پر احسان کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اہل خانہ پر بیشک آپ قابل حمد ہو۔

انتساب

میں اپنی اس کاوش بالخیر کو

اپنے والدین، اہل وعیال

اور

ان تمام لوگوں کے نام کرتا ہوں جو

اس وقت اس کتاب کو

پڑھ رہے ہیں۔

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
1	(تعوذ) اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیم	21
2	تسبیح	21
3	تحمید	21
4	تکبیر	21
5	تہلیل	21
6	حوقلہ	22
7	حسبلہ	22
8	بسملہ	22
9	استعانت	22
10	تبارک	22
11	تعوذ	22
12	پناہ طلبی	23
13	تعوذ کی تعلیم	24
14	مسنونہ تعوذات	24
15	قرآنی تعوذات	25
16		28
17	بسم اللہ سے ابتدا	28

18	نماز میں بسم اللہ	28
19	بسم اللہ بوقتِ ذبح	29
20	ہر کام میں بسم اللہ	29
21	ب اور اسم	29
22	اللہ، رحمان اور رحیم	29
23	ٹھوکر لگنے پر بسم اللہ	30
24	اول و آخر قرآن	31
25	اسماء القرآن	31
26	قرآن	31
27	فرقان	31
28	تذکرہ	31
29	ہدایت	32
30	نور	32
31	بصائر	32
32	روح	32
33	رحمت	32
34	شفاء	32
35	موعظت	33
36	تبیان	33
37	قیم	33

38	احسن الحدیث	33
39	مثانی	33
40	برہان	34
41	الکتاب	34
42	ذکر	34
43	مسائلِ تلاوت	34
44	تلاوت قرآن کا اجر	34
45	ایصالِ ثواب	35
46	نفلی عبادت کا ثواب	35
47	قرآن پاک کا بھول جانا	35
48	تلاوت بطورِ پیشہ	35
49	ختمِ قرآن دعا	36
50	قرآن پاک کا سننا	36
51	تلاوت میں خوش الحانی	36
52	فضائلِ قرآن اور اصولِ تفسیر	37
53	اشرف کتاب	37
54	اشرف رسول	37
55	اشرف فرشتہ	37
56	اشرف زمین	37
57	اشرف مہینہ	37

58	اشرف رات	38
59	تفسیر القرآن بالقرآن	38
60	تفسیر بالفتہ	38
61	امام ابوحنیفہؒ کا طریقہ تفسیر	38
62	عبداللہ بن مسعودؓ	39
63	عبداللہ بن عباسؓ	39
64	تفسیر بالرائے	39
65	تباہی کے اسباب	40
66	سورۃ الفاتحہ	41
67	قرآن کریم کا موضوع اور سورۃ الفاتحہ	41
68	قرآن کا موضوع	41
70	اسلام کی عالمی حیثیت	41
71	اصلاح علم وعمل	41
72	مضامین سورۃ	42
73	سورۃ الفاتحہ۔۔۔۔۔۔۔۔دیباچہ قرآن	42
74	نفسِ شیطانی، بہیمی اور ملکی	42
75	ملکیت اور بہیمیت کی کش مکش	43
76	خلاصہ کتب آسمانی	43

77	اسمائے سورۃ الفاتحہ	44
78	فاتح الکتاب	44
79	سورۃ الحمد	44
80	اُم القرآن	44
81	سبع مثانی	44
82	وافیہ	44
83	کافیہ	44
84	اساس	45
85	شفاء	45
86	تعلیم المسئلہ	45
87	شکر	45
88	دعا	45
89	رقیہ	45
90	واقیہ	46
91	کنز	46
92	سورۃ الصلوۃ	46
93	سورۃ الفاتحہ	46
94	اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِین	46

95	اَلرَّحمٰنِ الرَّحِيمِ	47
96	مٰلِكِ يَومِ الدِين	47
97	اِيَّاكَ نَعبُدُ وَاِيَّاكَ نَستَعِين	48
98	الوہیت کی شرائط	49
99	اِهدِنَاالصِراطَ المُستَقِيم	53
100	صِرَاطَ الَّذِينَ اَنعَمتَ عَلَيهِم	55
101	غَيرِ المَغضُوبِ عَلَيهِم وَلَا الضَّآلِين	57
102	حروف مقطعات، حسابی کوڈ	58
103	سورۃ فاتحہ (تفسیر منہاج القرآن)	63
104	مذاہب عالم اور تصور اسم ذات	64
105	لفظ ''اللہ'' کی شان علمیت	65
106	الرَّحمٰن الرَّحیم	71
107	رحمت حق کا حقیقی تصور	74
108	تسمیہ کی عملی حکمت وافادیت	77
109	اسمائے الٰہیہ کے ذکر کی تلقین	81
110	رحمت حق سے مایوسی کی ممانعت	82
111	خلق خدا سے حسن سلوک کی تعلیم	82
112	قدرت الٰہیہ کو محیط کل سمجھنے کی تلقین	83

113	مکمل دستور حیات کی تعلیم	84
114	خوف ورجا اور توازن	84
115	مراتب عروج ونذول کی تعلیم	85
116	حقیت انسانی کی یاد کی تکمیل	86
117	سورۃ فاتحہ کے اسماء اور ان کی معنوی خصوصیات	86
118	اُم الکتاب ۔ اُم القرآن	89
119	اساس القرآن	92
120	استدلال رسالت کی دوسری وجہ	95
121	واسطۂ رسالت کے بغیر ایمان باللہ مردود ہے	96
122	سورۃ فاتحہ اور حیات انسانی کا عملی پہلو	97
123	لفظ صراط استعمال کرنے کی حکمت	98
124	اخلاقیات	99
125	عمرانیات	99
126	سیاسیات	99
127	معاشیات	100
128	مذہبیات	100
129	مضامین سورۃ فاتحہ کی منطقی ترتیب	102
130	سورۃ فاتحہ اور صفات باری تعالیٰ	104

131	سورۃ فاتحہ اور صفات عبدیت	104
132	اللہ اور بندے کا پنج جہتی تعلق	105
133	اسمائے خمسہ اور معراج انسانی	106
134	سورۃ فاتحہ اور پانچ بنیادی ضابطے	107
135	سورۃ فاتحہ بطور اجمال قرآن	110
136	سورۃ فاتحہ بطور تفصیل تسمیہ	114
137	سورۃ فاتحہ سے ارکان ایمان پر استدلال	115
138	سورۃ فاتحہ سے ارکان اسلام پر استدلال	117
139	سورۃ فاتحہ اور تشکیل شخصیت کے سات مراحل	117
140	سورۃ فاتحہ اور تعلیمات طریقت	123
141	سورۃ فاتحہ اور فرائض نبوت کی تکمیل	125
142	سورۃ فاتحہ اور تصور وحدت	127
143	حمد اور مدح میں فرق	128
144	حمد اور شکر میں فرق	130
145	جملہ اسمیہ کے استعمال کی حکمت	132
146	لفظ اللہ کی تحقیق	135
147	وحدت، وحدانیت اور توحید کا مفہوم	136
148	وحدت اور توحید میں فرق	138

149	اللہ کو کس طرح مانا جائے	140
150	نظام ربوبیت اور اصول وحدت	143
151	نظام ربوبیت اور انسانی زندگی کا کیمیائی ارتقاء	147
152	انسان واحد سے بنی نوع انسان کا ظہور	149
153	بشریت محمدی ﷺ کی جوہری حالت	151
154	العٰلمین کا مفہوم	153
155	آیت الکرسی	158
156	آیت الکرسی کے فوائد	163
157	آیت الکرسی کے عارفانہ نکات	167
158	دو موتیں	173
159	فرض اور خواہش میں کش مکش کا مرحلہ	184
160	اللہ تعالیٰ کا تصور عدل	185
161	تصور ملکیت	190
162	کارساز ذات کی بندہ نوازیاں	200
163	علم محیط خالق کی اور علم محاط بندے کی صفت ہے	201
164	علم اور معرفت میں فرق	203
165	نظام کائنات اور معرفت ربانی	212
166	مآخذ و مراجع	214

167	سورۃ النبا	222
168	مادہ اور توانائی	223
169	سورۃ النزعت	228
170	سورۃ عبس	235
171	سورۃ التکویر	239
172	سورۃ الانفطار	244
173	سورۃ المطففین	246
174	سورۃ الانشقاق	253
175	سورۃ الفجر	255
176	سورۃ البلد	261
177	سورۃ الشمس	263
178	سورۃ الیل	265
179	سورۃ الضحی	266
180	سورۃ الم نشرح	272
181	سورۃ التین	275
182	سورۃ العلق	277
183	سورۃ القدر	279
184	سورۃ البینۃ	282

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ترجمہ: اور اللہ کو پسند نہیں آتے بے انصاف (ظالم)۔

185	سورۃ الھمزۃ	287
186	سورۃ الکوثر	287
187	سورۃ الکفرون	291
188	سورۃ النصر	293
189	سورۃ اللھب	295
190	سورۃ الاخلاص	299
191	سورۃ الفلق	304
192	سورۃ الناس	305
193	سلوک وتصوف کا عملی دستور	314
194	حصول علم اور طاقت حق	315
195	کلام، طعام اور منام میں تخفیف	318
196	کثرتِ ذکر وعبادت	318
197	زیارتِ قبور	319
198	آداب ذکر	319
199	عدالت	320
200	سات نفسوں کا بیان	322
201	تاریخ جمالیات	326
202	تاثرات	337

جو شخص زیادہ نہیں بولتا اس سے گناہ بہت کم صادر ہوتے ہیں۔

عرضِ ناشر

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

آپ ﷺ نے علم و معارف کا ایسا پاکیزہ چشمہ جاری فرمایا جس سے اولا اہلِ بیتِ اطہار اور صحابہ کرام پھر تابعین، محدثین و فقہا و اولیا کے القابات کے حامل اکابرین اس امِ مسلمہ کو نصیب ہوئے۔ بلکہ غور و فکر کریں۔ ایک نہایت ناگزیر درخواست قارئین کی خدمت میں ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ اس مجموعہ کا مطالعہ صرف معلومات تک نہ کریں۔

میں اللہ کریم کا شکر گزار ہوں جس کی ذات اقدس نے مجھ جیسے خاکپائے اہلِ علم کو اس عظیم تاریخی ذخیرہ کو چننے کی توفیق عطا فرمائی۔ میں اللہ کریم سے امید کرتا ہوں کہ میری اس سعی کو اپنی بارگاہ میں مقبولیت عطا فرمائے۔ نیز میرے اور میرے والدین و اساتذہ کے لیے دارین کی سعادتوں کا ذریعہ بنا دے اور سید المرسلین ﷺ کی شفاعت سے ہم سب کو مستفید فرمائے۔ آمین

یہ صحیفہ بیک وقت کتاب بھی ہے اور علم و معرفت کا آفتابِ جہاں تاب بھی جس میں زندگی کی حرارت اور ہدایت کا نور دونوں یکجا ہیں۔ اِس کا حُسن و جمال، قلب ونگاہ کو یکساں متاثر کرتا ہے۔ اس کی تجلّیات سے دنیا و عقبیٰ دونوں جگمگا رہے ہیں۔ اس کا فیض ہر پیاسے کو اس کی پیاس کے مطابق سیراب کرتا ہے۔ اس کا پیغام اگر عقل وخرِد کو جستجو بخشتا ہے۔ تو قلب وروح کو بھی شوقِ فراواں سے مالامال کرتا ہے۔ اس کی تعلیم نے انسان کو خودشناس بھی بنایا اور خُداشناس بھی۔

اور اس میں قطعاً مبالغہ نہیں کہ قرآن حکیم کے متعلق جتنا کچھ لکھا گیا ہے۔ اُتنا کسی کتاب یا کسی موضوع پر نہیں لکھا گیا۔ لکھنے والوں میں اپنے بھی تھے اور بیگانے بھی، محقق بھی تھے اور متعصّب بھی، ادیب بھی تھے اور فلسفی بھی، عربی بھی تھے اور عجمی بھی، شمع علم کے پروانے بھی تھے اور میخانہ عرفان کے متوالے بھی۔ اور غوّاصی کرنے والوں نے غوّاصی کا حق ادا کیا۔

خدا شاہد ہے کہ کبھی بُھولے سے بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ مجھے یہ کام کرنا ہے۔ یا میں یہ کام کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ یا اپنے فہم وادراک کے ناخن سے کسی پیچیدہ گرہ کو کھول سکتا ہوں۔ یا میرے قلم میں اتنا زور ہے کہ میری نگارشات قرآن فہمی کے راستہ سے ساری رُکاوٹیں دور کر سکتی ہیں۔ ان تمام کوتاہیوں کا پُورا احساس ہوتے ہوئے یہ کچھ ہو گیا۔ اس کی توجیہ میرے پاس اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ کہ میں یہ کہوں کہ اللہ رب العزت نے چاہا اور یہ ہو گیا۔ اسی مسبّب الاسباب نے اسباب فراہم کئے۔ اسی کی توفیق نے دستگیری فرمائی۔ اسی کی عنایاتِ پیہم کے سہارے قدم اٹھتے رہے۔ اسی کی تائید مسلسل سے میں یہاں تک پہنچا اور اسی کی بارگاہ بیکس پناہ میں دامنِ طلب پھیلائے۔ بصد عجز و نیاز فریاد کُناں ہوں۔ کہ اے ذروں کو رشک آفتاب بنانے والے، اے قطروں کو سمندروں کی وسعتیں بخشنے والے، اے گداؤں کو ہفت اقلیم کی سُلطانی کا تاج پہنانے والے، اے دلوں کے ظلمت کدوں میں اپنی معرفت کا چراغ روشن کرنے والے، اس ذرّہ ناچیز کو اس قطرہ حقیر کو، اس بے نوا فقیر کو، اس سیاہ رُو اور سیاہ دل کو اپنے محبوب مکرم رسول معظم ﷺ کے

طفیل اپنی عنایاتِ خسروانہ سے، اپنے الطافِ شہانہ سے، اپنی نوازشاتِ کریمانہ سے ہمیشہ ہمیشہ سرفراز فرمائے رکھنا۔

قرآن حکیم کا مقصدِ اوّلین انسان کی اصلاح ہے۔ ہوس کے غبار سے آئینہ دل کو صاف کر کے اُسے انوارِ ربّانی کی جلوہ گاہ بنانا ہے۔

ارشاد نبوی ﷺ کے مطابق کاتبانِ وحی اُسے ضبط تحریر میں لے آتے۔ حضورؐ ہر آیت کے متعلق یہ تصریح فرماتے کہ یہ آیت فلاں سُورۃ میں فلاں مقام پر لکھی جائے۔ اس طرح جُوں جُوں قرآن نازل ہوتا رہا۔ رُسول مکرّم کی نگرانی میں حضورؐ کی ہدایات کے مطابق تحریر کیا جاتا رہا۔ لیکن یہ تحریریں کتابی شکل میں مدون نہیں تھیں۔ بلکہ کاغذوں، ہڈی کے ٹکڑوں، کھجور کے چھلکوں، پتھر کی سِلوں وغیرہ اشیاء پر لکھی جاتی رہیں۔

رحمتِ عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ **اتلوا القرآن وابکوا فان لم تبکوا فتباکوا:** قرآن کریم پڑھو اور روؤ اور اگر رونا نہ آئے تو بہ تکلف رونے کی کوشش کرو۔ گریہ وزاری سے ہی رحمت الٰہی کو اپنی طرف متوجہ کیا جا سکتا ہے۔

اللہ کے کلام کا پڑھنا آسان، اُسے یاد کرنا آسان، اس سے نصیحت حاصل کرنا اور پھر اس پر عمل پیرا ہونا آسان، مگر اس کے معنی و مطالب کا محکم استیعاب اور اس کے جملہ پہلوؤں کا زبان و قلم سے احاطہ کر لینا اسی طرح ناممکن ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کی دیگر صفات کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔

لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًاۚ. (نساء:13)

”اے مسلمانو! (اظہارِ اسلام کے لئے) جو تم کو سلام کرے اس کو تم خواہ مخواہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں ہے“۔

''شرک'' تقدیر کا انکار اس امت کا پہلا شرک ہے۔ میں اس ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ ایسے لوگوں کی بری رائے یہیں تک نہ محدود رہے گی' بلکہ جس طرح انہوں نے خدا کو شر کی تقدیر سے معطل کر دیا ہے' اسی طرح اس کی خیر کی تقدیر سے منکر ہو جائیں گے۔(مسند احمد بن حنبل جلد اوّل صفحہ 330)

رسول ﷺ کی خدمت: ایک دن آنخضرت ﷺ حضرت میمونہؓ کے گھر میں تشریف فرما تھے۔ ابن عباسؓ نے آپ ﷺ کے لئے وضو کا پانی رکھا' حضرت میمونہؓ نے آنخضرت ﷺ سے کہا کہ ابن عباسؓ نے آپ کے لئے وضو کا پانی رکھا ہے۔ آپ ﷺ نے دعا دی۔ ''خدایا ان کو دین میں سمجھ اور قرآن کی تفسیر کا علم عطا فرما''۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آنخضرت ﷺ جائے ضرورت سے فارغ ہو کر تشریف لائے' تو ایک طشت میں پانی ڈھکا ہوا رکھا دیکھا۔ پوچھا کس نے رکھا ہے ابن عباسؓ نے عرض کی میں نے ۔فرمایا' خدایا! ان کو قرآن کی تفسیر کا علم عطا فرما''۔

(مستدرک حاکم جلد 3 ص 535,534 بشرط شیخین)

رسول اللہ ﷺ کا احترام: آنخضرت ﷺ نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو آنخضرت ﷺ نے ابن عباسؓ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر کر لیا۔ اس وقت تو یہ ساتھ کھڑے ہو گئے' مگر جیسے ہی آپ نے نماز شروع کی تو ابن عباسؓ ہٹ کر پیچھے کھڑے ہو گئے' نماز ختم کرنے کے بعد آپ ﷺ نے پوچھا کہ ''میں نے تم کو اپنے ساتھ کھڑا کیا تھا تم پیچھے کیوں ہٹ گئے' عرض کی ''کسی کی یہ مجال نہیں ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے شانہ بہ شانہ کھڑا ہو کر نماز پڑھے۔ آنخضرت ﷺ اس معقول عذر پر خوش ہوئے اور ان کے لئے فہم و فراست کی دعا فرمائی۔

(مستدرک حاکم جلد 3 ص 537,534 بشرط شیخین)

ان تفاسیر کے نام جن میں سے گلدستۂ تفاسیر کے لئے موتی چنے گئے۔

تفسیر ابنِ عباسؓ	حضرت عبداللہؓ ابن عباس
تفسیر ضیاء القرآن	پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ
تفسیرِ مظہری	حضرت علامہ قاری محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتیؒ
معالم العِرفان فی دروس القرآن	حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ
صِرَاطُ الجِنَان فی تَفسِیرِ القرآن	شیخ الحدیث ابو صالح مفتی محمد قاسم قادری عطاری
تفسیر مِنہاج القرآن سورۃ الفاتحہ (جز واوّل)	شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری
معارف آیت الکرسی	شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری
تفسیر انوار البیان	حضرت مولانا مفتی محمد عاشق الٰہی مہاجر مدنی
تفسیر بصائر الفرقان	میجر (ر) امیر افضل خان

تعوذ

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ ؕ

جب قرآنِ پاک پڑھیں تو پہلے اللہ کی ذات کے ساتھ شیطان مردود سے پناہ مانگیں۔تعوذ اللہ تعالی کے ذکر کی ایک قسم ہے۔تعوذ کا معنی پناہ طلب کرتا ہے۔قرآن پاک کی تلاوت سے پہلے تعوذ پڑھنا سنت ہے۔سب سے آسان ذکر لسانی (یعنی زبانی ذکر) ہے اس کی کل دس اقسام ہیں۔

ا۔تسبیح: یہ اللہ تعالی کا بلند ترین ذکر ہے۔کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ رب العزت کی تسبیح کرتا ہے ہر انسان کو چاہئے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر اس کی تسبیح کر کے کرے۔اپنی زبان سے **سُبحَانَ اللّٰہ** کہے یعنی اے پروردِگار تو ہر ساجھی،شریک،عیب،نقص،کمزوری اور ضعف سے پاک ہے۔(معالم العرفان صفحہ ۳۰)

۲۔تحمید: ذکر کی دوسری قسم تحمید ہے یعنی بندہ اپنے رب تعالی کی تعریف بیان کرے اور کہے **اَلحَمدُ للّٰہ** تمام تعریفوں کا مستحق صرف اللہ ہے۔تحمید نماز میں بھی کی جاتی ہے **اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِین** نماز میں تسبیح کے بعد تحمید انہی الفاظ سے کی جاتی ہے۔

۳۔تکبیر: تکبیر بھی ذکر ہے جس کے ذریعے اللہ کی بڑائی اور عظمت کا اظہار کیا جاتا ہے۔جب کوئی اہم کام انجام دیا جائے تو اپنے ضعف کے پیش نظر زبان سے کہتے ہیں **اَللّٰہُ اَکبَر** اللہ سب سے بڑا ہے۔اس کے سوا کسی کے لئے بڑائی نہیں ہے۔

۴۔تہلیل: **لآ اِلٰہ اِلا اللّٰہ** بھی ذکر ہے یعنی اللہ تعالی کے سوا کوئی معبود نہیں۔تہلیل کے ساتھ توحید کا کلمہ بھی آتا ہے **وَحدَہٗ لَاشَرِیکَ لَہٗ** وہ اکیلا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔

یہ بھی ذکر کی ایک قسم ہے۔

۵۔حوقلہ: حوقلہ یعنی **لَاحَولَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ** بھی ذکر کی ایک قسم ہے یہ تفویض اور توحید کا کلمہ ہے اور حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق عرش الٰہی کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔

۶۔حسبلہ: ذکر کی ایک قسم حسبلہ ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے مفرد کلمہ **حسبی اللہ** اور جمع کا کلمہ **حَسبُنَا اللہ** آتا ہے۔ ہر مشکل وقت میں اس کلمہ کا ورد خیر و برکت کا باعث ہوتا ہے۔

۷۔بسملہ: بسملہ بھی ذکر ہی کی ایک قسم ہے۔ہم ہر کار خیر کی ابتدا **بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم** سے کرتے ہیں۔

۸۔استعانت: استعانت یعنی اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا بھی ذکر میں شامل ہے۔**اِیَّاكَ نَعبُدُ وَاِیَّاكَ نَستَعِین** اے پروردگار ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد کے طالب ہیں۔

۹۔تبارک: اللہ کا ذکر لفظ تبارک کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے جیسے فرمایا **تَبٰرَكَ الَّذِی بِیَدِهِ المُلك** بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے۔ برکت کا معنی ایسی زیادتی ہے جس میں تقدس کا معنی پایا جائے۔ جب بھی کوئی اچھی چیز دیکھی جائے تو کہنا چاہئے **بَارَكَ اللہ** اللہ تعالیٰ برکت عطا کرے۔ یہ ذکر ہے،عرب اِسے محاورے کیطور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔

تعوذ: ذکر کی دسویں قسم تعوذ یعنی اعوذ باللہ کہنا ہے۔ جب قرآن پڑھو اللہ تعالیٰ کا ذکر اس طرح کرو **اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ** ۔(معالم العرفان صفحہ ۳۳)

علم اور عمل دو مفید ترین چیزیں ہیں اور ہر انسان ان دونوں چیزوں کا تاج ہے۔علم میں عقیدہ بھی شامل ہے اور ظاہر ہے کہ ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا عقیدہ اور فکر پاک ہو مگر تمام انسان اس میں کامیاب نہیں ہو پاتے کیونکہ ہر انسان اپنی قوت کے بھروسے پر یہ چیز حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک اللہ تعالی کی مدد اس کے شاملِ حال نہ ہو۔عمل کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔کوئی بھی اچھا عمل اللہ تعالی کی توفیق اور اس کی امانت ونصرت کے بغیر انجام نہیں دیا جا سکتا۔

حواسِ ظاہرہ و باطنہ اللہ تعالی نے انسان کے جسم میں بہت سے حواسِ ظاہرہ اور باطنہ ودیعت فرمائے ہیں۔حواسِ ظاہرہ میں قوتِ باصرہ) دیکھنے کی طاقت (،قوتِ سامعہ) سننے کی طاقت (،قوتِ ذائقہ) چکھنے کی طاقت (،قوتِ لامسہ) ٹٹولنے کی طاقت (اور قوتِ شامہ) سونگنے کی طاقت) شامل ہیں۔اسی طرح حواسِ باطنہ میں وہم، خیال، حسِ مشترک، قوتِ متکرطہ، ذہانت اور قوتِ عاقلہ ہیں جو اللہ تعالی نے انسان کے دماغ میں رکھی ہیں۔ان ظاہری اور باطنی حواس کے علاوہ انسان میں شہوت اور غضب کا مادہ بھی ہے۔قوتِ جاذبہ جس کے ذریعے انسانی جسم غذا کو جذب کرتا ہے۔قوتِ ہاضمہ ہے جس کے ذریعے کھائی جانے والی خوراک ہضم ہوتی ہے۔یہ عمل معدے، آنتوں اور جگر میں انجام پاتا ہے۔پھر قوتِ غاذیہ ہے جو غذا کو ٹھکانے پر پہنچاتی ہے۔ قوت دافعہ فضلات کو جسم سے باہر نکالتی ہے اگر یہ چیزیں اندر رک جائیں تو صحت بگڑ جائیگی۔ انسانی جسم میں قوتِ نامیہ بھی ہے جس کے ذریعے انسانی جسم کی ایک خاص حد تک نشو ونما ہوتی ہے۔ایک قوتِ ملدہ بھی ہے جو تولیدی مادہ کے ذریعے نسلِ انسانی کو آگے بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔(معالم العرفان صفحہ ۳۴)

پناہ طلبی

اندرونی اور بیرونی شرور سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان ہر کام شروع کرنے سے پہلے خدا تعالی کی پناہ میں چلا جائے اور یہ پناہ تعوذ کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔شیطان شطن کے مادے سے مشتق ہے اور اس کے دو معانی آتے ہیں۔اس کا ایک معنی دوری ہے، گویا شیطان

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہے اسی لیے اس کو رجیم یا مردود اور لعین بھی کہا جاتا ہے۔شطن کا دوسرا معنی ہلاکت ہے، اور یہ بھی شیطان پر صادق آتا ہے۔کیونکہ وہ اپنے غرور وتکبر کی وجہ سے بالآخر ہلاک ہونے والا ہے۔(صفحہ ۳۵)

تعوذ کی تعلیم

امام جعفر صادقؒ بیان کرتے ہیں کہ انسان کی زبان جھوٹ، غیبت اور غلط باتوں سے اکثر ناپاک رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاک کلام کی تلاوت سے قبل زبان کا پاک ہونا ضروری ہے، اس لیے تعوذ کی تعلیم دی گئی ہے۔(صفحہ ۳۶)

مسنونہ تعوذات

روایات میں تعوذ کے مختلف الفاظ آئے ہیں۔جیسے **اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ،اَعُوذَ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ العَلِيمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ** یا **مِنَ الشَّيْطٰنِ اللَّعِينِ الرَّجِيمِ** ۔اس کے علاوہ **اَستَعِيذُ بِاللّٰهِ** اور **نَستَعِيذُ بِاللّٰهِ** بھی آتا ہے۔

حضورﷺ جب حضرت حسنؓ اور حسینؓ کو دم کرتے تو یہ الفاظ ادا فرماتے **اُعِيذُكُمَا بِكَلِمٰتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِن كُلِّ شَيطٰنٍ وَهَآمَّةٍ وَمِن كُلِّ عَينٍ لَآمَّةٍ** میں تم دونوں کو اللہ تعالیٰ کے کلماتِ تامہ کی پناہ میں دیتا ہوں، ہر شیطان سے اور کیڑے سے اور ہر نظر بد لگانے والی آنکھ سے۔(معالم العرفان صفحہ ۳۷)

آپ ﷺ نیند سے بیدار ہونے پر یہ کلمات ادا فرماتے **اَعُوذُ بِكَلِمٰتِ اللّٰهِ التَّآمَّاتِ مِن غَضَبِه وَعِقَابِه وَمِن شَرِ عِبَادِه وَمِن هَمَزَاتِ الشَّيطِينِ** ۔ میں اللہ تعالیٰ کے کلماتِ تامہ کے ساتھ اس کے غضب سے، عتاب سے، اس کے بندوں کے شر سے اور شیاطین کی چھیڑ چھاڑ سے پناہ مانگتا ہوں۔

حضور ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اس طرح استعاذہ فرماتے **اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ مِن ھمزِہ وَنَفخِہ وَنفثِہ** میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں شیطان مردود کی چھیڑ چھاڑ سے اس کے تکبر سے اور اس کے سحر سے۔

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ بیت الخلا میں داخلیسے پہلے کہو **اَللّٰھُمَّ اِنِی اَعُوذُ بِكَ مِنَ الخُبُثِ وَالخَبآئِثِ**۔ اے اللہ میں نر اور مادہ شیاطین سے تیری ذات کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں۔اور بیت الخلا سے باہر آ کر کہو **غُفرٰنَكَ اَلحَمدُ لِلّٰہِ الَّذِی اَذھَبَ عَنِّی اَلاَ ذٰی وَعَافَانِی** اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے میرے جسم سے اذیت ناک چیز نکال دی اور مجھے عافیت عطا فرمائی۔

حضور ﷺ سے یہ دعائیں بھی ثابت ہیں **اَللّٰھُمَّ اِنِّیَ اَعُوذُ بِكَ مِن عَذَابِ جَھَنَّمَ** اے اللہ ! جہنم کے عذاب سے تیری ذات کے ساتھ پناہ پکڑتا ہوں۔ **اَعُوذُ بِكَ مِن فِتنتِ المَحیَا وَالمَمَاتِ وَمِنَ المَاثَمِ وَالمَغرَمِ** میں تیری پناہ چاہتا ہوں زندگی اور موت کے فتنے سے اور گناہ اور تاوان سے۔ **اَللّٰھُمَّ اِنِیٓ اَعُوذُبِكَ مِن شَرِّفِتنَتِ الغِنٰی وَمِن شَرِّفِتنَتِ الفَقرِ** اے اللہ ! میں تیری ذات کے ساتھ دولتمندی اور فقر کے فتنہ سے پناہ مانگتا ہوں۔

قرآنی تعوذات

قرآنِ پاک کے معاملے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض انبیاء کرامؑ نے بھی بعض مواقع پر تعوذ کیا۔سورۃ البقرہ میں موسیٰؑ کا واقعہ موجود ہے کہ جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے تو قوم نے کہا، کیا آپ ہمارے ساتھ مذاق کرتے ہیں؟اس کے جواب میں حضرت موسیٰ نے فرمایا: **اَعُوذُ بِاللّٰہِ اَنۡ اَکُونَ مِنَ الجٰھِلِینَ** اللہ کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاں۔فرمایا ٹھٹا

کرنا جاہلوں کا کام ہے میں تو تمہیں اللہ کا کلام سنا رہا ہوں۔

حضرت نوحؑ کے واقعہ میں آتا ہے کہ جب ان کی لغزش پر اللہ تعالی نے تنبیہ فرمائی تو کہنے لگے **اِنِی اَعُوذُ بِکَ اَن اَسئَلکَ مَا لَیسَ لِی بِہ عِلمٌ** (سورۃ ہود) اے اللہ! میں تیری ذات کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ تجھ سے کسی ایسی چیز کا سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں ہے۔ حضرت یوسفؑ کے واقعہ کا مطالعہ کیجئے۔ جب عزیز مصر کی بیوی نے آپ کو برائی کی ترغیب دی تو آپ نے فرمایا **مَعَاذَ اللّٰہِ اِنَّہ' رَبِیٓ اَحسَنَ مَثوَایَ** (سورۃ یوسف) پناہ بخدا، وہ تو میرا مربی ہے اس نے مجھے عزت دی ہے، میں اس کے ناموس میں کیسے خیانت کرسکتا ہوں۔

حضرت مریمؑ کے حجرہ میں تنہائی کے دوران ایک فرشتہ انسانی شکل میں پہنچ گیا آپ گھبرا گئیں اور کہنے لگیں **اَعُوذُ بالرَّحمٰنِ مِنکَ اِن کُنتَ تَقِیًّا** (سورۃ مریم) میں خدائے رحمان کی پناہ میں آتی ہوں تجھ سے اگر تو خدا سے ڈرنے والا ہے۔ جب مریم پیدا ہوئیں تو ان کی والدہ نے ان الفاظ کے ساتھ خدا تعالی سے استعاذہ کیا **اِنِیٓ اُعِیذُ ھا بِکَ وَذُرِ یَّتھَا مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ** (آل عمران) اے خدایا! میں اس بچی اور اس کی اولاد کو شیطان مردود کے شر سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔

جب فرعون اور اس کے ساتھیوں نے موسیٰؑ کو ہلاک کرنے کی دھمکی دی تو آپ نے کہا **وَاِنِی عُذتُ بِرَبِی وَربِکُم اَن تَرجُمُونِ** میں اپنے اور تمہارے رب سے اس بات کی پناہ پکڑتا ہوں کہ تم مجھے سنگسار کردو۔

سورۃ اعراف میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے **وَاِمَّا یَنزَ غَنَّاکَ مِنَ الشَّیطٰنِ نَزغٌ فَاستَعِذُ بِاللّٰہِ اِنَّہ' سَمِیعٌ عَلِیم** جب کبھی شیطان کی طرف سے چھیڑ چھاڑ ہوں تو اللہ کی پناطلب کرو، بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

قرآنِ پاک کی آخری دو سورتیں جن کا حال ہی میں درس ہوا ہے استعاذہ کے مضمون پر ہی ہیں۔

قُل اَعُوذُ بِرَبِّ الفَلَق کہو کہ میں صبح کے مالک کی پناہ مانگتا ہوں۔ **قُل اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ** کہو کہ میں لوگوں کے پرورِدگار کی پناہ مانگتا ہوں۔ غرضیکہ ان دو سورتوں میں مختلف قسم کی برائیوں سے پناہ پکڑنے کا طریقہ سکھلایا گیا ہے۔ (معالم العرفان صفحہ ۴۲)

بسم اللہ سے ابتدا

بسم اللہ میں دو چیزیں بطورِ خاص پائی جاتی ہیں، ایک اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان اور دوسرا اس پر توکل۔

قدیم زمانے میں مشرک لوگ کوئی کام شروع کرنے سے پہلے اپنے معبودانِ باطلہ کا نام لیتے ہیں۔ پرانے زمانے کے عرب کے مشرکین اپنے معبودانِ لات، منات اور عزیٰ وغیرہ کا نام لیتے تھے۔ حضرت نوح کے زمانے کے لوگ ود، سواع، نسر وغیرہ کا نام لے کر کام کی ابتدا کرتے تھے۔ عیسائی آج بھی باپ بیٹا اور روح القدوس کا نام لیتے ہیں۔ جب دنیا میں اسلام کا سورج طلوع ہوا تو اس کے ماننے والے اہلِ ایمان کو حکم دیا گیا کہ وہ ہر کام اللہ تعالیٰ کا نام لے کر شروع کیا کریں جو کہ معبود برحق اور واحدہ لاشریک ہے۔

امام ابوبکر جصاص اور دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ ہر اچھے کام کے شروع میں خواہ وہ کھانا پینا ہی ہو بسم اللہ پڑھنی چاہئے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: ہر اچھا، جائز اور شان والا کام اگر بسم اللہ سے شروع نہیں کیا جائیگا تو وہ کام دم کٹے جانور کی طرح ہوگا یعنی بے برکت ہوگا۔ (معالم العرفان صفحہ ۴۴)

نماز میں بسم اللہ

نماز میں سورۃ فاتحہ سے پہلے اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ پڑھنا ضروری ہے۔ اور اس کے ساتھ بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ پڑھنا سنت ہے۔

بسم اللہ بوقت ذبح

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے **فَاذْ کُرُوسمَ اللّٰہِ عَلَیھَا صَوَآفَّ** (الحج) اونٹوں کی قطاروں کو اللہ کا نام لے کر نحر کرو۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی موجود ہے **وَلَا تَاکُلُوامِمَّا لَم یُذ کَرِاسمُ اللّٰہِ عَلَیہِ** (الانعام) جس ذبیحہ پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اس کو مت کھا، وہ مردار کی مانند ہے۔ اگر کوئی شخص بوقت ذبح بسم اللہ اللہ اکبر کہنا بھول جائے تو اس کے لئے معافی ہے کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ کا نام ہر مومن کے دل میں ہوتا ہے۔ (صفحہ ۴۸)

ہر کام میں بسم اللہ

کوئی بھی کام ہو طہارت، کھانا پینا، لباس پہننا، چلنا، سونا، تمام کام اللہ تعالیٰ کے پاک نام سے شروع کرنے چاہئیں۔ بسم اللہ کہا جاتا ہے تو اس میں فعل محذوف ہوتا ہے۔ آدمی فعل کی مناسبت سے بسم اللہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی برکت سے میں کھاتا پیتا ہوں، پہنتا ہوں یا سواری پر بیٹھتا ہوں یا کوئی دیگر کام کرتا ہوں۔ عمر بن ابی سلمہؓ حضور کی پرورش میں تھے۔ ان کا شمار چھوٹے صحابیوں میں ہوتا ہے۔ کھانا تیار تھا بچے نے دور بیٹھے ہی کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اے بیٹے! قریب ہو کر بیٹھو، بسم اللہ پڑھو **کُل بِیَمِینِكَ** اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ **وَکُل مِمَّا یَلِیكَ** اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔ آپ نے کھانے کے متعلق چار چیزوں کی تعلیم دی جس میں بسم اللہ بھی شامل ہے۔ (معالم العرفان صفحہ ۴۸)

ب اور اسم

بسم اللہ میں اسم کے ساتھ جو ''ب'' لگی ہوئی ہے اس کے بہت سے معنی آتے ہیں۔ اس کا مشہور معنی تو مصاحبت یا رفاقت ہے مگر یہ استعانت کے لیے بھی آتی ہے۔ **بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ** میں لفظ اللہ اسم ہے، رحمان اور رحیم صفات ہیں۔ اسم 'اللہ' کی ذات کو

ظاہر کرتا ہے جب کہ اس کی ہر صفت اس کی کسی نہ کسی تجلی کو ظاہر کرتی ہے۔ اسم وہ شے ہے جو فہم میں معین ہو، خیال میں مصور ہو، وہم میں حاضر ہو فکر میں مرتب ہو، حافظہ میں محفوظ ہو، عقل میں موجود ہو۔ اسم بول کر ہی ذات کو سمجھا جا سکتا ہے اس کے بغیر ذات کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

اللہ، رحمان اور رحیم انسان کوئی بھی کام کرنا چاہے، اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۱) اسباب فراہم کرنا (۲) انتہاء تک پہنچانا (۳) ثمرات مرتب کرنا۔

جہاں تک اسباب فراہم کرنے کا تعلق ہے، اس پر اسم اللہ کا تصرف ہوتا ہے چونکہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ ہے لہذا اسی اسمِ پاک کے ذریعے سے کسی کام کے اسباب مہیا ہوتے ہیں۔ ان اسباب کو آخر تک قائم رکھنا بھی ضروری ہے ورنہ کام ادھورا رہ جائے گا چنانچہ ان اسباب کو انتہاء تک قائم رکھنے میں صفت رحمان کارفرما ہوتی ہے کہ وہ بڑا مہربان ہے۔ پھر جب کام مکمل ہو جاتا ہے تو اس کے ثمرات مرتب کرنے میں صفت رحیم اپنا تقاضا پورا کرتی ہے۔ صفت رحیم کا تعلق صرف آخرت سے ہے۔ بسم اللہ میں یہ تینوں صفات پائی جاتی ہیں۔ اللہ ذاتی نام ہے رحمان اور رحیم اس کی صفات ہیں۔ ہر کام کی تکمیل کے لیے ان تینوں اسمائے پاک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں تینوں نام آ گئے ہیں۔

جو نام اللہ تعالی کی طرف منسوب ہو، اس میں تخفیف کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ جیسے عبدالصمد کو صرف صمد کہنا یا عبدالرحمٰن کو رحمان اور عبدالمجید کو مجید صاحب کہنا غلط ہے۔ یہ اللہ تعالی کی صفات ہیں اور ان کا اطلاق کسی مخلوق پر کرنا جائز نہیں۔ اس لیے یہ نام مکمل عبدالرحمٰن یا عبدالمجید کہہ کر پکارنے چاہیئں جس سے انسان اپنے آپ کو اللہ تعالی کا عبد ظاہر کرے۔

ٹھوکر لگنے پر بسم اللہ

حضور ﷺ سواری پر سوار تھے۔ آپ کے پیچھے ایک دوسرے صحابی بھی بیٹھے تھے۔

اچانک سواری کو ٹھوکر لگی تو پیچھے بیٹھے صحابی نے عربی محاورے کے مطابق کہا **تَعِسَ الشَّیطٰنُ** یعنی شیطان تباہ ہو۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ایسا مت کہو، کیونکہ ایسا کہنے سے شیطان سمجھتا ہے کہ میری بھی کوئی حیثیت ہے جسکی وجہ سے مجھے برا بھلا کہا جا رہا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ایسے موقع پر بسم اللہ کہو۔

اول و آخر قرآن

قرآن پاک کی ابتدا **بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ** کی ''ب'' سے ہوتی ہے اور اس کی انتہاء ''وَالنّاسِ'' کی ''س'' پر ہوتی ہے۔ اس کے متعلق غزنی کے مشہور شاعر ثنائیؒ جو کہ اولیاء اللہ میں سے تھے، فرماتے ہیں:

اول و آخر قرآن ذیں چہ با و سین
یعنی اندر راہِ دیں رہبر تو قرآن بس

اسماءُ القرآن

قرآن پاک کے مختلف اسماء اور ان کی مختصر تشریح:

(1) قرآن

قرآن کا مادہ قرا ہے، جس کا معنی جمع کرنا ہے۔ قرآن سے مراد پڑھی جانے والی کتاب ہے۔

(2) فرقان

قرآن پاک کا ایک نام فرقان بھی ہے۔ فرقان کا معنی ہے فیصلہ کرنے والی کتاب۔ قرآن پاک حق و باطل، ایمان و کفر، صحیح اور غلط کے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔ (معالم العرفان صفحہ ۵۴)

(3) تذکرہ

تذکرہ کا معنی یاددہانی ہے۔ قرآن پاک تمام عہد و پیمان اور دیگر ضروری باتیں انسان کو یاد کرتا ہے،

اس لیے اللہ تعالی نے اسے تذکرہ کے نام سے پکارا ہے۔

(4) ہدایت

قرآن پاک ہدایت بھی ہے۔ ہدایت کا معنی راہنمائی ہے۔قرآن پاک ماہِ رمضان میں نازل کیا گیا جو کہ لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں۔

(5) نور

اللہ تعالی نے قرآن پاک کو نور بھی فرمایا۔نور کا لفظی معنی روشنی ہے اور یہ اللہ کی صفت بھی ہے۔

(6) بصائر

قرآن پاک کو بصائر سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ بصائر بصیرت کی جمع ہے جس سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جو دل میں روشنی پیدا کرتی ہے۔ بصارت آنکھ کی روشنی کو کہتے ہیں جبکہ بصیرت دل کی روشنی کو۔

(7) روح

قرآن پاک کا ایک نام روح بھی ہے۔ عام اصطلاح میں روح اس چیز کا نام ہے کہ جب کسی جاندار میں داخل ہوتی ہے تو اس کو زندگی نصیب ہوتی ہے۔اور جب روح الگ ہو جاتی ہے تو انسان یا کوئی بھی جاندار مردہ ہو جاتا ہے۔قرآن پاک اس لحاظ سے روح ہے کہ اس کے ذریعے سے انسانوں کو روحانی زندگی نصیب ہوتی ہے اور وہ گمراہی سے نکل کر روشنی میں آ جاتے ہیں۔

(8) رحمت

قرآن پاک رحمت بھی ہے۔رحمت کا معنی مہربانی ہوتا ہے۔ جو لوگ قرآن پاک کو اختیار کرتے ہیں اللہ تعالی کی رحمت ان کے شامل حال ہوتی ہے۔

(9) شفاء

جس طرح مادی دوائیں جسمانی بیماریوں کے لیے شفاء کا باعث ہوتی ہیں اسی طرح قرآن پاک

روحانی بیماریوں کے لیے شفا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: جسمانی بیماریوں کے لیے شہد کو لازم پکڑو اور روحانی بیماریوں کے لیے قرآن کریم کو لازم پکڑو، یہ دونوں چیزیں باعثِ شفاء ہیں۔

(10) موعظت

اللہ تعالی نے قرآن کو موعظت بھی فرمایا ہے جس کا معنی وعظ و نصیحت والی باتیں ہیں۔ اس کے ذریعے انسانوں کی جہالت دور ہو کر ان میں اچھی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔

(11) تبیان

تبیان کا معنی بہت زیادہ وضاحت ہے۔ وہ تمام باتیں جن کا تعلق عقیدے سے ہے یا عمل سے، اخلاق سے ہے یا ذہنی بالیدگی سے فکر کی بلندی سے ہے یا اللہ کی معرفت سے، عالم بالا سے ہے یا برزخ اور حشر سے، ان تمام کی وضاحت قرآن پاک میں موجود ہے، اس لیے اس کا نام بتیان رکھا گیا ہے۔

(12) قیم

قرآن پاک کا ایک نام قیم بھی ہے۔ قیم کا معنی نگرانی اور حفاظت کرنے والی کتاب۔ عربی زبان میں قیم جماعت سیکرٹری کو کہتے ہیں۔

(13) احسن الحدیث

اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحسَنَ الحَدِیثِ اللہ تعالی نے سب سے اچھی بات نازل فرمائی۔ وہ شہنشاہِ مطلق اور ملک الملوک ہے، اس کا کلام بھی بے مثل اور بے مثال ہے، اس لیے قرآن کو حسن الحدیث فرمایا گیا ہے۔

(14) مثانی

مثانی کا معنی دہرائی جانے والی کتاب جس کا بکثرت تکرار ہوتا ہے۔ قرآن پاک کا یہ نام خود قرآن

پاک میں بھی آیا ہے۔

(15) برہان

قرآن پاک کا ایک نام برہان بھی ہے۔ برہان دلیل کو کہتے ہیں۔ ہر دعوی کی کوئی نہ کوئی دلیل ہوتی ہے، اسی طرح قرآن حکیم بھی بیشمار دلائل پر مشتمل ہے۔

(16) الکتاب

قرآن پاک کو الکتاب کا خطاب بھی دیا گیا ہے۔ ہر کتاب میں علمی دلائل کی کوئی نہ کوئی کمی ضرور ہوگی۔ یہ شرف صرف قرآن پاک کو ہی حاصل ہے کہ اس میں کوئی کمی نہیں ہے یہی الکتاب ہے۔

(17) ذکر

قرآن پاک کا ایک نام ذکر بھی ہے۔ ذکر دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ذکر کا ایک معنی وہ علم ہے جس کے ذکر سے انسان میں یادداشت پیدا ہوتی ہے اور دوسرا اذکروہ ہے جس کے ذریعے اللہ تعالی کا تقرب حاصل ہوتا ہے۔ (معالم العرفان صفحہ ۶۰)

مسائلِ تلاوت

تلاوت قرآن کا اجر

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ ذرائع علم میں سے اہم ترین ذریعہ وحی الٰہی ہے۔ اللہ تعالی نے اسی ذریعہ سے مکمل علم قرآن پاک کی صورت میں نازل فرمایا ہے جو کہ پوری انسانیت بلکہ پوری کائنات کے لیے ہدایت اور راہنمائی کا ذریعہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں آتا ہے کہ جو شخص قرآن پاک کی ایمان اور سچائی کے ساتھ تلاوت کریگا اسے قرآن کریم کے ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں ملیں گی۔ خواہ ان کا مطلب بھی نہ سمجھتا ہو۔

(معالم العرفان صفحہ ۶۱)

ایصالِ ثواب

جس طرح صدقہ اور خیرات دوسروں کے ساتھ احسان ہے، اسی طرح تلاوت بھی احسان ہے۔ تلاوت کے بعد تلاوت کرنے والا اس طرح دعا کرے کہ جو کچھ میں نے تلاوت کیا ہے اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور اس کا اجر اپنے والدین، اساتذہ، کسی بزرگ، عزیز رشتہ دار، دوست یا پیغمبر کی ذاتِ مبارکہ جس کو بھی چاہے ہبہ کر سکتا ہے۔

نفلی عبادت کا ثواب

ہر ایمان دار شخص اپنے نفلی عمل میں سے جتنا چاہے دوسرے کو ہبہ کر سکتا ہے۔ جہاں تک فرائض، واجبات اور سنن کا تعلق ہے ان عبادات کی ضرورت تو خود انجام دہندہ کو ہوتی ہے۔ ان کو تو ہبہ نہیں کیا جا سکتا، البتہ نفلی عبادات میں دوسروں کو ہبہ کرنے کی اجازت ہے۔ اسی طرح روزہ کا مسئلہ بھی ہے، فرض روزہ تو انسان خود اپنے لیے رکھے گا اس کا ثواب دوسروں کو نہیں پہنچا سکتا۔ البتہ نفلی روزے کا ثواب ایصال کیا جا سکتا ہے۔ ہر روزے کا فدیہ صدقہ فطر کے مطابق دو سیر گندم یا اس کی قیمت کے برابر ہے۔ ہر نماز کا بھی یہی فدیہ ہے۔ اگر کسی مرنے والے کی نماز ضائع ہو جائے تو اس کے وارثان ہر نماز کے بدلے صدقہ فطر کے برابر فدیہ ادا کریں۔

قرآن پاک کا بھول جانا

بعض لوگ قرآن پاک پڑھنے کے بعد بھول جاتے ہیں، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس شخص کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آئے وہ یہ نہ کہے کہ میں نے قرآن پاک بھلا دیا ہے اس میں زیادتی پائی جاتی ہے اور ایسا کہنا ناپسندیدہ ہے ایسے شخص کو نہایت عاجزی کے ساتھ کہنا چاہئے کہ مجھ سے قرآن پاک بھلا دیا گیا ہے۔ اس میں عاجزی پائی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہی پسند ہے۔

تلاوت بطورِ پیشہ

قرآن پاک کو اپنی کمائی کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے کہ یہ مکروہ تحریمی ہے۔ اگر کوئی شخص

کسی ظالم آدمی کے ہاں اس نیت سے قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے کہ اس کے پاس میری وقعت ہو جائے یا یہ مجھے اچھا سمجھنے لگے تو ایسے شخص کو ہر ہر حرف کے بدلے دس دس نیکیوں کی بجائے دس دس لعنتیں پڑتی ہیں۔اس نے اللہ کی کتاب کی اس قدر ناقدری کی کہ ایک ظالم آدمی کی خوشنودی کے لیے قرآن پاک کی تلاوت کی ہے۔یہ قرآن پاک کو پیشہ بنانے کے مترادف ہے۔

ختمِ قرآن پر دعا

قرآن پاک کی تلاوت کے بعد دعا کرنا مستحب ہے۔حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب آپ قرآن پاک اول تا آخر ختم کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے دعا مانگتے تھے۔یہ دعا کی قبولیت کا موقع ہوتا ہے۔تراویح میں ختمِ قرآن پر بھی دعا کا اہتمام کرنا چاہئے کہ یہ بھی مستحب ہے،قرآن پر ایمان لانا،اس کے مطابق عقیدہ رکھنا اور اس کے اوامر ونواہی پر عمل کرنا تو بہر حال ضروری ہے مگر اس کی خالی تلاوت بھی بڑے اجر وثواب کا باعث ہے۔

قرآن پاک کا سننا

جس طرح قرآن پاک کا پڑھنا مسنون ہے اسی طرح اس کا سننا بھی مستحب ہے۔جو شخص خود نہیں پڑھ سکتا، وہ دوسروے سے سنے۔ایک موقع پر حضورﷺ منبر پر تشریف فرما تھے۔ آپﷺ نے عبداللہ بن مسعود سے فرمایا،قرآن پڑھو۔انہوں نے عرض کیا،حضور ! قرآن پاک آپ پر نازل ہوا ہے،آپ پڑھتے ہیں اور ہم لوگ سنتے ہیں مگر اب آپ ہمیں پڑھنے کے لیے فرما رہے ہیں۔تو آپﷺ نے فرمایا: میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ دوسرے کی زبان سے قرآن کریم سنوں۔گویا جس طرح خود پڑھنا اعلیٰ درجے کی نیکی ہے،اسی طرح سننا بھی پسندیدہ ہے۔جب کوئی دوسرا شخص پڑھ رہا ہو تو قرآنِ کریم کو سننا چاہئے کہ یہ بھی ایک بہتر بات ہے۔

تلاوت میں خوش الحانی

قرآن پاک کو اچھے لہجے اور خوش الحانی سے پڑھنا بھی مستحب ہے۔قرآن پاک کی افضل ترین تلاوت وہ ہے جو نماز کے دوران کی جائے ایسی تلاوت کا ثواب سب سے زیادہ ہوتا ہے۔(معالم العرفان صفحہ ٦٧)

فضائلِ قرآن اور اصولِ تفسیر

اشرف کتاب

اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کریم میں فرمایا ہے **اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحسَنَ الحَدِیثِ** (الزمر) اللہ نے سب سے بہتر بات نازل فرمائی ہے، حدیث کا لغوی معنی بات ہے۔ سورۃ مرسلات میں ہے **فَبِاَیِّ حَدِیثٍ بَعدَہ' یُوءمِنُونَ** اگر خدا تعالیٰ کے قرآن میں نازل کردہ بات پر ایمان نہیں لاگے تو پھر اس کے بعد کون سی بات اور کون سی کتاب نازل ہونے والی ہے جس پر تم ایمان لاگے۔ قرآنِ کریم ہی تمام کتابوں سے اشرف کتاب ہے۔ (معالم العرفان صفحہ ٦٨)

اشرف رسول

اللہ تعالیٰ نے یہ اشرف کتاب اپنے اشرف رسول حضرت محمد ﷺ پر نازل فرمائی۔

اشرف فرشتہ

جس فرشتے کے ذریعے قرآن پاک کا نزول ہوا یعنی جبرائیلؑ وہ فرشتہ بھی سب فرشتوں سے افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن پاک میں فرمایا ہے **نَزَّلَ بِہِ الرُّوحُ الاَ مِین** (الشعراء) یہ عظیم کتاب ہم نے جبرائیل امینؑ کے واسطہ سے نازل فرمائی۔

اشرف زمین

قرآنِ حکیم جس خطہ زمین پر نازل ہوا، وہ خطہ تمام خطوں سے زیادہ فضیلت والا ہے۔ اللہ کا پہلا گھر جس خطہ میں بنایا گیا وہ مکہ مکرمہ میں ہے، یہ بڑا ہی بابرکت اور جہان بھر کے لیے مرکزِ ہدایت ہے۔ یہ حرم پاک ہے جہاں اللہ کا گھر بیت اللہ شریف ہے۔ اسی سرزمین میں اللہ نے قرآنِ پاک کو نازل فرمایا۔

اشرف مہینہ

جس ماہِ مبارک میں یہ قرآن نازل ہوا، وہ مہینہ بھی سب مہینوں سے افضل

ہے۔

شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ (البقرہ)

یہ ماہِ رمضان ہے جس میں قرآن پاک کا نزول ہوا اور یہ افضل ترین مہینہ ہے۔

اشرف رات

قرآن پاک **لیلة القدر** میں نازل ہوا۔ **اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ** ۔(القدر)
امام ابنِ کثیرؒ فرماتے ہیں کہ **فَکَمُلَ مِن کُلِّ الوُجُوهِ** پس قرآن پاک کی فضیات تمام وجوہ سے مکمل ہے۔ جس اعتبار سے بھی دیکھا جائے قرآن پاک شرف اور فضیلت رکھنے والی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام اشراف وفضائل کو قرآن پاک پر ختم کردیا ہے۔

تفسیر القرآن بالقرآن

قرآن پاک کی تفسیر کا پہلا اصول یہ ہے کہ اسے خود قرآن میں تلاش کرو، اگر ایک جگہ اجمال ہے تو دوسری جگہ تفصیل سے مل جائے گا یا اگر ایک مقام پر اصول بیان ہوا ہے تو دوسری جگہ کچھ وضاحت بھی موجود ہوگی۔

تفسیر بالفتہ

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس بات کا پابند کیا ہے **لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡهِمۡ** (النحل) کہ جو چیز اتاری گئی ہے آپ اس کی وضاحت کردیں۔ قرآن پاک کے الفاظ وحی جلی ہیں لیکن جو باتیں حضور ﷺ کی زبان مبارک سے بیان ہوئی ہیں، وہ وحی خفی ہیں۔ قرآن پاک کے بعد تفسیر کا دوسرا ذریعہ حدیث ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کا طریقہ تفسیر

امام ابوحنیفہؒ کا طریقہ تفسیر یہی ہے کہ وہ ہر مسئلے میں سب سے پہلے کتاب اللہ کو دیکھتے ہیں۔ اگر وہاں صراحت نہیں ملتی تو پھر حدیثِ رسولؐ میں تلاش کرتے ہیں۔ اگر حدیث میں بھی کوئی چیز نہ

ملے تو پھر اقوالِ صحابہؓ کو دیکھتے ہیں۔

اصولِ فقہ والوں نے شریعت کے چار ہی دلائل بیان کیے ہیں

(1) اللہ کی کتاب (۲) نبی کی سنت (۳) صحابہ کا اتفاق (۴) اجتہاد۔

امام صاحب اور آپ کے شاگردان نے جو مسائل اجتہاد کے ذریعے حل کیے ہیں ان کی تعداد بارہ لاکھ سے کم نہیں۔

عبداللہ بن مسعودؓ

جہاں کہیں خلفائے راشدین میں سے کسی کا قول آجائے گا وہ قابل ترجیح ہوگا۔ کیونکہ ان کے بارے میں خود حضورﷺ کا فرمان ہے کہ ان کی سنت کو مضبوطی سے پکڑو کیونکہ یہ ہدایت اور استقامت پر ہیں۔ چاروں خلفائے راشدین کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بات قابلِ تسلیم ہوگی کیونکہ انہوں نے قرآن پاک کا اکثر حصہ خود حضورﷺ سے براہِ راست سیکھا تھا۔

عبداللہ بن عباسؓ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی شخصیت بھی بہت مشہور ہے خود حضورﷺ نے آپ کے متعلق دعا کی تھی **اَللّٰھُمَّ عَلِمَهُ الكِتَابَ اَللّٰھُمَّ فَقِهْهُ فِي الدِّيْنِ** اے اللہ اس بچے کو کتاب کا علم سکھا اور اسے دین میں سمجھ عطا کر۔ حضورﷺ کے وصال کے وقت حضرت ابنِ عباس کی عمر صرف گیارہ یا بارہ برس تھی۔ حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ ساری عمر قرآن وحدیث کی تعلیم دیتے رہے حضرت مجاہدؒ جیسے آپ کے بعض شاگرد ایسے بھی ہیں جنہوں نے آپ سے قرآن پاک اول تا آخر سیکھا اور پوری تفسیر وتشریح سے مستفید ہوئے۔

تفسیر بالرائے

حضورﷺ اور تمام سلف صالحین اللہ تعالیٰ کی منشاء معلوم کر کے اس کے مطابق قرآن پاک کی تفسیر کرتے رہیں ہیں اور کسی نے اللہ کی منشا کے خلاف اپنی رائے کو داخل نہیں ہونے دیا۔ تفسیر

بالرائے ڈاکہ، چوری اور زنا سے بھی بڑا جرم ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے قرآن پاک کی تفسیر اپنی رائے سے کی یا ایسی بات کی جس کو وہ نہیں جانتا تو ایسا شخص اپنا ٹھکانا دوزخ میں تلاش کرے۔ حضور پاک ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جس نے اپنی رائے سے قرآن پاک کی تفسیر کی اس نے غلطی کی۔ اگر چہ اس نے ٹھیک بات کی ہو مگر پھر بھی اس نے اپنی ذاتی رائے شامل کر کے غلطی کا ارتکاب کیا۔

حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ جو کچھ جانتے ہو وہ بتاؤ اور جو نہیں جانتے انہیں اہلِ علم کی طرف سونپ دو۔ بلا علم اپنی رائے کو داخل نہ کرو، یہ گمراہی ہے۔

تباہی کے اسباب

اللہ تعالی نے مسلمانوں کو اتنی عظیم کتاب عطا فرمائی ہے مگر یہ اس سے اغماض برت کر تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کی تباہی کی دوسری وجہ غلط تفسیر بھی عام ہے۔ مسلمانوں میں سے کتنے نام نہاد مفسرین ہیں جنہوں نے قرآن پاک کی تفسیر غلط کی ہے۔ عبداللہ چکڑالوی کا دماغ خراب ہوا اور اس نے غلط تفسیر کر کے لوگوں کو گمراہ کیا کبھی نمازوں کی تعداد دو بتائی اور کبھی تین بتائی۔ اس طرح سرسید کا دماغ بھی خراب ہو گیا اس نے بڑے اچھے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی تھی مگر معجزات کا انکار کیا اور من مانی تفسیر کی۔ غلام احمد پرویز نے بھی قرآن کے نام پر دنیا میں کفر پھیلایا۔

قرآن کریم کا موضوع اور سورۃ فاتحہ

قرآن کا موضوع

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قرآن کا موضوع ہے انسانِ مکلّف یعنی وہ بالغ انسان جس کو اللہ تعالی نے عقل وشعور عطا کیا ہے اور وہ قانون کا پابند ہے۔ قانون کی پابندی اس لیے ضروری ہے کہ کوئی انسان اس کے بغیر ترقی کی منازل طے نہیں کرسکتا۔ قانون کی پابندی سے ہی انسان ذہنی، عقلی اور اخلاقی طور پر ترقی کر کے بالآخر جنت میں پہنچ جائے گا۔ انسان کی ترقی دنیا میں تو جاری رہتی ہے بلکہ حضور ﷺ کی تعلیم کے مطابق ایمان والے کی ترقی برزخ میں بھی جاری رہتی ہے اور پھر وہ حشر کی منزل کو طے کر کے اصل منزل تک پہنچے گا۔ تو بہر حال قرآن کا موضوع انسانِ مکلّف ہے۔ (معالم العرفان صفحہ ۷۹)

اسلام کی عالمی حیثیت

بہر حال قرآن کا موضوع انسان مکلّف ہے کیونکہ تکمیلِ انسانیت ہی اس کا مقصد ہے۔ دین اسلام بھی کسی خاص قوم اور خاص وطن کے لیے نہیں آیا بلکہ اقوامِ عالم کے لیے آیا ہے۔ یہ ایک خاص قوم اور خاص زبان میں نازل ہوا ہے مگر اس کی حیثیت عالمی ہے اور اس کی دعوت پوری بنی نوع انسان کے لیے ہے۔

اصلاح علم وعمل

نزولِ قرآن پاک کا ایک مقصد یہ ہے کہ یہ علم اور عمل دونوں چیزوں کی اصلاح کرتا ہے۔ علم ایک عام چیز ہے اور اس میں بڑی خرابیاں پائی جاتی ہیں لوگوں کے عقیدے خراب ہوتے اور فکر میں بگاڑ پیدا ہوتا۔ باطل مذہب والے لوگ بھی علم رکھتے ہیں، وہ کوئی جاہل مطلق نہیں ہیں۔

اور عمل بگاڑ تو عام ہے دنیا کی کوئی قوم ملی بگاڑ سے خالی نہیں۔امام رازی اور بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ نزولِ قرآن کا مطلب حصول سعادت الدارین یعنی دونوں جہاں کی سعادت مندی حاصل کرنا ہے۔ جولوگ انبیا کی تعلیم و تربیت سے مستفید نہیں ہوتے وہ دنیا و آخرت ہر دو مقامات پر بدبختی کا شکار رہتے ہیں۔

اہلِ تشیع کی کذب بیانی

کتب حدیث میں جس طرح اہلِ سنت کے ہاں صحاح ستہ اور پھر ان میں صحیح بخاری کو شرف حاصل ہے۔اسی طرح اہلِ تشیع کی چار معتبر کتابوں (اصول اربعہ) میں سے اصول کافی سب سے معتبر کتاب ہے۔اس کا جامع تیسری اور چوتھی صدی کا یعقوب کلینی ہے۔اصول کافی میں لکھاہے جس قرآن پاک کو جبرائیلؑ حضرت محمد ﷺ پر لائے تھے اس کی ستر ہزار آیتیں تھیں۔

مضامین سورۃ

قرآن پاک کے دیگر مضامین میں محبت، صبر، عزم اور تقوی جیسے اہم اصول ہیں۔امام شاہ ولی اللہ محدثِ دہلوی کی حکمت کے مطابق چار اہم بنیادی اخلاق طہارت، اخبات، سماعت اور عدالت کا تذکرہ بھی قرآن پاک میں موجود ہے۔ یہ سب قرآن کریم کے اہم مقاصد ہیں اور سور فاتحہ ان تمام مقاصد پر مشتمل ہے۔(معالم العرفان صفحہ ۸۵)

سورۃ الفاتحہ__________دیباچہ قرآن

قرآن پاک کا دیباچہ سورۃ الفاتحہ ہے، کیونکہ یہ سورۃ قرآن پاک کے تمام معانی کی جامع ہے۔ یہ مختصر سورۃ قرآنِ کریم کے تمام بڑے بڑے مضامین کی جھلک دکھاتی ہے۔

نفس شیطانی، بہیمی اور ملکی

امام رازی فرماتے ہیں کہ جوہر ملکی کا اطمینان اسم اللہ کی تجلی سے ہوتا ہے۔جب انسان پر اسم ذات کی تجلی پڑتی ہے تو انسان میں موجود ملکی جوہر کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔اور جب

اسم رب کی تجلی پڑتی ہے تو انسان کا نفسِ شیطانی زیر ہوتا ہے۔اسی طرح جب اسم رحمان کی تجلی وارد ہوتی ہے تو انسان کا نفسِ سبعی مغلوب ہوتا ہے اور اس کی اصلاح ہوتی ہے۔ پھر جب اسمِ 'رحیم' کی تجلی انسان پر پڑتی ہے، تو اس کے نفسِ بہیمی کی اصلاح ہوتی ہے۔ گویا ہر اسمِ پاک کی الگ الگ تجلی اور الگ الگ خواص ہیں۔

ملکیت اور بہیمیت کی کش مکش

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حکمت کے مطابق انسان میں ملکیت اور بہیمیت کی کشمکش جاری ہے اور ابدالآباد تک جاری رہے گی۔

خلاصہ کتب آسمانی

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ہم عمر شیخ عبدالکریم جیلیؒ مفسرِ قرآن نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر میں **اَلْکَھفُ وَالرَّقِیمُ فِی تَفسِیرِ بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ** کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس میں بسم اللہ کی تفسیر شرح وبسط کے ساتھ لکھی ہے۔اسی طرح صاحبِ تفسیر کبیر امام رازی نے بھی بسم اللہ کی تفسیر میں فل سکیپ کے ستر (۷۰) صفحات لکھے ہیں۔آپ فرماتے ہیں کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے تمام مضامین حرف ''ب'' میں آگئے ہیں بلکہ 'ب' کے نقطہ میں ہیں، اور علمِ ریاضی میں نقطہ ایک ایسی چیز ہے جسکی تعریف نہیں کی جاسکتی، اس کو فرض کیا جاتا ہے۔لیکن اعداد کی تمام عمارت اسی نقطہ پر قائم ہے۔اگرچہ نقطہ خود نظر نہیں آتا، اسی طرح ذات خداوندی خود تو نظر نہیں آتی مگر تمام کائنات کی بنیاد اس سے قائم ہے۔''ب'' کا مطلب استعانت بھی ہوتا ہے اور استعانت کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز اللہ تعالی کی مدد سے ہی ہونی چاہیئے اور ہر کام کے لیے اسی سے مدد طلب کرنی چاہیئے قرآن وسنت میں **اِستَعِینُو بِاللّٰہ** کا حکم موجود ہے کہ تمام مشکلات اور حوائج میں اللہ ہی سے مدد طلب کرو۔

(معالم العرفان صفحہ ۹۰)

اسمائے سورۃ الفاتحہ

فاتح الکتاب

اس سورۃ مبارکہ کا پہلا نام **فَاتِحَۃُ الْکِتٰبِ**۔فاتحہ کے معنی کھولنے والی ہے۔اس کا معنی ابتدا کرنے والی سورۃ بھی ہے۔(معالم العرفان صفحہ ۹۲)

سورۃ الحمد

اس سورۃ مبارکہ کا دوسرا نام **سُوْرَۃُ الحمد** ہے۔حمد تعریف کو کہتے ہیں۔ایسی سورۃ جس میں اللہ تعالی کی حمد وثنا بیان کی جاتی ہے۔

ام القرآن

اس سورۃ کا تیسرا نام ام القرآن ہے۔ام اصل کو کہتے ہیں۔گویا قرآن پاک کی اصل یہی سورۃ ہے۔

سبع مثانی

اس کا چوتھا نام **سَبعَ مَثَانِی** یعنی سات دہرائی ہوئی آئتیں ہیں۔قرآن پاک میں اس کو قرآنِ عظیم بھی کہا گیا ہے۔

وافیہ

اس سورۃ کا پانچواں نام **اَلوَافِیَۃُ** یعنی پورا کرنے والی ہے۔چونکہ یہ سورۃ ہر مقصد کو پورا کرتی ہے،لہذا اسے وافیہ کہا گیا ہے۔مقصودِ اصلاح عقائد ہو یا عمل یا اخلاق یہ سورۃ سب کو پورا کرتی ہے اس لیے اس کا نامہ وافیہ ہے۔

کافیہ

اس سورۃ مبارکہ کا چھٹا نام **سُورَۃ اَلکَافِیَۃ** ہے۔کافیہ کا معنی کفایت کرنے والی ہے۔

اساس

اس کا ساتواں نام **سُورۃ الاَسَاسِ** ہے۔اساس کا معنی بنیاد ہوتا ہے۔ ہر چیز کی بنیاد یہی سورۃ ہے۔

شفاء

اس سورۃ کا آٹھواں نام **شفاء** ہے۔اللہ تعالی نے باطنی شفا تو پورے قرآن پاک میں رکھی ہے۔ تاہم سورۃ فاتحہ میں بالخصوص باطنی بیماریوں کے علاوہ بعض ظاہری بیماریوں کیلیے بھی شفا ہے۔

تعلیم المسئلہ

سورۃ فاتحہ کا نواں نام تعلیم المسئلہ ہے۔اس میں سوال کرنے کا طریقہ سکھلایا گیا ہے۔یعنی جب اللہ تعالی سے کوئی حاجت طلب کرنا ہو تو پہلے اس کی حمد وثنا بیان کرو اور اس کے بعد اپنا سوال پیش کرو۔

شکر

اس سورۃ کا دسواں نام شکر ہے۔جب کوئی شخص کہتا ہے **اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِین** تو وہ گویا اللہ تعالی کے انعامات کا شکر ادا کرتا ہے۔

دعا

اس سورۃ کا گیارہواں نام سورۃ دعا بھی ہے۔اللہ تعالی کی حمد وثنا بیان کرنے اور عبودیت اور استعانت کا اقرار کرنے کے بعد اپنی حاجت کا سوال بھی کیا جاتا ہے۔

رقیہ

اس سورۃ کا بارھواں نام سورۃ رقیہ یعنی جھاڑ پھونک والی سورۃ ہے اس کو پڑھ کر مریض پر دم کیا جاتا

ہے تو اللہ تعالی شفا بخشتا ہے۔

واقیہ

اس سورۃ کا تیرہواں نام واقیہ یعنی بچانے والی سورۃ ہے۔ جو شخص اس پر ایمان لائے گا اور اس کی تلاوت کریگا وہ دنیا اور آخرت کے شرور وفتن سے بچ جائے گا۔

کنز

اس سورۃ کا چودھواں نام الکنز ہے۔ کنز کا معنی خزانہ ہوتا ہے حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے **أُعطِيتُ مِن خزَآئِنِ العَرش** مجھے عرش کے خزانوں میں سے خزانہ عطا کیا گیا ہے۔ اس خزانہ میں سورۃ فاتحہ اور آیت الکرسی ہے۔ اس کے علاوہ **لَا حَولَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ** کے متعلق بھی آتا ہے کہ یہ عرش کے خزانوں میں سے خزانہ ہے۔ اس کی بھی تعلیم دی گئی ہے کہ بکثرت پڑھا جائے۔

سورۃ الصلوٰۃ

اس سورۃ کا پندرہواں نام سورۃ الصلوۃ ہے۔ چونکہ یہ سورۃ نماز کے لیے مخصوص ہے اور ہر نماز خواہ فرض ہو یا نفل، اس میں سورۃ فاتحہ پڑھنا پڑتی ہے، لہذا اس کو سورۃ الصلوۃ بھی کہا جاتا ہے۔

(معالم العرفان صفحہ ۹۷)

سورۃ الفاتحہ

اَلحَمدُ لِلّٰهِ رَبِّ العٰلَمِين سب تعریفیں اللہ تعالی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے۔

یہاں پر لفظ **اَلحمد** کا معنی تعریف ہے یعنی ازل سے لے کر ابد تک تمام تعریفیں اللہ تعالی ہی کے لیے ہیں۔ امام ابن جریرؒ اسے شکر پر بھی محمول کرتے ہیں گویا حمد شکر کا معنی بھی دیتا ہے۔ جب کوئی

شخص پورے اعتقاد کے ساتھ **اَلحمدُ لِلّٰہ** کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اس شخص کے لیے جنت میں بیت الحمد تعمیر کر دو۔ 'رب' کا لفظی معنی تربیت کرنے والا ہے اور مراد ہر چیز کو آہستہ آہستہ بتدریج حدِ کمال تک پہنچانا ہے۔ یہاں پر لفظ عالمین ذکر کیا گیا ہے جو کہ عالم کی جمع ہے۔ امام ابنِ جریرؒ، امام ابنِ کثیرؒ، امام رازیؒ اور بعض دوسرے مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ عالموں کی کل تعداد اٹھارہ ہزار ہے۔ ہم انسانوں کے جہان میں رہتے ہیں۔ اسکے علاوہ ملائکہ کا جہان، جنات کا جہان برزخ، حشر اور آخرت کے جہان ہیں اس کے علاوہ درندوں، پرندوں، چرندوں، کیڑوں مکوڑوں کے الگ الگ جہان ہیں۔ قرآن کریم کا موضوع عالم انسانیت کی تکمیل ہی ہے۔ اس سے بات بالکل واضح ہے کہ تمام کے تمام جہانوں کی پرورش کرنے والا وہی خدا تعالیٰ ہے۔

اَلرَّحمٰنِ الرَّحِیم یہاں پر رحمان اور رحیم دو صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ لفظ رحمان میں عمومیت پائی جاتی ہے۔ امام بیضاویؒ اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ رحمان کو رحمان الدنیا کہا جاتا ہے کیونکہ اس جہان میں اللہ تعالیٰ کی عمومی رحمت ہر کس و ناکس کے لیے ہے اور اس میں مومن اور کافر کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں بلا تخصیص ہر ایک کو میسر ہیں، یہ اس کی صفت رحمانیت کا ظہور ہے۔ جہاں تک صفت رحیمیت کا تعلق ہے یہ اپنی تمام تر اضافیت کے باوجود اہلِ ایمان کے لیے مخصوص ہے اس لیے اس کو رحیم الاخرۃِ کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سو حصے ہیں، جن میں سے صرف ایک حصہ اس نے اپنی تمام مخلوق پر تقسیم کیا ہے اور باقی ننانوے حصے اپنے پاس رکھے ہیں، اس دنیا میں انسانوں، حیوانوں، چرندوں اور پرندوں کے دلوں میں اپنی اولادوں کے لیے جتنی محبت موجود ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی کا صرف ایک حصہ ہے۔

مَالِكِ يَومِ الدِّينِ جو جزا کے دن کا مالک ہے۔ دین کا معنی اطاعت بھی ہوتا ہے اور ملت بھی۔ اس کے علاوہ دین کا معنی بدلہ اور جزا بھی ہوتا ہے اور اس کا معنی انصاف بھی ہوتا ہے۔

انصاف کے دن سب کے ساتھ ٹھیک انصاف ہوگا اور ہر ایک کو اس کے کیے کی جزا ملے گی۔

(معالم العرفان صفحہ ۱۱۵)

اِیَّاکَ نَعبُدُ وَاِیَّاکَ نَستَعِین کائنات میں کوئی اور ایسی ہستی نہیں ہے جس کی عبادت کی جا سکے یا جس سے استعانت (مدد طلب) کی جائے۔استعانت سے مراد مافوق الاسباب غائبانہ مدد ہے اور یہ صرف ذاتِ خداوندی کے ساتھ مخصوص ہے۔قرآن پاک میں موجود ہے **فَمَن یَّعمَل مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَھُوَ مُؤمِنٌ فَلَا کُفرَانَ لِسَعیِه** (انبیاء) جو شخص مومن ہو کر کوئی نیک عمل کرے تو اس کے کام کی ناقدری نہیں کی جائے گی بلکہ اس کی سعی مشکور ہوگی۔

امام محمد بن ابی بکر رازیؒ نے قرآن پاک کی تفسیر کے علاوہ مختار الصحاح کے نام سے لغت کی کتاب بھی لکھی۔امام محمد بن ابی بکر بن عبد القادر رازیؒ نے یہ نقطہ بیان فرمایا ہے کہ جب تک عقیدہ درست نہ ہو عبادت میں خلوص پیدا نہیں ہو سکتا۔حضرت ابنِ عباس فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کا خلاصہ حم سے شروع ہونے والی سات سورتوں میں ہے اسی طرح سورۃ 'یٰسین' کو قرآن پاک کا قلب کہا گیا ہے۔امام ابو بکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ اخلاص اسی وقت پیدا ہوگا جب ایمان پاک ہوگا اور اس میں کفر، شرک، نفاق، شک اور الحاد کی ملاوٹ نہیں ہوگی۔قلب مرکزِ اخلاق ہوتا ہے۔ ایمان، کفر، اخلاص، شک، تردد، محبت اور نفرت اس میں ہوتے ہیں، لہذا اس کی صحت ضروری ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی حقیقی سعادت اللہ تعالیٰ کی عبادت پر موقوف ہے۔مگر حقیقی سعادت اخلاص فی العبادت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ کسی سفر کے دوران حضرت معاذ حضور ﷺ کے ساتھ سواری پر پیچھے بیٹھے تھے۔راستے میں آپ نے حضرت معاذ سے پوچھا، معاذ ! کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کا حق بندوں پر کیا ہے؟ عرض کیا، حضور ! اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔پھر آپ نے خود ہی

فرمایا کہ اللہ کا حق اپنی اشرف مخلوق پر ہے **اَن یَّعبُدُ وہُ وَلَا یُشرِکُوا بِہ شَیئًا** کہ بندے صرف اسی کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں۔ اللہ تعالی کا یہ حق ہر انسان پر ہے، جو اس کی خلاف ورزی کرے گا، اللہ تعالی کے غضب کا نشانہ بنے گا۔ پھر حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا، معاذ ! کیا تم جانتے ہو کہ بندوں کا حق اللہ تعالی پر کیا ہے؟ انہوں نے پھر عرض کیا، حضور ! اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جب بندے صرف خدا وحدہ لاشریک ہی کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گے تو پھر بندوں کا اللہ پر یہ حق ہے **اَن لَّا یُعَذِّبَھُم** کہ وہ ان کو عذاب نہیں کردیگا بلکہ جنت میں داخل کردے گا۔ (معالم العرفان صفحہ ۱۲۱)

الوہیت کی شرائط

۱۔ الوہیت کی پہلی شرط واجب الوجود ہونا ہے، یعنی عبادت کے لائق وہ ہستی ہے جس کا وجود خود بخود ہے اور کسی دوسری ہستی کا عطا کردہ نہیں۔ یہی چیز خدا تعالی کو باقی مخلوق سے ممتاز کرتی ہے۔ باقی ہر چیز کا وجود خدا تعالی کا عطا کردہ ہے جب کہ اس کا اپنا وجود خود بخود ہے۔ فارسی میں اللہ تعالی کو خدا اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی ذات خود بخود ہے۔

۲۔ الوہیت کی دوسری شرط قادر مطلق ہونا ہے۔

۳۔ الوہیت کی تیسری شرط علیم کل ہونا ہے۔

۴۔ الوہیت کی چوتھی شرط خالق ہونا ہے۔ (معالم العرفان صفحہ ۱۲۳)

عبادت کے بارے میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ صرف اس ذات کی ہوسکتی ہے جو واجب الوجود، قادر مطلق، علیمِ کل اور خالق ہو۔ الوہیت کی صفات چونکہ صرف اللہ تعالی میں پائی جاتی ہیں، لہذا عبادت کا مستحق وہی ہے۔ امام بیضاوی اور دیگر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ عبادت کہتے ہیں۔ یعنی انتہائی درجے کی تعظیم، مگر تعظیم اس اعتقاد کے ساتھ پیدا ہونی چاہیئے کہ جس ذات

کی تعظیم کی جارہی ہے وہ واجب الوجود، قادرِ مطلق، علیم کل اور نافع وضار ہے۔ تعظیم قول سے بھی ہوتی ہے، عمل سے بھی اور مال سے بھی۔ اسی لیے ہم قعدے میں پڑھتے ہیں۔ عبادت یا تو ثواب حاصل کرنے کی غرض سے کی جاتی ہے یا اللہ تعالی کی گرفت سے بچنے کے لیے۔

شاہ عبدالعزیزؒ اپنی تفسیر میں عبادت کی حقیقت یوں بیان کرتے ہیں حقیقتِ عبادت تصحیح نسبتِ عبودیت است یعنی عبادت دراصل بندے کی اپنے معبود کیساتھ نسبت کی درستگی کا نام ہے۔ اگر یہ نسبت درست نہ ہوسکی تو عبادت نہیں ہوگی۔ فرماتے ہیں کہ نسبت کی تصیح اس طرح ہوگی کہ انسان اپنے آپ کو ممکن اور اللہ کی ذات کو واجب الوجود سمجھے۔ ممکن کا مطلب یہ ہے کہ یہ وجود کسی زمانے میں موجود نہیں تھا، پھر یہ اس دنیا میں معرضِ وجود میں آیا۔ اور پھر ایک دور ایسا آئیگا جب یہ وجود نہیں ہوگا، تو گویا ممکن وہ ہوتا ہے جو دو عدموں کے درمیان ہو۔

انسان اللہ تعالی کو مالک اور اپنے آپ کو مملوک خیال کرے اور یہ اچھی طرح سمجھ لے **وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ** (الانعام) یعنی اپنے مالک کو اپنے اوپر غالب اور خود کو مغلوب سمجھے اور جان لے کہ وہ جب چاہے اور جس طرح چاہے اپنے بندے کی گرفت کرسکتا ہے۔ بندہ خود کو مقدور اور اللہ تعالی کو قادر سمجھے۔ اسی طرح بندہ اپنے آپ کو مامور اور خدا تعالی کو آمر سمجھے یعنی اپنے آپ کو اللہ تعالی کے ہر حکم کا تابع خیال کرے پھر یہ بھی ہے کہ بندہ اپنے آپ کو عاجز اور خدا تعالی کو عزت والا سمجھے۔ شاہ عبدالعزیز عبادت کی یہ تعریف بھی کرتے ہیں کہ اپنے تمام اعضا و قوی ظاہرہ اور باطنہ کو اللہ تعالی کے راستے میں اس کی مرضیات پر لگا دینے کا نام عبادت ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ عبادت انسان کے ظاہری اعضا سے بھی ہوتی ہے اور باطنی اعضا سے بھی۔

ظاہری اعضا مثلا: زبان: کی عبادت یہ ہے کہ انسان قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے، اللہ تعالی کا ذکر کرتا ہے، استغفار کرتا ہے، درود شریف پڑھتا ہے، کوئی بھی اچھا کلمہ زبان سے ادا کرتا ہے تو یہ سب زبانی عبادت شمار ہوتی ہے۔

آنکھ: کی عبادت یہ ہے کہ انسان خانہ کعبہ کو دیکھے کیونکہ کعبہ شریف کو محض دیکھنا بھی عبادت میں شمار ہوتا ہے۔قرآن پاک اور دینی کتب کو دیکھنا بھی عبادت ہے۔ ہر درخت اور پودے کا ایک ایک پتہ پروردگار کی معرفت کا ایک دفتر ہے بشرطیکہ کوئی اس میں غور وفکر کرے۔

کان: ہر ایسی بات کا سننا جس سے اللہ تعالی کی محبت پیدا ہو، اس کی اطاعت کا جذبہ بیدار ہو اور دل میں اس کی یاد پیدا ہو، عبادت میں داخل ہے۔

ہاتھ اور پاؤں: انسان قرآن پاک اور دینی کتب لکھے یا اللہ تعالی کے اسمائے پاک لکھے یہ ہاتھ کی عبادت میں شامل ہے۔اسی طرح جب کوئی شخص نماز کے لیے چل کر مسجد جاتا ہے، حج کے لیے جاتا ہے، نیک لوگوں سے ملاقات کے لیے جاتا ہے۔ یہ سب پاؤں کی عبادت میں داخل ہے۔(معالم العرفان صفحہ ۱۳۰)

اعضائے باطنہ

اعضائے باطنہ میں سے عقل کی عبادت یہ ہے کہ انسان قرآنِ کریم اور شریعت کے احکام میں غور وفکر کرے، ان کو سوچے سمجھے اور پھر ان پر عمل پیرا ہو جائے۔اسی طرح نفس بھی عبادت ہے۔نفس کی عبادت یہ ہے کہ انسان صبر کرے، نفس کو مالوفات اور مرغوبات سے روکے، شیطانی کاموں سے باز رہے، ہر مصیبت میں صبر کرے، جزع فزع سے باز رہے۔غرضیکہ نفس کو تمام برائیوں سے باز رکھنا نفس کی عبادت ہے۔ بندے اور مالک کے درمیان تعلق کی درستگی ہی عبادت ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنی تفسیر عزیزی میں حضرت سفیان ثوریؒ کے متعلق لکھا ہے کہ سورۃ فاتحہ کی تلاوت کرتے ہوئے جب اس آیت پر پہنچے اِیاک نعبد و اِیاک نستعین تو غش کھا کر گر پڑے۔لوگوں نے پوچھا حضرت کیا بات ہوئی۔فرمایا جب میں نے اپنی زبان سے یہ ادا کیا کہ اے پروردگار ! ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے ہی مدد طلب

کرتے ہیں تو مجھے یکدم خیال آیا کہ اگر قیامت کے دن اللہ تعالی نے کہہ دیا کہ تو اپنے دعوی میں جھوٹا ہے تو میرا کیا حشر ہوگا۔ اگر اس نے کہہ دیا کہ تو فلاں کام کے لیے حاکم سے دوستی کرتا ہے، تنخواہ لینے کے لیے فلاں شخص کے پاس جاتا ہے اور شفا کے لیے ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے تو تیرے دعوی میں صداقت کہاں رہ گئی، تو نے تو اسباب کو موثر سمجھ لیا۔ فرماتے ہیں کہ یہ خیال آتے ہی مجھ پر غشی طاری ہوگئی۔

یہ تو ان کے تقوی کی بات تھی۔ مگر ظاہری اسباب کو ترک کرنے کی بھی اجازت نہیں بلکہ عالمگیری میں یہ فتوی موجود ہے کہ ظاہری اسباب ترک کرنا جائز نہیں اگر کوئی شخص بوقت ضرورت ان اسباب سے مستفید نہیں ہوتا اور مرجاتا ہے تو وہ مردار کی موت مریگا بھوک کو مٹانے کے لیے کھانا ضروری ہے، تشنگی کو رفع کرنے کے لیے پانی پینا لازم ہے۔ لہذا اگر کوئی شخص ان اسباب ظاہرہ کو اختیار نہیں کرتا تو وہ قابل مواخذہ ہوگا۔ البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان اسباب کو خالص اللہ تعالی پر بھروسہ کرتے ہوئے استعمال کرے۔ کیونکہ ان اسباب میں تاثیر پیدا کرنا اللہ تعالی کا کام ہے۔ اگر کھانے میں بھوک مٹانے کی ذاتی تاثیر ہوتی تو لوگ جوع الکلب کی بیماری میں مبتلا نہ ہوتے جائیں زیادہ سے زیادہ کھانے سے بھی پیٹ نہیں بھرتا بلکہ بھوک بدستور قائم رہتی ہے۔ بھوک کو روٹی نہیں مٹاتی بلکہ اللہ تعالی مارتا ہے۔

ابوداؤد شریف میں ایک صحابی کا ذکر ہے جو رات کو پہرہ دے رہا تھا۔ اس دوران اس نے نماز شروع کر دیا اتنے میں دشمن کی طرف سے تیر آیا۔ جو صحابی کے جسم میں پیوست ہوگیا۔ آپ نماز میں اس قدر منہمک تھے کہ جسم کا خون بہ جانے کے باوجود انہیں محسوس بھی نہ ہوا کہ ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ امام ابوحنیفہؒ کا بھی آتا ہے۔ آپ باقی لوگوں کے ساتھ نماز ادا کر رہے تھے اتنے میں ایک سانپ چھت سے گر پڑا سب لوگ بھاگ گئے مگر امام صاحب نماز میں اس قدر مشغول تھے کہ آپ کو پتہ بھی نہ چلا کہ کیا ہوگیا ہے۔

حضرت عروہ بن زبیرؒ مشہور تابعی اور مدینہ کے سات چوٹی کے فقہا میں سے ہوئے ہیں۔آپ بڑے پائے کے عالم اور کمال درجے کے عبادت گزار تھے۔آپ کے پاؤں میں زخم آ گیا لوگ آپریشن کرنا چاہتے تھے مگر آپ اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔آخر وہ جب نماز میں منہمک ہو گئے تو آپ کے پاؤں کا آپریشن کر دیا گیا آپ عبادت میں اس قدر مستغرق تھے کہ آپریشن کا پتہ تک نہ چلا۔عام لوگوں پر عبودیت کے اثرات ظاہر نہیں ہوتے کیونکہ وہ عبادت کی شرائط پوری نہیں کرتے۔عبودیت کا سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کو نیکی کی توفیق مسلسل ملتی رہتی ہے۔اگر اس میں عبادت کا ذوق وشوق بڑھ رہا ہے تو سمجھ لو کہ نیکی کی مزید توفیق مل رہی ہے اور اس پر آثار عبودیت ظاہر ہو رہے ہیں۔اگر کوئی شخص نیکی کے کام کرنے سے رک گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے نیکی کی توفیق ہی سلب کر لی گئی ہے ایسے شخص پر عبودیت کے کیا آثار ظاہر ہوں گے؟ بزرگانِ دین کے تذکرے میں بعض ایسے لوگوں کا ذکر ہے جن کی ظاہری حالت تو کچھ نہیں ہوتی مگر عبادت کی روح کو پالنے کی وجہ سے اللہ تعالی کے مقربین میں شامل ہوتے ہیں۔ایسے ہی بزرگوں میں شیبان راعی ہیں۔شیبان راعی جنگل میں بکریاں چراتے تھے،اس دوران جنابت کی حالت لاحق ہو گئی۔مگر غسل کے لیے پانی نہیں تھا اللہ تعالی کے حضور عرض کیا، پروردگار! میں تیرا عاجز بندہ ہوں، سوائے تیرے میرا کوئی آسرا نہیں، مجھے نماز پڑھنا ہے مگر طہارت کی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔اتنا عرض کرنا تھا کہ بارش شروع ہو گئی، آپ نے غسل کر کے نماز ادا کی۔آپ ہی کے متعلق ذکر آتا ہے کہ جب جمعہ کا دِن آتا تو بارگاہ رب العزت میں عرض کرتے، مولا کریم! شہر میں جا کر جمعہ کی نماز ادا کرتا ہے۔مگر بکریوں کی دیکھ بھال کرنے والا بھی کوئی نہیں۔پھر خود ہی بکریوں کو ایک جگہ جمع کر کے ان کے اردگرد ایک دائرہ کھینچ دیتے اور جمعہ کے لیے چلے جاتے اللہ تعالی ان کی حفاظت کرتا اور کوئی بکری دائرے سے باہر نہ نکلتی، (تفسیر منہاج القرآن جز اول صفحہ ۱۴۲)

اِهدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِيم صراطِ مستقیم کیا ہے؟ اس کی تشریح خود قرآن پاک میں موجود

ہے۔اس راستے سے مراد اسلام، دین اور توحید کا راستہ ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر اللہ کے تمام انبیاء گامزن رہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ماننا انسان کا فطری حق ہے۔ جو شخص ان فطری تقاضوں کے مطابق چلے گا، فرائض ادا کرے گا وہی صراطِ مستقیم کا مسافر ہوگا۔ انسان کو عقل، وہم اور حواسِ ظاہرہ وباطنہ کی ضرورت ہے۔ اگر عقل ہی نہ ہو تو نہ تو انسان مکلّف ہو سکتا ہے اور نہ ہدایت پا سکتا ہے۔ حواس ظاہرہ جو حصولِ علم کے ذرائع ہیں۔ اگر انسان کو آنکھ اور کان جیسی عظیم نعمت حاصل نہ ہو تو انسان علم حاصل نہیں کر سکتا اور نہ ہی صراطِ مستقیم کی پہچان کر سکتا ہے۔ حواس ظاہرہ کے علاوہ حواسِ باطنہ مثلاً حس مشترک، خیال، وہم، قوت متفکرہ وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ حق وباطل کی پہچان کے لیے ان کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

علم کا اولین ذریعہ وحی الٰہی ہے جو اللہ کے رسول پر آتی ہے۔ سورۃ السجدہ میں موجود ہے **وَجَعَلنَا مِنهُم اَئِمَّةً یَّهدُونَ بِاَمرِنَا** ہم نے رسولوں کو امام اور پیشوا بنا کر بھیجا تاکہ وہ ہمارے حکم کے مطابق انسانوں کی راہنمائی کر سکیں۔ یہ تمام انبیاء کا کام رہا ہے کہ وہ اپنی امتوں کو صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتے ہیں، لہٰذا **اِهدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِيم** میں اللہ تعالیٰ سے رسول مبعوث کرنے کی دعا بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی کی جاتی ہے کہ مولا کریم! ہمارے دلوں کو اسرار و معارف کے لیے کھول دے تاکہ ہم ہر چیز کو اس کی اصلی حیثیت میں جان اور پہچان سکیں کیونکہ یہ چیز بھی ہدایت میں داخل ہے۔ اس کے علاوہ وحی الٰہی، الہام اور سچے خوابوں کے ذریعے بھی ہدایت نصیب ہوتی ہے۔ وحی تو صرف انبیا پر آتی ہے۔ البتہ الہام انبیا اور غیر انبیا کو بھی ہوتا ہے اور رویا صادقہ (سچے خواب) ہر ایماندار کو آ سکتے ہیں۔

انسان جس ہدایت کا طالب ہے اس سے مراد ایسی اچھے طریقے سے راہنمائی ہے جس میں نرمی اور لطافت ہو اور جس میں سختی اور درشتگی نہ ہو۔ ہدایت دو طریقے سے ہو سکتی ہے۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ جس شخص کو راستہ معلوم نہیں ہے، کوئی دوسرا شخص اس کو دور سے راستہ دکھا دے کہ بھئی یہ راستہ تمہاری منزل مقصود کی طرف جاتا ہے۔

ہدایت کا دوسرا معنی یہ ہے کہ کسی شخص کی راہنمائی اس طریقے سے کی جائے کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے منزلِ مقصود تک پہنچا دیا جائے اسے ایصال الی المطلوب کہتے ہیں ۔ ہدایت اور راہنمائی کا یہ بہترین طریقہ ہے۔

عقیدے میں کفر، شرک اور نفاق کی ملاوٹ ہوسکتی ہے جب کہ اعمال میں ریا شامل ہو جاتی ہے، لہذا یہ دعا ان تمام امور پر مشتمل ہے۔ جب انسان سیدھے راستے کی دعا کرتا ہے تو کہتا ہے کہ پروردگار! ہمیں صحیح راستہ دکھا، اس پر چلا اور اس پر استقامت عطا فرما۔

صِرَاطَ الَّذِينَ اَنعمتَ عَلَيهِم اب مادی انعامات تو عام ہیں اور دنیا میں ہر شخص پروارد ہوتے رہتے ہیں۔ مگر جن انعامات کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے ان سے مراد دینی اور روحانی انعامات ہیں۔ مفسر قرآن ابو العالیہؒ فرماتے ہیں کہ انعام یافتہ لوگوں کے راستے سے مراد حضورﷺ کی ذاتِ مبارکہ ہے اور آپ کے بعد آپ کے دونوں ساتھی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ ہیں کیونکہ آپ کا اپنا فرمان ہے **اِقتَدُوا بِالَّذِينِ مِن بَعدِی اَبِی بَکرٍؓ وَّ عُمَرؓ** یعنی میرے بعد ان دو حضرات کی اقتدا کرو، کیونکہ ان کا طریقہ میرا طریقہ ہے اور پھر باقی سارے صحابہ ان دو کے تابع ہیں۔ ان کے بعد باقی خلفائے راشدین کا نمبر آتا ہے، وہ بھی امت کے لیے بطور نمونہ ہیں۔ روحانی انعامات میں سے بعض تو انسان خود اپنی محنت سے کماتا ہے اور اللہ تعالی کی بخشش اور فیضان سے بھی انعام حاصل ہوتا ہے۔ انسانی جسم میں روحِ انسانی اللہ تعالی کا خاص انعام ہے۔ روحِ حیوانی تو قرارِ حمل کے ساتھ پہلے دن سے اپنے کام شروع کر دیتی ہے مگر روحِ انسانی جو انسان کے قلب میں چوتھے مہینے میں ڈالی جاتی ہے اس کا نمونہ علیین سے آتا ہے۔ بعض انعامات انسان خود اپنی محنت سے حاصل کرتا ہے۔ ان میں تزکیہ نفس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اہلِ تصوف کی اصطلاح میں اسے تخلیہ کہتے ہیں۔ جب کوئی انسان عبادت و ریاضت میں پابندی اختیار کرتا ہے اور مشقت برداشت کرتا ہے تو اس کے جسم اور روح میں تزکیہ

پیدا ہوتا ہے۔صدیق کا ذہن اور دماغ اتنا شفاف آئنہ ہوتا ہے جس پر نبی کے علوم کا عکس پڑتا ہے اور یہ اس کی بات نبی کی بات سے مل جاتی ہے ایسے شخص کو صدیق کا لقب دیا گیا ہے۔

تیسرا انعام یافتہ گروہ شہدا کا ہے۔شہدا کی قوت عملیہ کو کمال حاصل ہوتا ہے جس طرح نبی کی قوت عملی اعلی درجے کی ہوتی ہے، اسی طرح شہید کی قوت عملی اس کے قریب قریب ہوتی ہے۔

انعام یافتہ گروہوں میں چوتھا گروہ صالحین کا ہے۔ان کی قوتِ علمی اور عملی اگرچہ اعلی ترین درجے کی تو نہیں ہوتی مگر ان میں کامل درجے کا اتباع پایا جاتا ہے۔عام انسان کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ذہن، دماغ، قوتِ علمیہ، قوتِ عملیہ اور قوتِ نظریہ کو مذکورہ بالا لوگوں کے نمونے پر استعمال کریں۔اگر وہ اس میں کامیاب ہو جائیں تو ان کی نسبت ان چار گروہوں کے ساتھ درست ہو جائیگی۔

خواجہ ابراہیم ادھمؒ بادشاہ تھے مگر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اللہ اللہ کرنے لگے بزرگوں سے ملے، عبادت وریاضت کی، حج کیا اور آخر میں ملک سے بہت دور صوبہ شام کے علاقہ صوریہ میں وفات پائی۔ان کے متعلق امام رازیؒ تفسیر کبیر میں رقمطراز ہیں کہ بیت اللہ شریف کی طرف پیدل جارہے تھے۔راستے میں کسی دیہاتی نے پوچھا، شیخ ! کہاں کا ارادہ ہے؟ فرمایا بیت اللہ شریف کی زیارت کا ارادہ ہے اعرابی کہنے لگا، اتنا لمبا سفر ہے اور آپ کے پاس سواری بھی نہیں ہے۔خالی ہاتھ ہیں آپکے پاس توشہ بھی نظر نہیں آتا۔ابراہیم ادھم نے جواب دیا، بھائی ! میرے پاس تو بہت سی سواریاں ہیں مگر تمہیں نظر نہیں آتیں، جب مجھ پر کوئی مصیبت آتی ہے تو صبر کی سواری پر سوار ہو جاتا ہوں، جب کوئی نعمت ملتی ہے تو شکر کی سواری کو استعمال کرتا ہوں، جب خدا تعالی کی طرف سے کوئی فیصلہ آجاتا ہے، قضا نازل ہوتی ہے تو میں رضا کی سواری پر سوار ہو جاتا ہوں اور جب نفس کسی بات پر آمادہ کرتا ہے تو میں یقین سے جان لیتا ہوں اور نفس کو کہتا ہوں کہ زندگی کے زیادہ دن گزر گئے ہیں اور تھوڑے دن باقی ہیں۔تو مجھے کس راستے پر ڈالنا چاہتا ہے۔

لہذا نفس رک جاتا ہے کیونکہ کیا معلوم ہے کہ تھوڑی دیر بعد ہی موت آ جائے۔ جب دیہاتی نے یہ بات سنی تو کہنے لگا **سِر بِاذنِ اللّٰہِ فَاَنتَ رَاکِبٌ وَاَنَا رَاجِلٌ** چلیئے صاحب! آپ اپنا سفر جاری رکھیں۔ خدا کے حکم سے آپ سوار ہیں اور میں پیدل ہوں۔ (معالم العرفان صفحہ ۱۶۸)

غَیرِ المَغضُوبِ عَلَیھِم وَلَا الضَّآلِینَ امام مجددؒ نے ایک نقطہ بیان فرمایا ہے کہ ہم تشہد میں پڑھتے ہیں **اَشھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبدُہٗ وَرَسُولُہٗ** میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ فرماتے ہیں کہ یہاں پر عبد کو پہلے اور رسول کو بعد میں اس لیے لایا گیا ہے کہ عبد کا تعلق اللہ کے ساتھ ہے اور رسول کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہے، لہذا اللہ کے ساتھ تعلق کی درستگی پہلے ہونی چاہیئے۔ (معالم العرفان صفحہ ۱۷۳)

جو شخص اللہ کی اطاعت کرتا ہے، وہ منعم عالیہ ہے۔ اس پر اللہ تعالی کا احسان اور فضل ہوتا ہے اور وہ انعام یافتہ ہوتا ہے۔ بصورتِ دیگر اگر کوئی شخص نافرمانی کرتا ہے اور معصیت میں مبتلا ہے تو وہ مغضوب علیہ ہے۔ اسی طرح جو لوگ جہالت کی وجہ سے راہِ راست سے بھٹک جاتے ہیں وہ ضال کہلاتے ہیں۔ بہر حال مقبول گروہ ایک ہی ہے اور وہ منعم علیہ ہے۔ باقی سب گروہ مردود ہیں۔ عمل میں خرابی ہو تو انسان فاسق ہو کر مغضوب علیہ بن جاتا ہے اور اگر علم میں خرابی ہو، عقیدہ فاسد ہو جائے تو ایسا شخص ضال ہوتا ہے۔ یہ سب گروہ مغضوب علیہ یا ضال ہیں سوائے ان لوگوں کے جن کے علم اور عمل دونوں صحیح ہیں اور وہ ایسے لوگ ہیں جو انبیا، صدیق، شہدا اور صالحین کے نقش قدم پر چلتے ہیں، یہی مقبول ہیں۔ مغضوب علیہ وہ ہوتے ہیں جن کی قوتِ عملیہ خراب ہو، فاسق بھی اسی گروہ میں شامل ہیں اور ضال وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی فکر فاسد ہو جائے عقیدہ بگڑ جائے جو کہ علمی خرابی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ امام حسن بصری کا مقولہ ہے کہ جس شخص نے سورۃ فاتحہ کو پڑھ لیا اس نے گویا تورات، زبور، انجیل اور قرآن پاک چاروں کتابوں کو پڑھ لیا۔

(معالم العرفان صفحہ ۱۷۶)

حروف مقطعات، حسابی کوڈ

۱۹۷۶ میں ایک مصری فاضل راشد نامی نے جو امریکہ میں مقیم تھا۔ کمپیوٹروں کے مدد سے یہ انکشاف کیا کہ ان مقطعات کے اکثر حروف، ہر سورۃ میں کسی اعدادی کوڈ کے طور استعمال ہوئے ہیں اور یہ اعدادی کوڈ 19 کا ہندسہ یا اس کی کوئی ''حاصل ضرب'' ہے۔

اب قارئین نے دیکھا ہوگا کہ اعداد یا ابجد کا استعمال مسلمانوں میں عرصہ سے رائج ہے اور قرآن پاک میں از خود کئی اعداد کا ذکر ہے۔ سورۃ الحجر کی تفسیر کے وقت اس سلسلہ میں ایک اعدادی کوڈ کا ذکر بھی ہے کہ سورۃ الحجر کی آیت مبارکہ 9، میں رب کی ذات کا فرمان ہے کہ ہماری ذات پاک نے یہ قرآن پاک نازل فرمایا اور ہم اس کے نگہبان ہیں۔ تو وہاں پر ہم نے علم الاعداد کی تعداد اور قرآن پاک کے حروف اور کئی متعلقہ حروف سے بازگشت کے طور مفرد نکال کر جس طرح 9، کے ہندسہ کے قرآن پاک میں استعمال اور سب سے بڑا ہندسہ ہونے کی جو تفصیل لکھی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رب کی ذات پاک اعداد کو جو اپنے کلام میں استعمال فرماتے ہیں۔ وہ حیران کن انکشافات ہیں اور 19 کے ہندسہ کو تو قرآن پاک میں خوب استعمال فرمایا کہ اس ہندسہ میں سب سے بڑا ہندسہ 9 بھی ہے اور سب سے چھوٹا ہندسہ ایک بھی ہے اور یہ ہندسہ کسی اور عدد سے تقسیم نہیں ہوتا۔

سورۃ المدثر کی آیت مبارکہ ۳۰ میں دوزخ کی نگہبانی کیلیئے 19 فرشتے ہیں۔ جس سلسلہ میں سورۃ المدثر کی تفسیر کے وقت کافروں کے جاہلانہ ردِعمل کا ذکر بھی ہے کہ انہوں نے اعتراض بھی کیا کہ اربوں کھربوں دوزخیوں کو یہ انیس فرشتے کیسے کنٹرول کریں گے کہ جاہلوں نے اس سورۃ کی اگلی آیت مبارکہ ۳۱ پر دھیان نہ دیا جس میں فرمایا ''کیا رب کی ذات پاک کے لشکروں کا کوئی حساب نہیں''۔ ان بیانات میں بڑی آزمائشیں ہیں تو معلوم ہوا کہ 9 کے ہندسہ

کے علاوہ رب پاک نگہبانی کیلئے 19 کے ہندسہ کو بھی استعمال فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کے حروف یا الفاظ کو بعض مقامات پر 19 کے حساب سے گن گن کر رکھا کہ اگر کوئی تبدیلی کرے یا کوئی لفظ وہاں سے ہٹائے یا کسی حرف کا اضافہ کرے تو یہ تحریف فوراً سامنے آجائے۔

19 کے ہندسہ کو اعدادی کوڈ کے طور پر استعمال فرمایا تو بے شمار انکشافات ہوئے، چنانچہ پہلی وحی میں سورۃ العلق کی پانچ آیات کے 19 الفاظ ہیں جن کے ۷۶ (19x۴) حروف ہیں۔ دوسری وحی میں سورۃ القلم کی جو آیات نازل ہوئیں ان کے ۳۸ (19x۲) حروف ہیں۔ تیسری وحی میں سورۃ المزمل کی دس آیات کے ۵۷ (19x۳) کے الفاظ ہیں۔ چوتھی وحی میں سورۃ المدثر کی آیات نازل ہوئیں اور اس تیسویں آیت مبارکہ میں 19 فرشتوں کی نگہبانی کا ذکر ہے۔

اس کے بعد الفاتحہ پوری سورۃ کے طور پر نازل ہوئی اور اس سورۃ کی تفسیر کے وقت ہم لکھ آئے ہیں کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس کی پہلی آیت ہے اور صرف اسی سورۃ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو ایک آیت مانا گیا ہے۔ باقی سورتوں کے ساتھ یہ الفاظ اعزازی ہیں۔ البتہ اس آیت کے حروف 19 ہیں اور اس آیت میں جو اسم کا لفظ ہے وہ قرآن پاک میں 19 دفعہ آتا ہے۔ اللہ کا لفظ قرآن پاک میں ۲۶۹۸ (19x۱۴۲) دفعہ آتا ہے۔ الرحمٰن کا لفظ ۵۷ (19x۳) آتا ہے۔ الرحیم کا لفظ ۱۱۴ (19x۶) دفعہ آتا ہے۔ خود بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرآن پاک میں ۱۱۴ (19x۶) دفعہ ہے کہ قرآن پاک کی ۱۱۴ (19x۶) سورتوں میں صرف ۱۱۳ سورتوں کے ساتھ ہے۔ سورۃ التوبہ کے ساتھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں ہے کہ سورۃ النمل کی آیت مبارکہ ۳۰ میں بھی یہ الفاظ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم موجود ہیں۔ اب اس طرح کے ہندسہ میں اعدادی کوڈ کے طور پر استعمال ہونے کی بہت مثالیں دے سکتے ہیں۔ لیکن ان مثالوں کو اب صرف مقطعات کے الفاظ تک محدود کریں گے۔

تمام سورتوں کے مقطعات کے ساتھ ایک چارٹ لگا رہے ہیں جس کے ملاحظہ کرنے سے خود

قارئین پر مقطعات کے ساتھ 19 ہندسہ کے اعدادی کوڈ ہونے کا پہلو اپنے آپ واضح ہوجائے گا۔لیکن چند ایک جھلکیاں دیں گے کہ کل ۱۱۴سورتوں میں صرف ۲۹ سورتوں کے ساتھ یہ مقطعات ہیں اور جو حروف ان مقطعات میں استعمال ہوئے ہیں ان کی تعداد۱۴ ہے اب یہ۱۴حروف مقطعات + یہ سورتیں کریں تو حاصل جمع ۵۷ (۱۹x۳) بنتی ہے۔

اس کے بعد ان ۲۹ سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے نمبر شمار میں جیسے سورۃ البقرہ کا نمبر شمار۲ ہے اور سورۃ القلم کا نمبر شمار ۶۸ جو ساتھ لکھنے سے تو ان کا حاصل جمع ۸۲۲ بنتی ہے۔ اس میں حروف مقطعات کی مرکبات ۱۴ کو بھی جمع کر دیں تو کل حاصل جمع ۸۳۶ (۱۹x۴۴) ہوجائے گی۔

اب سورۃ البقرہ اور سورۃ القلم کے درمیان جن سورتوں پر مقطعات نہیں ہیں ان کی تعداد ۳۸ (۱۹x ۲) بنتی ہے کہ یہ کل ۶۷ سورتیں ہیں جن میں ۲۹ سورتیں مقطعات والی ہیں (۶۷-۲۹)=۳۸=(۱۹x۲)

اب غور سے دیکھیں کہ چھ سورتوں کے مقطعات ''الف لام اور میم'' ہیں۔ پانچ سورتوں کے مقطعات الف لام را ہیں۔ ایک سورۃ کا مقطعات الف لام میم اور را ہے اور ایک سورۃ کا مقطعات الف لام میم اور صاد ہے۔ان سورتوں کے مقطعات اکیلے طور پر اپنی حاصل جمع سے ۱۹ کا حاصل ضرب نہیں بن سکتے۔ ان تمام حروف کو اکٹھا کیا جائے تو تب یہ حروف ۱۹ کی حاصل ضرب بنتے ہیں لیکن باقی کئی مقطعات جیسے 'قاف' یا 'نون' ہیں تو اس اکیلے حرف کو کسی سورۃ میں اتنی دفعہ دہرایا کہ ان اکیلے کی تعداد ۱۹ پر تقسیم ہوسکتی ہے کہ ۱۹ کی حاصل ضرب ہے۔

یہاں بھی اللہ تعالی نے ۱۹ کے اعدادی کوڈ کو کئی طریقوں سے استعمال فرمایا کہ کسی جگہ تو تمام مقطعات والی سورتوں کے تمام 'الف' یا تمام 'میم' ۱۹ پر تقسیم ہونے والا عدد یا ہندسہ بن سکے۔ کسی جگہ تمام 'الف' اور 'لام' اور 'میم' تینوں اکٹھے ہوکر ۱۹ پر تقسیم ہونے والا ہندسہ بنے یا ایسا کچھ 'الف، لام، میم اور صاد' کیلیے ہوا۔ 'حا' اور 'میم' کیلیے ہوا۔ چارٹ کے ملاحظہ سے یہ سب انکشافات کھل کر

سامنے آجائیں گے۔

اور ایسا کرنا یا جو کچھ ہوا کسی انسانی طاقت کے بس سے باہر ہے۔ ہزاروں کمپیوٹروں پر کئی سال کام کر کے شاید کوئی ادارہ چند سالوں میں چند صفحات تیار کر سکے لیکن عالموں کے رب نے تو صرف تصور باندھا ہوگا اور کن فیکون کی ادائیگی سے سب کچھ ہوگیا ہوگا کہ پوری کائنات کی تخلیق کی اور ایسے کاموں کیلیے لاکھوں کروڑوں کارداروں یا مشینوں کے استعمال سے یہ کام ہوئے ہوں گے کہ اللہ تعالی کی ذات پاک کے معجزے بڑے نرالے ہیں کہ قرآن پاک کے الفاظ جو حروف بھی گن گن کر ڈالے کہ کسی سورۃ میں یا سورتوں کی جمع میں اس حرف کی تعداد اتنی رہے جو پر تقسیم ہو سکے۔ اس سلسلہ میں حروف کے ہجوں میں بھی روایات سے ہٹ کر تبدیلی کی اور بعض دفعہ روایات سے ہٹ کر لفظ بھی تبدیل کر دیا۔

اس سلسلہ میں سورۃ الاعراف کی آیت مبارکہ ۶۹ میں لفظ 'بصطۃ' کی طرف دھیان دیں جس کے معنی وسعت اور کشادگی ہیں اور یہ 'ص' کی بجائے 'س' کے استعمال سے 'بسطۃ' لکھا جاتا ہے۔ جیسے سورۃ البقرہ کی آیت مبارکہ ۲۴۷ میں لکھا ہوا ہے۔ اس تبدیلی کا ایک مقصد یہ تھا کہ سورۃ الاعراف میں حرف 'ص' کی تعداد ۹۷ کی بجائے ۹۸ کرنا تھی کہ تمام حروف 'ص' سورۃ مریم کے اور سورۃ 'ص' کے ۱۵۲=(۹۸+۲۶+۲۸) کی حاصل جمع ۱۵۲ ہو جائے کہ وہ (۱۹x۸) کی حاصل ضرب بن جائیں۔

اس بڑھوتری کی بجائے سورۃ ''ق'' میں حروف ''ق'' کی تعداد ۵۸ کی بجائے ۵۷ کرنا تھا کہ وہ ۱۹x۳= کی حاصل ضرب ۵۷ بن جائیں تو اس سورۃ کی آیت مبارکہ میں الفاظ 'قوم لوط' کی بجائے 'اخوان لوط' استعمال کیے کہ باقی سارے قرآن پاک میں الفاظ 'قوم لوط' ہیں۔ ایسا ہی کرنے کیلیے سورۃ آل عمران کی آیت مبارکہ ۹۶ میں لفظ 'مکہ' کی بجائے 'بکہ' استعمال کیے کہ اس سورۃ میں 'میم' کی تعداد ۲۵۲ کی بجائے ۲۵۱ کرنا تھی تاکہ سب 'میموں' کی تعداد

۸۶۸۳=(۴۵۷x۱۹) کی حاصل ضرب رہیں۔

قرآن پاک کی نگہبانی کے سلسلہ میں یہ کچھ حروف مقطعات کے استعمال سے جھلکی دی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں طرز بیانات کے لیے الگ الفاظ سے مفہوم میں جو یک رنگی رکھی وہ از خود ایک بہت بڑا مضمون ہے کہ اس طرح بھی قرآن پاک کی حفاظت مقصود ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے سب رازوں کو سمجھنے کا ہم شعور نہیں رکھتے۔ مقطعات کے سلسلہ میں بھی ہر سورۃ میں متعلقہ مقطعات کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ یہاں صرف ۱۹ کے ہندسہ کے بارے چند اور فطری انکشافات کیے جا رہے ہیں۔

مثلاً چاند، سورج اور زمین انسان کیلیے اہم ترین کائناتی یا فلکی نظام ہیں۔ یہ تینوں ہر ۱۹ سال بعد ایک دوسرے کے آمنے سامنے ایک لائن والی پوزیشن بناتے ہیں۔ مشہور سیارچہ Hally comet کے بارے کہا جاتا ہے ہر ۷۶ (۱۹x۴) سالوں کے بعد زمین پر ظاہر ہوتا ہے۔ ہر انسان کے اندر ۲۰۹=(۱۹x۱۱) ہڈیاں ہوتی ہیں۔ تخلیق کے لمحات کے بعد اوسطاً ہر بچہ ماں کے پیٹ میں ۲۶۶=(۱۹x۱۴) دن یا ۳۸=(۱۹x۲) ہفتے رہتا ہے۔

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

تفسیرِ منہاج القرآن

سورۃ الفاتحہ

معالم العرفان

حضور ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! میں تجھ سے تیرے ہر اس اسم پاک کے واسطے سے سوال کرتا ہوں جس کے ساتھ تو نے اپنے آپ کو موسوم کیا ہے یا اس کو کسی کتاب میں نازل فرمایا ہے یا اپنی حقوق میں سے کسی کو بتایا ہے، یا اسے اپنے ہی پاس رکھا ہے یا تیرے علم میں ہے، میں ہر اس اسم کے واسطے سے درخواست کرتا ہوں کہ قرآن پاک کو میرے دل کی بہار بنادے یعنی جس طرح موسم بہار کے سبزہ، پھول اور پھول کو دیکھ کر لوگوں کے دل مسرور ہوتے ہیں اسی طرح اس قرآن پاک کو میرے دل کی بہار بنادے کہ سیا سے دیکھ کر باغ باغ ہو جائے۔ پھر عرض کیا، اس قرآن کو میری آنکھوں کا نور بنادے۔ اس کے ذریعے میرے غم اور اندیشوں کو دور فرمادے۔ حضور ﷺ کو قرآن پاک کے ساتھ اس قدر محبت تھی اور آپ کے دل میں اتنی عظمت تھی کہ آپ اس کے لئے دعا فرمایا کرتے تھے۔ (معالم العرفان صفحہ ۲۴)

ادب سے محروم شخص علم و عمل کی بے پناہ دولتوں کے باوجود لذتِ ایمان سے محروم رہتا ہے۔ یہ امر ذہن نشین رہے کہ صاحب حکمت کا کوئی فعل حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ ہر فعل کے صادر کرنے کی قوت و ہمت اور طاقت و صلاحیت انسان کو بارگاہِ ربِ ذوالجلال سے ہی نصیب ہوتی ہے۔ کبھی بھی اس فعل کو اپنا کمال نہ سمجھ کیونکہ فاعل حقیقی تو نہیں بلکہ اللہ کی ذات ہے۔ یہاں انسانی

فکر کو کبر و نخوت کی تباہ کاریوں سے بچنے کی صورت بتائی گئی ہے۔ بسم اللہ میں چونکہ ذکر صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور ابتدا فعل کی نسبت انسان کی طرف مذکور نہیں ہے اس لئے حکم ہے کہ بسم اللہ محض جائز کاموں کے آغاز میں پڑھی جائے، ناجائز اور خلاف شرع امور پر نہیں۔

''بسم'' میں نام حق سے استعانت کی تعلیم دے کر ذریعہ کی اہمیت بھی واضح کردی گئی اور اس کی اضافت ''اللہ الرحمٰن الرحیم'' کی طرف کر کے حقیقتِ حال کو بھی بیان کردیا گیا۔ کاروبارِ حیات میں مادی مسائل ہوں یا روحانی، ان سے استفادہ و استمداد بھی کیا جائے کہ نظامِ کائنات کا اصول بھی یہی ہے اور ہر ایک اعانت میں کارسازِ حقیقی کے لطف و کرم پر بھی نظر رکھی جائے کہ تقاضائے بندگی یہی ہے۔

تسمیہ میں استعمال ہونے والا دوسرا لفظ ''اللہ'' ہے، جو ذاتِ باری تعالیٰ پر دلالت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اسے اسمِ ذات کہتے ہیں۔ صفات ایک اعتبار سے ذات کا حصہ ہوتی ہیں۔ جب کہ ذات اپنی کسی بھی صفت کا حصہ نہیں ہوتی۔ ذات کے دامن میں اس کی تمام صفات از خود موجود ہوتی ہیں۔ اس لئے اسمِ ذات ہی جملہ صفات و کمالات کو پورے طور پر محیط ہوتا ہے۔

یہ اسمِ ذات (اللہ) قرآنِ حکیم میں کم و بیش ستائیس سو ایک (۲۷۰۱) مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اتنی کثرت سے کوئی دوسرا لفظ قرآن میں استعمال نہیں ہوا۔

مذاہبِ عالم اور تصورِ اسمِ ذات:

ہندو دھرم میں 'پرمیشور' کا لفظ عام دیوی دیوتا کیلئے نہیں بلکہ ربِ کائنات کے لئے بولا جاتا ہے۔ 'برہم' بھی اسی ہستی کا نام ہے۔ اسی طرح ہندو یوگ میں روحانی منازل طے کرنے کے لئے 'اوم' کا وِرد بطور ذکرِ اسمِ ذات مروج ہے۔ بلکہ یجروید ہندو دھرم کی مقدس مذہبی کتاب کے آخر میں 'اوم' کو 'برہم' کا ذاتی نام لکھا گیا ہے۔ لیکن رگ وید ۴۔۱۸۔۶ میں جو منتر

مذکور ہے اس میں ندیوں کے اللہ، اللہ شبد پکارنے کا ذکر آتا ہے۔ جس سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ قدیم ہندولٹریچر میں بھی ذات حق کے لئے لفظ 'اللہ' بطور اسمِ ذات مستعمل تھا۔

ہرمز نے دنیا کو چھ ادوار میں پیدا کیا۔ زرتشت (کتاب کا نام) میں 'ہرمز' کا لفظ اسمِ ذات کے طور پر منقول ہے۔ اس کا مادہ الف، لام اور ھ پر مشتمل ہے۔ عبرانی، سریانی، آرامی، کلدانی، حمیری اور عربی وغیرہ سب زبانوں میں یہی مادہ مختلف شکلوں میں پایا جاتا رہا ہے۔

لفظ اللہ کی شانِ علمیت:

لفظ "اللہ" اسمِ علم مشتق ہے۔ یعنی یہ لفظ صرف ذاتِ باری تعالی کے نام کے طور پر واضح کیا گیا ہے اور بلا شرکت غیرے اسی پر ہی دلالت کرتا ہے۔ نہ یہ خود کسی لفظ سے ماخوذ ہے اور نہ ہی کوئی لفظ اس سے۔ گویا یہ لفظ خود بھی لفظی و معنوی اعتبار سے توحید محض کی دلیل ہے۔ (تفسیر منہاج القرآن جز اول صفحہ ۱۱۳)

لفظِ اللہ کی اصل اور اس کا اِشتقاق

بعض علما کے نزدیک لفظ اللہ اسمِ علم غیر مشتق ہے جبکہ بعض علما و محققین کی رائے یہ ہے کہ یہ لفظ اسمِ مشتق ہے۔ اس لحاظ سے اس کے متعدد مادے بیان کیے گئے ہیں۔

پہلا مادہ اشتقاق: الٰہ (عبادت کرنا)

اس لفظ کے کئی مادے بیان کیے گئے ہیں۔ چنانچہ اس کے لغوی اشتقاق کے سلسلہ میں علما کا ایک قول یہ ہے کہ الٰہ، یالٰہ سے مشتق ہے۔ اس کا معنی عبادت کرنا ہے۔ اس طرح الٰہ کا معنی معبود (جس کی عبادت کی جائے) قرار پایا۔ زمانہ قدیم میں سورج کی پرستش کرنے والوں نے سورج کا نام الھہ رکھا ہوا تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ بھی یہی تھی کہ وہ اسے معبود تصور کرتے تھے۔ قرآن حکیم میں لفظ الٰہ اکثر و بیشتر معبود کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، ارشاد باری تعالی ہے۔

اِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِى قَالُوا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ

اِبرَاھِیمَ وَاِسمَاعِیلَ وَاِسحٰقَ اِلٰھاوَّاحِدًاوَنَحنُ لَه مُسلِمُون۔

(البقرہ ۲:۱۳۳)

جب انہوں نے بیٹوں سے پوچھا تم میرے (انتقال کے) بعد کس کی عبادت کروگے؟ تو انہوں نے کہا ہم آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود و یکتا ہے، اور ہم (سب) اسی کے فرماں بردار رہیں گے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

قَالَ یَا قَومِ اعبُدُواللهَ مَالَکُم مِّن اِلٰهٍ غَیرُه اَفَلَا تَتَّقُون (الاعراف ۷:۶۵)

انہوں نے کہا اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کیا کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں کیا تم پرہیزگار نہیں بنتے۔

اسی مضمون کی متعدد آیات قرآن حکیم میں موجود ہیں۔ جن سے الہ کا معنی معبود متحقق ہوتا ہے۔ اسی طرح ارشاد ربانی ہے

وَمَآ اَرسَلنَا مِن قَبلِكَ مِن رَّسُولٍ اِلا نوحِیٓ اِلَیهِ اَنَّه' لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعبُدُونِ۔ (الانبیا۲۱:۲۵)

اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر ہم اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں پس تم میری (ہی) عبادت کیا کرو۔ اس مادہ اشتقاق کی بنا پر لفظ اللہ کا معنی یہ ہوا کہ وہ اکیلی ذات جو مستحق عبادت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ اخلاص میں تمام صفات الوہیت کے بیان کو اس طرح جمع کیا گیا کہ وہ سورۃ لفظ اللہ کی مکمل تعریف بن گئی، ملاحظہ ہو۔

قُل ھُوَ اللّٰهُ اَحَد۔ اَللّٰهُ الصَّمَد۔ لَم یَلِد وَلَم یُولد۔ وَلَم یَکُن لَه کُفُوًا اَحَد۔ (الاخلاص،۱۱۲)

"آپ فرمادیں وہ اللہ ہے (جو) ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ

کسی سے پیدا ہوا۔ اور نہ اس کا کوئی جوڑ ہے۔"

دوسرا مادہ اشتقاق: اِلَہَ (تحیر و درماندگی)

انسان ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ جان سکتا ہے وہ عقل کے تحیر اور فہم و اِدراک کی درماندگی کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں تک کہ اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ معرفت الٰہی کی ابتدا بھی عجز و حیرت تھی اور انتہا بھی عجز و حیرت ہے۔

لَا تُدۡرِکُہُ الۡاَبۡصَارُ وَھُوَ یُدۡرِکُ الۡاَبۡصَارَ وَھُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ۔ (الانعام، ۶:۱۰۳)

نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ سب نگاہوں کا احاطہ کیئے ہوئے ہے۔

تَفَکَّرُوا فِی اٰلَآءِ اللّٰہِ وَلَا تَفَکَّرُوا فِی اللّٰہِ۔ (الدر المنثور، ۲:۱۱۰)

اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور و فکر کرو اور ذات باری تعالیٰ میں غور و فکر نہ کرو۔

دنیا کے تمام عرفا اور حکما اس امر پر متفق رہے ہیں کہ آگہی کی انتہا بے خبری ہے اور علم کا آخری نقطہ کمال لاعلمی ہے۔ جب چشم علم و معرفت پر تمام حجابات کے اٹھ جانے سے حقیقت ابدی منکشف ہو جاتی ہے اور عارف ذات حق کی معرفت کیلیے قدم آگے بڑھاتا ہے تو اسے اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اسے کچھ بھی معلوم نہیں اور اس لاعلمی کا علم ہی اس کیلیئے سب سے بڑا علم قرار پا جاتا ہے۔ اس ذاتِ بلند و برتر نے اپنا نام اللہ منتخب فرمایا تا کہ انسان پر یہ حقیقت واشگاف ہو جائے کہ وہ اس ہستی مطلق کی عظمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اسی کو امام رازی یوں بیان کرتے ہیں:

فَھٰھُنَا الۡعِجۡزُ عَنۡ دَرۡکِ الۡاِدۡرَاکِ اِدۡرَاکٌ۔ (التفسیر الکبیر، ۱:۱۰۶)

"پس اس مقام پر حصول ادراک میں عجز و ناکامی کا نام ہی ادراک ہے۔"

تیسرا مادہ اشتقاق: الہ (سکون پانا)

ذاتِ باری تعالیٰ کو "اللہ" اس لیے کہا جاتا ہے کہ بیتاب دلوں کو اسی سے

تسکین ملتی ہے۔ اہلِ ایمان وہ ہیں جو اپنا رشتہ محبت اس محبوب حقیقی سے استوار کر لیتے ہیں۔ قرآن اہلِ ایمان کی اسی حالت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جب باری تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے تا اہلِ ایمان کے دل پگھلنے لگتے ہیں۔ کیونکہ جوں جوں حب الٰہی عشق میں بدلتی جاتی ہے، ایمان کمال کو پہنچتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِينَ اٰمَنُوٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ (البقرہ، ۲:۱۶۵)

اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ (ہر ایک سے بڑھ کر) اللہ سے بہت ہی زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اسی ٹوٹ کر محبت کرنے کو ہی عشق کہتے ہیں۔ چنانچہ لفظ اللہ ذات باری سے انسان کے محبت کرنے اور اسی سے سکون قلب پانے پر دلالت کرتا ہے۔

وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا۔ (الفرقان، ۲۵:۶۴)

اور (یہ) وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے لئے سجدہ ریزی اور قیام (نیاز) میں راتیں بسر کرتےہیں۔ اور یہ وہ لوگ جو ساری رات اپنے رب کے لئے سجود و قیام میں گزار دیتے ہیں۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ۔ (الذاریات، ۵۱:۱۸)

اور وہ پچھلی رات (اٹھ اٹھ کر) استغفار کرتے ہیں۔

چوتھا مادہ اشتقاق: الولہ (عقل کا گم ہونا)

عقل حقیقتِ ابدی کو نہیں پا سکتی، عقل کے سفر میں اتنے مراحل اس لیے آئے کہ وہ اقدام وخطا (Trial and Error) کے طریق پر گامزن تھی۔ اگر وہ شروع سے آستانِ مذہب پر سرِ تسلیم خم کر لیتی تو اسے اتنے جتن نہ کرنے پڑتے۔ عقل کا خود ناظر کی تلاش میں مصروف ہو جانا دراصل معرفت نفس کی سعی ہے اور یہ بھی ذریعہ وجدان کے بغیر ممکن نہیں۔ تلاش کے لئے دو تو عالم تھے۔ عالم آفاق اور عالم انفس جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىٓ اَنْفُسِهِمْ ۔ (حم سجدہ،۴۱:۵۳)

''ہم تمھیں اپنی نشانیاں انفس وآفاق کے دونوں عالموں میں دکھادیں گے۔''

پانچواں مادہ اشتقاق: لاۃ (بلندی وارتفاع)

امام رازی فرماتے ہیں کہ الہ اور اللہ کا مشتق منہ ''لاۃ'' ہے۔ جس کا معنی بلند ہونا ہے۔ چنانچہ اس لفظ کی معنوی دلالت یہ ہوئی کہ وہ ذات جو ہر عجز اور کمزوری سے بلند ہو، جو ہر نقص اور حرمان سے بلند ہو۔ جو ہر عیب وخطا سے بلند ہو۔ جو ہر ضرورت واحتیاج سے بلند ہو۔ جو ہر مناسبت ومماثلت سے بلند ہو۔ جو ہر ایک کے کفر وشرک سے بلند ہو۔ جو انسانوں کے ظلم و معصیت سے بلند ہو جو انسانی وہم وگمان سے بلند ہو۔ جو ممکنات ومحدثات سے بلند ہو۔ جو ہر مخلوق کی قوت ادراک سے بلند ہو۔ اور جو ہر ایک کی طاقت توصیف سے بھی بلند ہو۔ ارشادِ باری تعالی ہے:

انا مکون المکان ولیس لی مکان سوی الانسان (الرسالۃ غوث اعظم)

''میں مکان کو پیدا کرنے والا ہوں اور سوائے انسان کے میرا کوئی مکان نہیں ہے۔''

اس کی تائید اس حدیث قدسی سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا:

لا یسعنی ارضی ولا سائی ولکن یسعنی قلب عبدی المؤمن ۔ (الحدیث)

''مجھے زمین اور آسمان کی وسعتیں اپنے اندر نہیں سمو سکتیں لیکن میں اپنے بندہ مومن کے دل میں سما جاتا ہوں۔''

چھٹا مادہ اشتقاق: لاہ یلوہ (مخفی ہونا)

گویا وہی ذات عیاں بھی ہے اور نہاں بھی۔ ظہور واحتجاب (اجاگر ہونا اور مخفی ہونا) دونوں شانوں کا بیک وقت ایک ہی ذات میں موجود ہونا ہے۔ ذات باری کے مخفی ہونے کا ایک مفہوم یہ ہے کہ وہ اس قدر قریب ہے کہ قابل ادراک نہیں۔ کسی چیز کو دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ درمیان میں

مناسب فاصلہ ہو۔ اگر ناظر و منظور دونوں میں اتنا قرب ہو کہ نقطہ بھر بھی فاصلہ اور دوری باقی نہ رہے تو منظور مخفی ہی رہتا ہے اسے دیکھا نہیں جاسکتا۔ جیسے پتلی آنکھ کے اندر ہو کر بھی آنکھ سے مخفی ہے۔ اسی طرح ذات حق انسان کے باطن میں سما کر بھی اس سے مخفی رہتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا سَا لَكَ عِبَا دِى عَنِّى فَاِنِى قَرِيبٌ ۔ (البقرہ۲:۱۸۶)

اور (اے حبیب)! جب میرے بندے آپ سے میری نسبت سوال کریں تو) بتا دیا کریں کہ (میں نزدیک ہوں۔)

ایک اور مقام پر اس قرب کی نوعیت بھی بیان کی گئی ہے۔

وَنَحنُ اَقرَبُ اِلَيهِ مِن حَبلِ الوَرِيدِ ۔ (ق۵۰:۱۶)

اور ہم اس سے دل کی رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

وہ ذات خود مخفی ہے، لیکن ہر شے میں اپنی قدرت کو ظاہر کرنے والی ہے۔ اس کی مثال روح کی سی ہے، جو خود مخفی رہتی ہے مگر اپنے تصرفات کو جسم کے ذریعے ظاہر کرتی ہے۔ جسم درحقیقت مردہ و بے جان ہوتا ہے لیکن روح کا محکوم۔

ساتواں مادہ اشتقاق: الہ (جھکنا، راغب ہونا اور رجوع کرنا)

''انسان'' کے بارے میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ''انس'' سے ماخوذ ہے اور دوسرے یہ کہ ''نسیان'' سے۔ پہلے مادے کے اعتبار سے اس کا معنی ہوا ''مانوس ہونے والا'' جب کہ دوسرے مادے کے اعتبار سے اس کا معنی ہوا'' ''بھولنے والا''۔ انس سبب ہے اور نسیان اس کا نتیجہ ۔ جب انسان کسی سے مانوس ہوتا ہے اور محبت کرنے لگتا ہے تو رفتہ رفتہ وہ محبوب کے ماسوا کو بھولتا جاتا ہے، جب انس و محبت کمال کو پہنچتے ہیں تو وہ محبوب کے علاوہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے اپنی بھی ہوش اور خبر باقی نہیں رہتی۔

آٹھواں مادہ اشتقاق: الہ (پناہ دینا)

چنانچہ لفظ ''اللہ'' کی معنوی افادیت یہ ہوئی کہ وہ ذات جو سب کچھ عطا کرے لیکن خود کچھ نہ لے۔ اسی لئے وہ خود کو الصمد (بے نیاز) کہتا ہے۔ یہاں یہ گمان نہیں ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالی انسانوں سے عبادت کا طلب گار ہے۔ نہیں نہیں۔ عبادت اس کی نہ ضرورت ہے اور نہ اجرت، بلکہ عبادت دراصل خشوع وخضوع، تذلل انکساری اور عاجزی کی انتہائی صورت کا نام ہے۔ اس لئے اس کے ذریعے اللہ تعالی انسان کو سائل بننے کا سلیقہ سکھاتے ہیں، تاکہ اس کی بارگاہ صمدیت سے کچھ مانگنے کا ڈھنگ آجائے اور وہ ذات اپنے بندے کی عاجزی دیکھ کر اسے مزید لطف وکرم سے نوازے۔ (تفسیر منہاج القرآن جز اول صفحہ ۱۳۵)

الرَّحمٰنِ الرَّحیم:

رحمٰن اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں کہا جا سکتا۔ قرآن حکیم نے الرحمٰن کو اصطلاحا باری تعالی کی شان الوہیت کو نمایاں کرنے کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ سورۃ مریم میں کم وبیش 17 مرتبہ 'الرحمٰن' کا لفظ باری تعالی کی الوہیت، خلاقیت اور ربوبیت کے اظہار کے لئے استعمال ہوا ہے۔ 'الرحیم' کے معنی بہت رحم فرمانے والا۔ یہ 'رحمت' سے 'فَعِیلٌ' کے وزن پر اسم فاعل ہے۔ جس طرح نبوت تمام انبیا کی مشترک صفت ہے۔ لیکن ختم نبوت صرف حضور ﷺ کا خاصہ ہے۔ رحمٰن خاص ہے اور رحیم عام۔ خلاصہ بحث یہ ہوا کہ الرحمٰن خاصہ الٰہی ہے، باری تعالی کے سوا کسی اور کو رحمٰن نہیں کہا جا سکتا۔ جبکہ الرحیم محض صفت الٰہی ہے۔ اس کا اطلاق دوسروں کے لئے بھی جائز ہے۔

الرحمٰن: رحمتِ حق کا صفتی ظہور

الرحیم: رحمتِ حق کا فعلی ظہور

'کریم' اسے کہا جاتا جس سے سخاوت اور جودوکرم کا صدور ہو رہا ہو، ''علیم'' اسے کہا جاتا ہے جس سے علم ومعرفت کا فعلی ظہور ہو رہا ہو۔ حکیم اسے کہا جاتا ہے، جس کے ہر کام سے حکمت ودانائی کا

صدور ہو رہا ہو۔ عظیم اسے کہا جاتا ہے، جس سے عظمت و بزرگی کا صدور ہو رہا ہو۔ اسی طرح الرحیم کا معنی یہ ہوگا کہ وہ ذات جس میں رحمت کا صرف صفتی ظہور ہی نہیں بلکہ فعلی ظہور بھی ہے۔ اس میں رحمت فراوانی کے ساتھ گویا الرحمٰن ذات حق کے رحمت ہونے کا دلیل تھا۔ 'الرحیم' اس کے رحمت صادر کرنے کی دلیل بن گیا۔ 'الرحمٰن' سے رحمت کا ظہور تھا۔ الرحیم سے رحمت کا صدور ثابت ہو گیا۔ اسی وجہ سے 'الرحیم، الرحمٰن کے مقابلے میں بالالتزام اہل ایمان اور صالحین کو رحمت سے نوازنے کی صفت کو ظاہر کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا۔ (الاحزاب، ۳۳:۴۳)

'اور وہ مومنوں کے لئے رحیم ہے۔'

مگر الرحیم سے رحمت حق کا جو پہلو نمایاں ہوتا ہے وہ بالخصوص توبہ و مغفرت سے متعلق ہے۔ رحمت درحقیقت اس کائنات کی ضرورت ہے۔ ضرورت کے تین درجے ہیں اور ہر درجے کی حیثیت کے مطابق رحمت بھی تین طرح کی ہے۔

پہلا درجہ۔۔۔۔ایجاد۔۔۔۔کسی شے کو معرض وجود میں لانا۔

دوسرا درجہ۔۔۔۔ابقا۔۔۔۔وجود میں لانے کے بعد اسے باقی رکھنا۔

تیسرا درجہ۔۔۔۔اکمال۔۔۔۔وجود کو باقی رکھ کر اسے نقطہ کمال تک پہنچانا۔

ہر ایک شے کو اس غرض سے پیدا کیا گیا کہ وہ انسانی بقا کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مصروف رہے۔ اس کی شان رحمانیت کا پرتو ہر ایک ذرے میں دکھائی دے رہا ہے۔ بقا تو محض اس لئے مطلوب ہوتی ہے کہ کمال حاصل ہو۔ وجود کو اپنی تکمیل کے لئے بقا کی ضرورت ہے۔ یہ شان 'الرحمٰن' کی تھی۔ لیکن 'الرحیم' رحمت کے اس پہلو کا آئینہ دار ہے جو بخشش و مغفرت کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یعنی کسی کو وجود و بقا اور کمال سے ہمکنار کرنا رحمانیت کا کام تھا۔ مگر کسی وجود کو اپنی بقا کے خلاف کارگزاریوں پر معاف کر دینا اور اس کے باوجود اسے باقی رکھنا رحیمیت کا کام ہے۔

الرحیم: آخرت کی رحمت کا آئینہ دار ہے

الرحمٰن: دنیا کی رحمت کا آئینہ دار ہے

آخرت میں حص رحمت پانے کے اعتبار سے اللہ تعالی کے ایماندار بندے خصوصیت کے ساتھ مستحق ہوں گے۔لہذا 'الرحمٰن' کا اسم صفت ہر مومن و کافر کو اس حیاتِ دنیوی میں رحمتِ ایزدی کا مژدہ جانفزا سنا رہا ہے۔اور 'الرحیم' کا اسمِ صفت آخرت میں مومنین کو رحمت خداوندی کی خوشخبری سنا رہا ہے۔قرآن پاک میں ارشاد ہے:

اللہ تعالی سے اگر سوال نہ کیا جائے تو وہ ناراض ہو جاتا ہے اور اگر بنی آدم سے سوال کیا جائے تو وہ ناراض ہو جاتا ہے۔

رحمٰن و رحیم دونوں کو اکٹھا بیان کرنے کا پہلا مقصد یہ تھا کہ یہ حقیقت واشگاف ہو جائے کہ ذات حق میں رحمت کا صرف صفتی ظہور ہی نہیں بلکہ فعلی ظہور بھی ہے۔ ہر چند کہ رحمان 'رحیم' کے مقابلے میں زیادہ معنی رحمت پر دلالت کرتا ہے۔اس کی رحمت خلوص نیت کے ساتھ معافی مانگنے والے گناہگار کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ پرہیز گاروں کے مقابلے میں زیادہ ضرورت مند ہوتا ہے۔ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: عبادت کرنے والے جنت کو یاد کرتے ہیں اور گنہگار رب کی رحمت کو یاد کرتے ہیں۔آخرت میں جب لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ (المومن، ۴۰:۱۶) "کہ آج کس کی بادشاہی ہے۔اللہ کی جو ایک ہی قہر والا ہے" کا اعلان ہوگا تو ہم کہاں جائیں گے۔کیونکہ رحمتِ حق کے بغیر تو کسی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوگا۔چنانچہ شانِ رحیمیت نے انسانوں کو اس مایوسی سے بچالیا کہ تم خود کو آخرت کے لئے تیار کرو رحمتِ حق وہاں بھی تمہارا ساتھ نہ چھوڑے گی۔کیونکہ ربِ ذوالجلال صرف رحمٰن الدنیا ہی نہیں رحیم الآخرۃ بھی ہے۔

(تفسیر منہاج القرآن جز اول صفحہ ۱۵۸)

رحمت عام طور پر مہربانی کو کہتے ہیں، لیکن اس کا اصل معنی بھلائی اور احسان کے لئے کسی کی طرف دل کا جھکنا اور نرم ہونا ہے۔آئمہ لغت اور علما و محققین نے اس کا معنی یوں بیان کیا ہے:

الرحمة رقة تقتضی الاحسان ال المرحوم۔ (المفردات:۳۴۷)

’رحمت دل کی ایسی رقت اور نرمی کو کہتے ہیں جو کسی پر احسان کا تقاضا کرے۔‘

قاضی بیضاوی اسی معنی کو ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔

الرحمة رقة القلب و انعطاف یقتضی التفضل والاحسان۔

(تفسیر البیضاوی ۱:۵)

’’رحمت در حقیقت اس کیفیت کا نام ہے جو دل پر رقت اور نرمی کی صورت میں پیدا ہوتی ہے‘‘۔اور کسی مستحق کی طرف بھلائی اور احسان کے ساتھ پیش آنے کا تقاضا کرتی ہے۔خلاص کلام یہ ہوا کہ رحمت دو اجزا پر مشتمل ہے۔ایک دل کی نرمی و رقت اور فضل واحسان۔قلبی کیفیت کا نام جو بالآخر احسان پر منتج ہوتی ہے رحمت ہے۔لہذا ذاتِ حق کی رحمت سے مراد فضل واحسان کے ساتھ کسی کی طرف اللہ تعالی کا متوجہ ہونا ہوگا۔مخلوقات عالم پر محض فضل واحسان کے ارادے سے متوجہ ہونا باری تعالی کی رحمانیت ورحیمیت ہے۔اور رقتِ قلب کے ساتھ کسی پر احسان کے ادارے سے متوجہ ہونا انسانوں کی رحیمیت ہے۔

رحمتِ حق کا حقیقی تصور:

عالمِ ہستی میں ظہور پذیر ہونے والے احوال و واقعات کا کوئی پہلو بھی ایسا نہیں جو در حقیقت رحمتِ حق پر دلالت نہ کرتا ہو۔یہی وجہ ہے کہ خالقِ کائنات نے اپنی ذات کی نسبت واضح طور پر لزومِ رحمت کا حکم صادر فرمایا:

کَتَبَ عَلٰی نَفسِهِ الرَّحمة ۔ (الانعام،۶:۱۲)

اس نے اپنی ذات پر رحمت لازم فرمالی ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

فَقُل سَلَامٌ عَلَیکُم کَتَبَ رَبُّکُم عَلٰی نَفسِهِ الرَّحمة ۔ (الانعام،۶:۵۴)

آپ (ان سے شفقتاً) فرمائیں کہ تم پر سلام ہو تمہارے رب نے اپنی ذات (کے ذمہ کرم) پر رحمت لازم کرلی ہے۔

اس لحاظ سے کائناتِ ہست و بود پر نظر ڈالی جائے تو رحمتِ الٰہی کی دو صورتیں نظر آتی ہیں: حسی رحمت اور معنوی رحمت جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

وَاَسبَغ عَلَيكُم نِعَمَه' ظَاهِرَةً وَبَاطِنَة۔(لقمان،۳۱:۲۰)

'اور اللہ نے تم پر حسی و ظاہری طور پر بھی اور معنوی و باطنی طور پر بھی اپنی نعمتیں پوری کر دیں'

رحمتِ حق کی حسی صورت:

اس سے مراد حیاتِ انسانی کے وہ اوصاف و احوال ہیں جو ظاہراً اور شکلاً ہر ایک کو رحمت معلوم ہوتے ہیں۔ یہ باری تعالیٰ کے وہ ظاہری انعامات و احسانات ہیں جن کا کوئی بھی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ اس نے انسان کو سب سے پہلے متوازن اور معتدل اعضا پر مشتمل ایک ایسا خوبصورت وجود بخشا جسے تمام حسی مخلوقات پر فوقیت حاصل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

لقد خلقنا الاِنسان فِی احسنِ تقوِیم۔(التین،۹۵:۴)

بے شک ہم نے انسان کو اچھی صورت پر بنایا۔

یہی وجہ ہے کہ انسان دیگر جاندار مخلوقات کو دیکھ کر احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوتا۔ اسے اپنے برتر ہونے کا بخوبی علم ہے۔

رحمتِ حق کی معنوی صورت:

زندگی کی تکلیفیں بھی اس کی رحمت کی معنوی صورتیں قرار دی گئی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کارگاہ حیات میں کوئی بھی شئے زحمت نہیں۔ یہ تکلیفیں ہی ہیں جو حیات انسانی کو لذت آشنا کر دیتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بے مقصدیت اور جمود و تعطل زندگی میں کوئی لطف باقی نہیں رہنے دیتے۔ اصل لطف کسی لذت کو پانے کی آرزو اور اس کی کوشش میں ہے۔ اس لئے

راحتیں حسی رحمت اور تکلیفیں معنوی رحمت ۔ تا کہ انسان کو نعمت بھی ملے اور اس کا صحیح لطف و لذت بھی ملے۔

ارشادِ باری تعالی ہے:

فَاِنَّ مَعَ العُسرِ یُسرًا ۔ اِنَّ مَعَ العُسرِ یُسرًا ۔ (الانشراح،۹۴: ۵۔۶)

یقیناً تکلیف کے ساتھ راحت ہے۔ یقیناً تکلیف کے ساتھ راحت ہے۔

رحمت کا صدور ضرورت کی بنیاد پر ہوتا ہے اور کسی کا تکلیف میں مبتلا ہونا رحمت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ دریائے رحمت کسی کو غمزدہ اور گرفتار مصیبت دیکھ کر اتنا جوش میں آتا ہے کہ اس کی بہتری اور بھلائی کی ہزاروں نئی صورتیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ کسی پریشان حال کے رونے کو مسکراہٹ میں بدل کر ذات رحمٰن ورحیم کو اتنی مسرت ہوتی ہے کہ شاید اس قدر کسی اور پر رحم کرنے سے نہیں۔ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی اپنے مکشوفات میں بیان فرماتے ہیں کہ:

قلت یا رب ای ضحك افضل عندك قال ضحك الباکین ۔

(الرسالۃ غوث الاعظم،۷)

میں نے عرض کیا اے پروردگار ! کونسی ہنسی تیرے نزدیک اچھی ہے اللہ نے فرمایا۔ رونے والوں کی ہنسی۔

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

جعلت الفقر والفاقة مطیة الانسان فمن رکبها فقد بلغ المنزل قبل ان یقطع البوادی ۔ (الرسالۃ غوث الاعظیم: ۴۰)

میں نے فقر وفاقہ کو انسان کے لئے بہترین سواری بنایا ہے۔ جو کوئی اس پر سوار ہو گیا وہ راستے طے کئے بغیر منزل تک پہنچ گیا۔ لہذا وہ حالت جو خود رحمت الٰہی کا استحقاق پیدا کر دے، بندے کے حق میں زحمت نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح حیاتِ انسانی میں پیش آنے والے مصائب وآلام رب العالمین

کی شان ربوبیت ہی کا ایک پہلو ہیں۔

تسمیہ کی عملی حکمت وافادیت:

مطالعہ قرآن سے متعلق دو اہم امور ہیں ایک یہ کہ قرآن تمام نوعِ انسانی کی فکری اور عملی ہر دو طرح کی اصلاح کے لئے نازل ہوا ہے۔ اسی امر کا دوسرا پہلو بھی ملحوظ رہے کہ قرآن کا مقصد انسانی سیرت و کردار کی اصلاح اور عملی رہنمائی کے ساتھ ساتھ فکری اور نظریاتی اصلاح بھی ہے۔ تسمیہ انسان کی انفرادی اور معاشی زندگی کے تمام امور میں اسلام کا رنگ نمایاں کرنا چاہتی ہے، یہی روح دین ہے۔ آنحضرت ﷺ نے تاکید و تکرار کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ ہر کام کا آغاز بسم اللہ سے ہونا چاہئے بلکہ جو کام بسم اللہ کے بغیر شروع کیا جائے وہ ناتمام رہتا ہے یعنی برکت وفضیات سے خالی ہوتا ہے۔ گویا تسمیہ کی دوسری عملی حکمت وافادیت یہ ہے کہ یہ ایک مسلمان کے لئے ذات حق سے وفاداری اور اس کی غلامی کا ایسا قلادہ ہے، جس کے ذریعے وہ قدم قدم پر پہچانا جاتا ہے۔

ترکِ تکبر کی تعلیم کے ذریعے انسان کو جملہ امور حیات میں غرور اور فخر ومباہات کا انداز ترک کر دینے کی تعلیم دی گئی ہے۔ ترکِ تکبر کے بعد تسمیہ انسان کو کامل بندگی کے آداب بھی سکھاتا ہے اور آداب بندگی میں سب سے بنیادی ادب مقامِ شکر ہے۔ شکر کسی کی نعمت واحسان پر اس کی تعریف و توصیف کو کہتے ہیں۔ قدرتِ فعل اور توفیقِ کمال تو ہر ایک کو بارگا الوہیت سے ہی نصیب ہوتی ہے۔ لیکن جوں جوں مقامِ ولایت بلند ہوتا چلا جاتا ہے، ادراکِ حقیقت کی استعداد بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

فرمایا کہ 'قم باذنی' قربِ نوافل ہے مرتب الوہیت میں کہ عروج میں پیش آتا ہے، جیسا کہ شمس تبریز بر گزرا اور 'قم باذن اللہ' قربِ فرائض ہے اور یہ نزول بعد العروج میں پیش آتا ہے، جیسا کہ حضرت عیسی اس مرتبہ میں تھے اور یہ مرتبہ اعلی ہے اول سے، شرک وکفر کہنا اس کو بھی جہل ہے۔

(امدادالمشتاق: ۷۱)

قولہ 'قم باذنی' قربِ نوافل ہے۔ اقول جس کی تعبیر اصطلاحی اس عنوان سے کرتے ہیں کہ عبد فاعل ہو اور حق تعالیٰ اِلٰہ اور قربِ فرائض کو اس عنوان سے تعبیر کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ فاعل ہو اور عبد الٰہ اور یہ اول سے اعلیٰ ہے، سو! قم باذنی میں احیا کی اِسناد عبد کی طرف ہے اور باذن اللہ میں حق کی طرف۔ (امداد المشتاق:۱۷)

تسمیہ اور مقامِ تکوین:

قال اللہ تعالیٰ فی بعض کتبہ یا ابن آدم انا اللہ الذی لا الہ الا انا قول للشیء کن فیکون وقد فعل بکثیر من انبیاہ واولیا وخواصہ من بنی آدم۔ (فتوح الغیب، مقالہ:۱۶)

اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض کتابوں میں فرمایا ہے۔ اے ابن آدم میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں جب کسی چیز کو 'کن' کہتا ہوں تو وہ ہو جاتی ہے، تو میری اطاعت کر، میں تجھے بھی یہ مقام عطا کر دوں گا کہ جب تو کسی چیز کو 'کن' کہے گا تو وہ ہو جائے گی اور بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیا و اولیا اور خواص بنی آدم میں سے کافی لوگوں کو یہ مقام عطا کیا ہے۔

اس موضوع کی تفصیلات سے آگاہ ہونے کے لئے امام نبہانیؒ کی 'کتاب جامع کرامات الاولیاء' یا مولانا اشرف علی تھانویؒ کی 'کتاب جمال الاولیاء' کا مطالعہ فرمائیں۔ انہوں نے اس امر کی تائید میں متعدد دلائل و شہادات فراہم کی ہیں۔ عظیم محدث وفقیہ امام عبدالوہاب شعرانی اس کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

(فاِن قیل) فاِذَا عطی الحق تعالیٰ بعض خواصہ فی ھذہ الدار حرف کن ھل یتصرف بھا م الادب تر کہ (فالجواب) کما قالہ الشیخ فی الباب السابع والسبعین و ما ئۃ ان من ادب اھل اللہ تعالیٰ اِذا عطاھم اللہ تعالیٰ التصرف بلفظۃ کن فی ھذہ الدار لا یتصر فون بھا لاٰن محلھا الدار الآخرۃ ولکنھم جعلوا مکان

لفظة کن بسم اللّٰہ لیکون التکوین اللّٰہ تعالٰی ظاھرًا کماھولہ تعالٰی باطنًا۔ (الیواقیت والجواہر،۱:۱۴۷)

(اگر یہ کہا جائے) کہ جب اللہ تعالیٰ اس دنیا میں اپنے بعض خواص کو حرف کن عطا کرتے ہیں تو کیا وہ اس سے تصرف بھی کرتے ہیں یا ادباً ترک کر دیتے ہیں؟ (پس اس کا جواب یہ ہے) جیسا کہ شیخ نے باب ۷۷ا میں بیان فرمایا ہے کہ بے شک اہل اللہ کا ادب یہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ انہیں لفظ کن کا تصرف عطا فرما دیں تو وہ اس تصرف کو استعمال میں نہیں لاتے کیونکہ اس کا مقام دار آخرت ہے۔ لیکن وہ تصرفات میں بجائے لفظ کن کہنے کے بسم اللہ کہہ لیتے ہیں تا کہ تکوین کی نسبت ظاہرا بھی اللہ کی طرف ہو جائے جیسے کہ باطنا ہے۔

یہ وہ مقامِ بندگی ہے جہاں بندے کی ہر آرزو اور اس کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کا پورا کرنا خود غیرتِ الہیہ اور باری تعالیٰ کی شان محبیت کا تقاضا بن جاتا ہے، کیونکہ بندہ محبوب بن جائے تو پھر وہ منتظر ہی نہیں منتظر بھی ہو جاتا ہے۔

حضرت ابوھریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کتنے منتشر بالوں والے بندگانِ خدا ایسے ہیں جنہیں دروازوں سے دھتکار دیا جاتا ہے لیکن ان کا مقام یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی معاملے میں اللہ کی قسم کھالیں تو غیرتِ خداوندی ان کی قسم بہر صورت پوری کر کے رہتی ہے۔ لیکن تسمیہ ایسا ادبِ بندگی ہے کہ اس مقام پر جہاں بندہ خود مطلوب و مقصود بن جاتا ہے، پہنچ کر بھی نظر انداز ہوتا کہ جملہ مقامات بندگی بھی تو اسی ادب و قرینہ کے باعث نصیب ہوتے ہیں۔

تسمیہ کی عملی حکمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب انسان اپنے ہر کام کے آغاز میں اپنے خالق و مالک کا نام لے تو اس سے اسے تین فوائد حاصل ہوں:

☆ ایک اس کے دل و دماغ میں باری تعالیٰ کی معیت اور رفاقت و مصاحبت کا احساس پیدا ہو۔

☆ دوسرا اس کام کی تکمیل میں اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے شاملِ حال ہونے کا اعتماد پیدا ہو۔

☆ تیسرے اس کے نام کی برکت سے مطلوبہ امر میں کامیابی و کامرانی کا پختہ یقین ہو جائے۔

چنانچہ تسمیہ انسان کے لئے اس حقیقی توحید اور کامل توکل کی تعلیم ہے کہ جب خدا کی مصاحبت واعانت اس کے ساتھ ہے تو دنیا کی کوئی طاقت بھی اسے نیک عزائم میں کامیاب ہونے سے روک نہیں سکتی۔ شارع نے فرمایا بسم اللہ صرف جائز کاموں پر پڑھی جائے ناجائز کاموں پر نہیں۔ تسمیہ کی برکت وفضیلت کا احساس دل میں جاگزیں ہو جائے تو انسانی زندگی کے جملہ احوال ازخود اصلاح پذیر ہو جاتے ہیں۔ کلمات تسمیہ اسم الٰہی سے شروع ہوتے ہیں اور پھر اسم کی اضافت، لفظ اللہ، الرحمٰن اور الرحیم تینوں کی طرف ہے، جیسا کہ پہلے بڑی شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے کہ اللہ باری تعالیٰ کا اسم ذات ہے اور الرحمٰن اور الرحیم اسمائے صفات۔ اسم چونکہ ذات وصفات کا مظہر ہوتا ہے یعنی نام کے بغیر کوئی ذات پہچانی جاسکتی ہے اور نہ اس کی ذات، اس لئے باری تعالیٰ نے اپنی ذات وصفات دونوں کے بیان سے پہلے اسم کا ذکر کر دیا۔

قرآن کا کوئی مقام ایسا نہیں جہاں مظاہرِ قدرت میں غور وفکر کی نصیحت نہ کی گئی ہو۔ اور اگر ان میں غور وفکر کی تلقین ان کی معرفت کی غرض سے ہے تو کیا ان مظاہر و مناظر کی معرفت مقصود بالذات ہے یا ان کی معرفت کے ذریعے کسی اور حقیقت کی تلاش ہو رہی ہے؟ اگر ان مظاہر قدرت کی معرفت کو مقصود بالذات سمجھ لیا جائے تو یہ غلط ہوگا۔ کیونکہ یہ تو خود بھی موجود بالذات نہیں ہیں۔ یہ اپنے ہونے، باقی رہنے اور کمال کو پہنچنے میں کسی اعلیٰ ہستی کے محتاج ہیں۔ لہٰذا قرآن کا بار بار مظاہرِ کائنات کی معرفت کے لئے انسان کو متوجہ کرنا اسی غرض سے ہے کہ ان کے ذریعے انسان کو خدا کی ہستی وصفات کی معرفت حاصل ہو۔ چنانچہ تسمیہ میں اسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے الفاظ وارد کرنے کا مقصد یہی تھا کہ اس اسلوب بیان کے ذریعے انسانوں کو یہ تعلیم دی جائے کہ باری تعالیٰ کی ذاتی اور صفاتی معرفت کے حصول کے لئے اس کے مظاہر کی معرفت حاصل کی جائے۔

تسمیہ کا حرف با مصاحبت، استعانت یا تبرک کے معنی کے لئے وارد ہوا ہے۔ یہ علم ہو جائے کہ جس طرح ذات وصفات باری تعالیٰ تک رسائی اور ان سے استعانت و مصاحبت اس کے اسما کے ذریعے سے ممکن ہے، اسی طرح اس دنیا کی زندگی بھی، جو لاکھوں مقاصد ومطالب کے حصول پر منحصر ہے۔ان اصطلاحات کی وضاحت ہماری کتاب سیرۃ الرسول (جلد نہم)(میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں) لیکن ان سب امور میں جو بنیادی نکتہ مشترک طور پر کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب امور مادی اسباب وعلل اور عادت ومعمول کے خلاف ظہور پذیر ہوتے ہیں، اس لئے عقل عادی ان کے وقوع کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ ان کے صدور وظہور کو آپ قدرت الٰہیہ کا نام دیں، تصرفات نبوت کا، تصرفات ولایت کا نام دیں یا مطلق تصرفات روح کا، بہر صورت جو کچھ کہیں وہ صدور غیر مادی اور روحانی اسباب ہی کے حوالے سے تصور ہوگا۔ عقل جس کا تمام تر انحصار ظاہری حواس پر ہے، ان کے ادراک اور شعور کامل سے محروم رہتی ہے۔ خدا کے نام کا واسطہ ایک روحانی اور غیر مادی واسطہ اور ذریعہ ہے، لہذا اس سے استعانت واستمداد کی تلقین عونِ الٰہی کے روحانی مظاہر کے ذرائع کی اہمیت کو واضح کر رہی ہے۔

اسمائے اِلٰہیہ کے ذکر کی تلقین

تسمیہ نے بھی انسانی روح کی تسکین اور اس کی ضرورتوں کی تعمیل کے لئے اسمائے الٰہیہ کے ذکر کی تلقین کی ہے۔ وہ اسمائے مبارکہ اللہ، الرحمٰن اور الرحیم ہیں۔ اسی طرح الرحمٰن اور الرحیم کے اسمائے مبارکہ کا ذکر روح انسانی کو صفت رحمت کی فراوانی عطا کرتا ہے۔ باری تعالیٰ کے اسمائے مبارکہ پر مشتمل تسمیہ کے ہر کام سے پہلے پڑھے جانے کا حکم اس کے بکثرت ذکر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ انسان تسمیہ کا ذکر جس قدر کثرت کے ساتھ کرے گا، اس کی شخصیت اسی قدر صفات استغنا ورحمت سے مزین ہوگی۔ لیکن یہ ذکر محض حلق کی حد تک نہیں دل کی گہرائیوں سے ہونا چاہئے۔

رحمتِ حق سے مایوسی کی ممانعت

تسمیہ میں باری تعالی کی صفت رحمت کو رحمٰن و رحیم دو اعلام کے ذریعے ظاہر کرنا اس عملی حکمت پر دلالت کرتا ہے کہ انسان کسی حال میں بھی اللہ تعالی کی رحمت سے مایوس نہ ہونے پائے۔

خلق خدا سے حسنِ سلوک کی تعلیم

آیت بسم اللہ انسانوں کو یہ پیغام بھی دیتی ہے کہ وہ خود کو تسمیہ کے رنگ میں مکمل طور پر رنگ لیں۔ ذاتِ حق کی صفتِ رحمت کے دو عنوان رحمانیت اور رحیمیت ہیں، جس میں رحمانیتِ الٰہی ہر مومن و کافر پر یکساں عنایات کی پیغامبر ہے اور رحیمیت بالخصوص مومنین پر۔ تسمیہ میں بیان ہونے والے دونوں اوصاف انسان کو اپنے پرائے کا امتیاز مٹا کر سب کے لئے یکساں دردمند عطا کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ سے روایت ہے کہ:

الخلق عيال الله فأحب الخلق اِلى الله من أحسن ا لى عياله۔ (شعب الایمان، ۶:۴۴، رقم: ۷۴۴۸)

مخلوق، اللہ تعالی کا کنبہ ہے پس اللہ کو مخلوق میں سے وہ شخص بہت زیادہ محبوب ہے جو اس کے کنبے سے اچھا سلوک کرے۔

اسی طرح حضرت انس سے ایک حدیث مروی ہے:

من قضى لأحد من أمتى حاجة يريد أن يسره بها فقد سرنى و من سر نى فقد سر الله ومن سر الله أدخله الله الضنة ۔

(شعیب الایمان، ۶:۵، رقم: ۷۶۵۳)

جس نے میری امت میں سے کسی کی بھی کوئی حاجت روائی کی) یعنی اسے تکلیف سے نجات دی۔

اسے مسرت وسکون مہیا کرنے کے لئے ،تو اس نے بے شک مجھے خوشی پہنچائی اور جس نے مجھے خوش کیا اس نے اللہ کو خوش کیا اور جس نے اللہ کو خوش کیا اسے اللہ تعالی جنت میں داخل فرمائے گا۔

یہاں سے مطلقاً یہ ثابت ہو گیا کہ ضرورت مندوں کی ضرورت کا پورا کرنا، پریشان حال لوگوں کی پریشانی کو دور کرنا، شکستہ دل، دکھی اور مظلوم انسانیت کی خدمت کرنا عین اسلام اور بارگاہ خداوندی میں قرب ومقبولیت کی علامت ہے۔ مستزاد یہ کہ اسلام میں تو شرطِ ایمان ہی دوسروں کے لئے دل سوزی، ہمدردی اور نفع بخشی ہے۔

الغرض ہم رحمت ورفت کا پیکر بنے کی بجائے مکر وشقاوت کا مجسمہ بن گئے ہیں۔اسی وجہ سے ہم میں سے ہرایک پریشان ہے کہ وہ ظالم بھی ہے اور مظلوم بھی ۔ چنانچہ بسم اللہ کا فلسفہ اور عملی حکمت وافادیت یہی ہے کہ ہم رحمٰن ورحیم کی صفاتی تجلیات سے خود کو آراستہ کر کے اپنے پرائے سب کے لئے پیغام رحمت بن جائیں اور کوئی شخص سچ میں زیادتی بھی کرے تو اس کا بدلہ عفو ودرگزر سے دیں۔

قدرتِ الٰہیہ کو محیطِ کل سمجھنے کی تلقین

الرحمٰن سے دنیا میں اس کی بے پایاں رحمت کا ظہور ہوتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ تمام موجودات والم اسی کے فیضان قدرت سے قائم ودائم ہیں۔الرحیم سے آخرت میں اس کی عنایات وانعامات کا ظہور ہوتا اور یہ پتہ ہے کہ ہر ایک کا حسن انجام اسی لطف وکرم پر منحصر ہے۔ لہذا انسان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے کہ تیری ساری زندگی اول سے آخر تک قدرتِ الٰہیہ کے فیضان وانعام کی محتاج ہے۔تو اس کی شانِ الوہیت سے پیدا ہوا، اس کی شانِ رحمانیت سے زندہ ہے اور اس کی شانِ رحیمیت سے اپنے انجام کو پہنچے گا۔تسمیہ کے اسمائے ثلاثہ (اللہ الرحمٰن الرحیم) سے جہاں انسانی زندگی کی خلق، معاش اور معاد، تینوں کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے، وہاں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ انسانی جدوجہد میں ہر عمل انہی تینوں مراحل سے گزرتا ہے۔تسمیہ انسان کو

یہ تعلیم دیتا ہے کہ تیرا ہر کام اپنے آغاز کے لئے بھی رب کائنات کی توفیق و عنایات کا محتاج ہے۔ پھر اس کام کا جاری رہنا بھی اس کے فضل و کرم سے ہوتا ہے اور اس کا اپنے اختتام تک پہنچنا بھی اسی کی رحمت کے باعث ہوتا ہے۔

مکمل دستورِ حیات کی تعلیم

انسانی زندگی اجتماعی اور معاشرتی سطح پر تین قسم کے مسائل سے دوچار ہے اور انہی کے حل سے قوم کو صحیح راہ عمل میسر آتی ہے۔ حیاتِ انسانی کے دستور کے تین مسائل یہ ہیں:

i- سیاست   ii- معیشت   iii- مذہب

اس تقسیم کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ سیاست کا مدعا قیامِ اقتدار ہے، معیشت کا مدعا بقا حیات ہے اور مذہب کا مدعا حسنِ آخرت ہے۔ تسمیہ نے تینوں مسائل کے حل کے لئے رب ذوالجلال کی تین ہی شانوں کو نمایاں کر دیا، شانِ الوہیت، شانِ رحمانیت اور شانِ رحیمیت۔ نوعِ انسانی پر یہ حقیقت آشکار ہو جائے کہ انسانی زندگی کے سیاسی، معاشی اور مذہبی تمام پہلو اسی ایک در سے سنورتے ہیں اور تمام تر احتیاجات اسی ایک مرکز سے تسکین پاتی ہیں۔

خوف و رجا کی تعلیم اور توازن

خالق کائنات اپنے بندے کو محض خوفِ عقاب سے ہی خائف اور متوحش نہیں رکھنا چاہتا کہ اس سے شخصیت کے غیر متوازن ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ الرحمٰن، الرحیم کے اسماء اس کی رحمت و عنایت کی امید بھی دلا رہے ہیں، اسے رجا کہتے ہیں۔
شیخ ابو علی رودباریؒ فرماتے ہیں کہ خوف اور امید انسان کے در پر ہیں۔ دونوں صحیح ہوں تو پرواز ٹھیک ہوگی۔ اگر ایک بھی ناقص ہو تو پرواز نا تمام رہے گی۔ خوف اور امید دونوں مل کر توبہ کا محرک بنتے ہیں، ان میں سے ایک کا بھی فقدان ہو تو انسانی زندگی لذت توبہ سے محروم ہو جائے۔ چنانچہ تسمیہ

اسی تعلیم کا نچوڑ ہے کہ اللہ کا نام جو اس کی یکتائی و کبریائی کو ظاہر کرتا ہے۔ بندے کے دل میں اس کا خوف پیدا کر دے۔ الرحمٰن الرحیم کے نام اس کی رحمت و مغفرت کی امید دلا دیں۔ اس طرح بندہ اس محبوب حقیقی سے ایسا تعلق پیدا کرے کہ اس کا ڈر بھی ہو اور انس و محبت بھی۔

(تفسیر منہاج القرآن جز اول صفحہ ۲۰۰)

مراتبِ عروج ونزول کی تعلیم

عروج میں سیر من اللہ ہوتی ہے اور نزول میں سیر الی اللہ سے مراد یہ ہے کہ بندہ دنیا و مافیہا سے بے رغبت ہو کر ذات حق کے قرب و وصال کی منزلوں کو طے کرتا چلا جائے۔ اور بارگاہ الوہیت میں پہنچ کر اس طرح گم ہو کہ خود کو معدوم پائے۔ عروج معنی سیر اِلی اللہ کا مرحلہ جو مقامِ فاچ پر منتج ہوتا ہے پہلے آتا ہے اور ذاتِ الوہیت میں فنا ہو جانے کے بعد جب بقا ملتی ہے تو بندہ خود اس کی نعمتوں اور عنایتوں کا منبع و سرچشمہ ہو کر واپس لوٹتا ہے۔ پھر اسے انسانیت کی رہبری اور راہنمائی کا منصب سونپ دیا جاتا ہے۔ خدا کی ذات وصفات کے جلووں میں گم ہو کر واپس لوٹ آنا نزول ہے۔ اس کو ولایت محمدی ﷺ بھی کہتے ہیں۔ پہلے مقام پر بندہ خود کو اس کی ذات میں گم پاتا ہے تو 'أنا الحق' پکار اٹھتا ہے۔ لیکن نزول تام کے بعد جلوہ ذات سامنے بے نقاب بھی ہو تو پھر بھی شعور بندگی گم نہیں ہوتا۔ عروج دراصل اپنی ذات کی تعمیل کی کوشش تھی نزول باقی انسانیت کی تکمیل کی کوشش ہے۔ عروج کا کمال لازم تھا، نزول کا متعدی ہے۔ عروج اس لحاظ سے ذاتی منفعت پر مبنی تھا لیکن نزول دوسروں کے لئے نفع بخشی اور فیض رسانی پر مبنی ہے۔ مقامِ نزول پر بندہ بارگاہ الوہیت سے نعمتوں اور رحمتوں کو سمیٹ کر واپس خلق خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جس کا اشارہ الرحمٰن الرحیم میں ہے کیونکہ لفظ اللہ کی شان جلالت میں خدا کے سوا سب کچھ معدوم نظر آتا تھا، مگر الرحمٰن الرحیم کی شانِ رحمت میں سب کو بقا ملتی دکھائی دیتی ہے۔ اللہ کا کمال یہ تھا کہ وہی باقی اور موجود رہے اور اس کے علاوہ سب کچھ فانی و معدوم لیکن الرحمٰن الرحیم کا کمال یہ ہے کہ وہ مبقی اور

موجد (بقا دینے والا اور ایجاد کرنے والا) بھی ہو یعنی وہ بھی رہے اور اس سے مانگنے والے بھی رہیں۔ اللہ اپنی صفتِ جلال سے ہر شے کو نیست کرنے والا ہے لیکن الرحمٰن الرحیم اپنی صفتِ جمال سے ہر شے کو ہست کرنے والا ہے۔ اسی لیے اللہ سے تعلق مقامِ فنا کا باعث تھا اور الرحمٰن الرحیم سے تعلق مقامِ بقا کا باعث ہے۔ (تفسیر منہاج القرآن جز اول صفحہ ۲۰۲)

حقیقتِ انسانی کی یاد کی تکمیل

انسانی سفر کا آغاز ربِ کائنات کی شانِ الوہیت کے ظہور سے ہوا کیونکہ الوہیت اصلا خالقیت پر دلالت کرتی ہے۔ چشم رحمانیت کے ذریعے حیات کی نعمت مل رہی ہے۔ تسمیہ نے شروع میں لفظ اللہ سے انسان کو اس کی خلقت کی یاد دلائی الرحیم کے ذریعے اسے اپنے انجام اور آخری منزل کی طرف متوجہ کیا اور درمیان میں الرحمٰن کہہ کر اس دنیا کی زندگی کو بیان کر دیا تا کہ انسان اپنی سابقہ اصل کو یاد رکھے۔ (تفسیر منہاج القرآن جز اول صفحہ ۲۰۳)

سورۃ فاتحہ کے اسماء اور ان کی معنوی خصوصیات

یہ بھی ایک طے شدہ امر ہے کہ اسما کی کثرت مسمی کے شرف وکمال اور اوصاف وخصائص کی کثرت پر دلالت کرتی ہے۔

ا۔ فاتحہ .... بمعنی ازالۂ اغلاق واشکال (فتحِ مشکلات)

فاتحہ فتح سے مشتق ہے۔ جس کے معنی کھولنے کے ہیں۔ کسی بندش اور مشکل کو دور کر دینا فتح کہلاتا ہے۔ لہذا فاتحہ سے مراد ربِ کائنات کا وہ انعام ہے جو تمام رکاوٹوں کے دور ہو جانے کے بعد لطف وسکون اور اطمینان وآسودگی کی صورت میں عطا ہوتا ہے۔ اس سورۃ کو سورۃ الفاتحہ اس وجہ سے قرار دیا گیا کہ اس کی تاثیرات وکمالات میں یہ امر انتہائی اہم تھا کہ یہ مشکلوں کو آسانیوں اور بندشوں کو فراوانیوں میں بدل دیتی ہے۔ کیونکہ بسم اللہ دراصل حمد اور فاتحہ ہی کی حقیقت کا دوسرا نام ہے۔

۲ - فاتحہ ... بمعنی اِزالۂ رنج والم (فتحِ برکات)

فتح کا استعمال دو طرح ہوتا ہے۔ فتح ظاہری اور فتح باطنی، ان دونوں میں سے ایک آنکھ سے معلوم ہوتی ہے، جیسے دروازہ کھولنا، تالہ، گانٹھ اور سامان کھولنا وغیرہ۔ دوسری نورِ بصیرت سے معلوم ہوتی، جیسے غم والم کو کھولنا یعنی ازالہ کرنا۔ چنانچہ الفاتحہ سے مراد اس حقیقی برکت وسعادت کا راستہ کھولنا ہے جو انسانی زندگی کو ذہنی کرب اور فکری الجھنوں سے نجات دلادے۔

۳- فاتحہ ... بمعنی فتحِ علوم و ہدایات (فتحِ مغیبات)

جس سے علوم و معارف اور مغیباتِ ربانی کے علم کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اسی فتح سے مفتاح مشتق ہوا ہے، جس کا معنی کنجی ہے۔ اس کی جمع مفاتح اور مفاتیح آتی ہے۔ ذاتِ حق نہ صرف عالم الغیب ہے بلکہ فاتح الغیب بھی ہے۔ جہاں کہیں بھی مغیبات کا ذکر آئے گا، قرآن یہ تو کہے گا کہ انہیں کوئی نہیں جانتا لیکن یہ اعلان کہیں نہیں کیا گیا کہ ان پر کسی کو مطلع اور آگاہ بھی نہیں کیا جاتا۔ یہ باری تعالی کے خصوصی اور مخفی علوم و ہدایت کے خزانوں کا دروازہ کھولنے والی ہے۔

۴ - فاتحہ .... بمعنی غلبہ ورسلط (فتحِ مہمات)

اسلام کی اساسی اور انقلابی تعلیمات کا یہ خلاصہ جسے فاتحہ کے نام سے تعبیر کیا گیا اپنے اندر ہر محلئہ عمل پر کامیابیوں کی مکمل ضمانت رکھتا ہے۔ یہ سورۃ انسان کو دعوت دیتی ہے کہ اگر میری حقیقی تعلیمات کو اپنا لو تو زندگی کے کسی مرحلے پر ناکام نہ ہونگے۔

۵ - فاتحہ .... بمعنی انکشافِ حق و اِزالۂ شبہات (فیصلۂ قطعیہ)

قیامت کے دن کو یوم الفتح قرار دیا گیا ہے کہ اس دن خیر وشر، نیک و بد اور حق و باطل، ہر ہر چیز خوب مفصل ہو جائے گی۔ حق کا ہر ایک پر کھلا انکشاف ہو جائے گا اور کسی کا کوئی شبہ یا عذر باقی نہ رہے گا اور وہ آخری فیصلے کا دن ہوگا۔ فتح سے مراد ایسا فیصلہ ہے جو حق و باطل میں کھلا امتیاز پیدا

کر دے، یعنی اِحقاقِ حق اور اِبطالِ باطل کا باعث ہو۔ اس سورۃ کو فاتحہ کہا گیا کیونکہ اس کی تعلیمات کی اصل روح اور فلسفہ وحقیقت حق و باطل کے درمیان واضح فیصلہ اور قطعی فرق و امتیاز کو متحقق کرنا تھا۔ اس لئے قرآن وسنت اور دین حق کی تمام اصولی تعلیمات کی حقیقی روح یہی سورۃ ہے اور جو کچھ اس کے خلاف ہے باطل اور مکر وفریب ہے۔ اس لحاظ سے سورۃ فاتحہ قرآنِ حکیم کی شانِ فرقانیت کی مظہر قرار پاتی ہے کہ اس نے راہِ حق کو راہِ باطل سے جدا کر دیا۔

٦ - فاتحہ .... بمعنی اول و آخر

حقیقتِ انسانی کا آغاز جس کلمے سے ہوا وہ اقرارِ ربوبیت تھا اور یہی کلمہ سورۃ فاتحہ کا عنوان اور مضمون قرار دے دیا گیا۔ گویا وہ وعدہ جو انسان نے اپنے سفرِ حیات کے آغاز کے وقت اللہ تعالیٰ سے عالمِ ارواح میں کیا تھا، جسے قیامت تک یاد رکھنے کی تلقین بھی کی گئی ہیں اور اسی پر ذاتِ حق نے خود کو گواہ بنایا تھا، اسے الفاظ وحروف کی صورت میں قرآن کا حصہ بنا دیا گیا۔ اس سورۃ کے افتتاحی کلمات الحمد للہ رب العالمین پکار پکار کر انسان کو روزِ اول کے وعدے کی یاد دلا رہے ہیں، تاکہ خدا کی گواہی اس کے کلام کی صورت میں قیامت تک موجود رہے۔ انسان کی کتابِ حیات کا پہلا سبق بھی یہی تھا اور آخری سبق بھی یہی ہوگا۔ اس لئے فاتحہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اول بھی ہے اور آخر بھی ۔ جو چیز حقیقت میں اول ہوتی ہے، وہی آخری ہوتی ہے۔ دائرہ جس نقطے سے شروع ہوتا ہے، اس پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ اگر نقط اولین اور نقط آخرین الگ الگ ہو جائیں تو دائرے کی حیات میں تسلسل باقی نہ رہے گا، اس لئے اس کا اول ہی آخر قرار پاتا ہے۔ آپ ایک درخت کا آغاز بیج بو کر کرتے ہیں۔ اسے پانی ملتا ہے تو زمین سے نازک کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ بڑا ہوتا چلا جاتا ہے، اس کی شاخیں بنتی ہیں، اس پر پھول لگتے ہیں، آخر میں پھل نمودار ہوتا ہے، پھر پھل پکتا ہے اور کھانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقصد اور منزل

تھی جس کے لئے آپ نے اس اس درخت کو بویا تھا لیکن جب آپ پھل اتار کر کھاتے ہیں تو آخر میں پھر وہی بیج رہ جاتا ہے جس سے آغاز ہوا تھا۔ یہی بیج اول بھی تھا اور آخر بھی ہو گیا۔ اسی طرح حیاتِ انسانی کا سفر جس نقطے سے شروع ہوا تھا، اسی پر پہنچ کر اختتام پذیر بھی ہو گا۔ اس لئے فاتحہ کا جو سبق اول تھا وہی آخر بھی ہو گا، جو ابتدا تھی وہی انتہا بھی ہو گی۔ چنانچہ حیاتِ انسانی کی کائنات میں جو کچھ بھی ہے سورۃ فاتحہ کی تعلیم اس کی پہلی حقیقت ہے۔ اگر حیاتِ انسانی ایک سفر ہے تو یہ اس کا مقامِ آغاز ہے، اگر وہ ایک جمال ہے تو یہ اس کا پہلا نظارہ ہے، اگر وہ ایک نغمہ ہے تو یہ اس کی پہلی صدا ہے، اگر وہ ایک وقت ہے تو یہ اس کا پہلا لمحہ ہے، اگر وہ ایک درخت ہے تو یہ اس کا تخمِ اولین ہے، اگر وہ ایک دائرہ ہے تو یہ اس کا نقط ابتدا ہے۔ غرض کہ حیاتِ انسانی کی حقیقتوں اور سعادتوں میں جو کچھ بھی ہے اسی پر کمال کو پہنچے گا۔

اُم الکتاب۔ اُم القرآن

'ام' عربی زبان میں اصل یعنی جڑ کو کہتے ہیں۔ سورۃ الفاتحہ کو خود صاحب قرآن ﷺ نے قرآن کی اصل قرار دیا۔ جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ سورۃ شجرِ قرآن کی جڑ ہے، علومِ قرآن کی تفصیلات کا اجمال ہے، کتابِ الٰہی کے جملہ معارف و مقاصد کا خلاصہ ہے اور تمام قرآنی تعلیمات کا منبع و سرچشمہ ہے۔ اسی لئے سورۃ فاتحہ کی جامعیت کے ضمن میں یہ فرمایا گیا:

کل العلوم مندرج فی الکتب الربعۃ وعلومھا فی القرآن وعلوم القرآن فی الفاتحۃ۔ (التفسیر الکبیر، ۱:۹۹)

تمام علوم و معارفِ کائنات چار الہامی کتابوں میں درج کئے گئے اور ان کے تمام علوم قرآن میں جمع کر دیئے گئے اور تمام علومِ قرآن سورۃ فاتحہ میں مجتمع کر دیے گئے ہیں۔

شہر مکہ کی اصلیت و اولیت اور جامعیت و مرکزیت کی وجہ سے اسے ام القری کا لقب دے دیا گیا۔

چنانچہ سورۃ الفاتحہ کو ام الکتاب یا ام القرآن کے نام سے تعبیر کیا جانا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ سورت قرآن کی سب سے پہلی سورت بھی ہے۔ یہ سورۃ تمام قرآنی تعلیمات کا اِجمال ہے۔ قرآنِ حکیم کی جملہ تعلیمات تین اقسام پر مشتمل ہیں:

۱ - علوم العقائد ۲ - علوم الاحکام ۳ - علوم التذکیر

پہلی قسم انسانوں کے معتقدات اور خیالات ونظریات کی اصلاح کے لئے ہے، دوسری قسم انسانی اعمال اور احوال واطوار کو سنوارنے کے لئے ہے اور تیسری قسم باری تعالی کے انعام واکرام اور عذاب وعقاب کے تذکروں سے قلب وباطن میں خشیت اور رقت پیدا کر کے انہیں جلا وتطہیر بخشنے کے لئے ہے۔ الغرض الحمد سے والناس تک پورے قرآن مجید کا مطالعہ کرنے سے بالواسطہ یا بلا واسطہ یہی تین قسم کی بنیادی تعلیمات منصۂ شہود پر آتی ہیں۔

سورۃُ الکنز:

سورۃ فاتحہ کے اسماء مبارکہ میں سے ایک نام سورۃ الکنز بھی ہے۔ کنز، خزانے کو کہتے ہیں۔ یہ سورت جملہ علوم وہدایات، معانی ومعارف اور اسرار ورموز کا خزانہ ہے۔ آئمہ نے متعدد طرق سے حضرت ابی بن کعب اور حضرت ابوسعید بن المعلی سے یہ حدیث صحیح روایت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ دریں اثنا رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلایا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ آپ نے پھر پکارا تو میں نے نماز ہلکی کر دی اور جلدی سے فارغ ہو کر آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور سلام عرض کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اب تک کس کام میں مصروف تھے تم نے مجھے جواب کیوں نہیں دیا؟ میں نے عرض کیا کہ: حضور میں نماز میں تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی کا یہ فرمان تم نے نہیں سنا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اسْتَجِيبُو اِللّٰهِ وَلِلرَّسُولِ اِذَا دَعَاكُم لِمَا يُحيِيكُم ۔ (الانفال، ۸:۲۴)

اے ایمان والو ! جب (بھی) رسول تمہیں کسی کام کے لئے بلائیں جو تمہیں (جاودانی) زندگی عطا کرتا ہے تو اللہ اور رسول کو فرمانبرداری کیساتھ جواب دیتے ہوئے (فورا) حاضر ہو جایا کرو۔
آپ ﷺ نے فرمایا: یہی سورت ہے جو سبع مثانی ہے اور قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا۔ اس طرح اس سورت کا باری تعالی کے خصوصی خزانوں میں سے عظیم خزانہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

سورۃ النور:

یہ نام بھی احادیث نبوی سے ثابت ہے۔ منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرائیل آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اوپر سے ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی۔ جبرئیل امین نے اوپر دیکھ کر فرمایا۔ آج آسمان کا وہ دروازہ کھلا ہے جو پہلے کبھی نہیں کھلا تھا۔ پھر وہاں سے ایک فرشتہ بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا۔ یارسول اللہ ﷺ خوش ہو جایئے: آپ کو دو نور ایسے عطا کئے گئے ہیں جو آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں ملے تھے۔ ایک سورۃ فاتحہ اور دوسرا سورۃ البقرہ کی آخری دس آیات۔ ان میں سے جو جو حرف آپ پڑھیں گے آپ کو نور میسر آئے گا۔ ایک ایک حرف کو انفرادی طور پر نور سے تعبیر کرنا اس حقیقت کی وضاحت کرتا ہے کہ یہ سورۃ اس قرآن کے انوار و تجلیات کا منتہائے کمال ہے۔ اگر قرآنی نور کی آب و تاب اور چمک دمک کو نقطہ عروج پر دیکھنا مطلوب ہو تو یہ ایک ہی سورۃ کافی ہے۔

السبع المثانی:

اس کا معنی ہے۔ دہرائی جانے والی یا بار بار پڑھی جانے والی سات آیتیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: مجھے تمام کلاموں کا مجموعہ اور ماحصل عطا کر دیا گیا۔
قرآن عظیم اپنی جملہ تعلیمات اور علوم و معارف کے لحاظ سے ایک ہی سورۃ میں سمو دیا گیا تھا اس لئے اسے ہی تشریفا ''القرآن العظیم'' کا نام دے دیا گیا ہے۔

اساس القرآن:

سورۃ فاتحہ کا ایک نام اساس القرآن بھی ہے۔اساس بنیاد کو کہتے ہیں۔سورۃ فاتحہ کے مضامین کا بنظرِ غائر جائزہ لیں تو دنیا و آخرت کی اصلاح اور ان کے خوف وغم سے کلی نجات کا طریقہ بھی اس میں مذکور ہے اور ضمانت بھی۔

سورۃ الحمد - سورۃ المناجات - سورۃ الشکر

سورۃ فاتحہ کے یہ تینوں نام دراصل اس کی ایک انتہائی اہم خصوصیت کی نشاندہی کرتے ہیں اور وہ ہے باری تعالیٰ کی حمد وثنا اور اس کی تمجید و توصیف۔اس سورۃ کا پڑھنا ازخود شکرِ الٰہی بھی قرار پا گیا کیونکہ کسی دینے والے کی عطا و احسان کے حوالے سے اس کی تعریف کرنا شکر کہلاتا ہے۔

سورۃ الصلوٰۃ:

جو کچھ اس میں بیان ہوا ہے وہی نماز کی معراج ہے کہ بندے کے دل میں اپنے بندہ ہونے اور اس ذاتِ ستودہ صفات کے رب اور خالق و مالک ہونے کا احساس ہو جائے اور وہ خود کو عاجز و بے بس سمجھ کر اس کی بارگاہ میں دامنِ مراد پھیلا دے اور جبینِ نیاز جھکا دے تو یہی حاصلِ نماز ہے اور اسی تعلیم کا نام سورہ فاتحہ ہے۔

سورۃ التفویض:

اپنے امور کی انجام دہی کسی کو سونپ دینا تفوِیض کہلاتا ہے۔یہ توکل کا سب سے بڑا درجہ ہے، جس کا ذکر قرآن میں یوں ملتا ہے: **وَ اُفَوِّضُ اَمرِی اِلَی اللّٰہِ ۔**

(المومنین ۴۰:۴۴)

اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔اسی کو تفویض کہتے ہیں اور یہی عبادت و استعانت کی روح ہے۔یہ سب کچھ توکل اور تفویض ہے جو پوری سورۃ کا ماحصل ہے۔تفویض دراصل ایسے

زندہ توکل کو کہتے ہیں جس سے انسانی زندگی میں جمود اور تعطل بھی پیدا نہیں ہوتا اور ذاتِ حق پر کامل بھروسہ بھی قائم و دائم رہتا ہے۔ توکل سے مراد حرکت کو سکون میں نہیں بلکہ کامیابی اور نتیجہ کے یقین کے ساتھ سکون کو حرکت میں بدلنا ہے اور یہی سورۃ التفویض کی بنیادی تعلیم ہے۔

سورۃ الدعا - سورۃ السؤال - سورۃ تعلیم المسئلہ

سورہ فاتحہ کو ان تینوں ناموں سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہ سورۃ بندوں کو آدابِ دعا اور بارگاہِ ربوبیت میں سلیقۂ سوال سکھاتی ہے۔ اس کی عظمت کے مقابلے میں اپنی بندگی، اس کی رحمت کے مقابلے میں اپنی پریشان حالی، اس کی مالکیت کے مقابلے میں اپنی غلامی، اس کی مغفرت کے مقابلے میں اپنی حاجتمندی اور اس کے لطف و کرم کے مقابلے میں اپنی احسان مندی۔ الغرض اپنے اور اپنے رب کے درمیان اس تعلق کو بیان کر لینے کے بعد اب وہ گڑگڑاتے ہوئے، آہ وزاری کرتے ہوئے اور اس کی بے پایاں رحمتوں پر نظرِ امید رکھتے ہوئے اس کی بارگاہِ انعام وعطا میں اپنا دامنِ سوال پھیلا دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالی ہے:

قسمت الصلاۃ بینی و بین عبدی نصفین فتصفها لعبدی ولعبدی ماسأل۔ (جامع الترمذی:، ابواب تفسیر القرآن رقم:)

میں نے اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نماز کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ آدھی میرے لئے ہے اور آدھی میرے بندے کے لئے اور میرے بندے کو وہی ملے گا جو اس نے مانگا۔

پھر حضور ﷺ نے اس کی وضاحت یوں فرمائی کہ جب بندہ نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھتے ہوئے الحمد للہ رب العلمین کہتا ہے تو باری تعالی ارشاد فرماتا ہے۔ حمدنی عبدی) میرے بندے نے میری حمد کی (جب بندہ الرحمٰن الرحیم کہتا ہے تو ارشادِ الٰہی ہوتا ہے اثنی علی عبدی) میرے بندے نے میری مزید تعریف کی (جب بندہ مالک یوم الدین کہتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے: مجدنی عبدی وھذا الی) میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی اور یہ میرے لئے ہے (یہ بھی ارشاد ہوتا ہے: فوض الی

عبدی) میرے بندے نے اپنا معاملہ میرے سپرد کر دیا (اس کے بعد جب بندہ ایاک نعبد وایاک نستعین کہتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے: ھذا بینی و بین عبدی) یہ بات میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے (اور جب بندہ **اِھدِنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضَالین** کہتا ہے تو ندا آتی ہے: ہذا العبدی ولعبدی ما سائل (یہ حصہ خالصتاً میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کو وہی ملے گا جو اس نے مانگا)۔

سورۃ فاتحہ کی پہلی تین آیات خالصتاً اللہ تعالی کی ذات کے لئے ہیں درمیانی (چوتھی) آیت اللہ اور بندے کے لئے مشترک ہے اور آخری تین آیات صرف بندے کی ذات کے لئے ہیں۔

سورۃُ الکافیہ:

دین حق کا کوئی اساسی مسئلہ ایسا نہیں جس کا عطر اور خلاصہ سورہ فاتحہ میں مندرج نہ ہو، عرفا کاملین کے نزدیک شریعت وطریقت اور حقیقت و معرفت کے مراتبِ عالیہ میں سے کوئی مرتبہ اور درجہ ایسا نہیں جس کی تعلیم سورۃ فاتحہ میں نہ دی گئی ہو۔ ایک ایک مرتبہ سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص کا ملا کر پڑھنا ثواب کے اعتبار سے پورے قرآن کی تلاوت کے حکم میں ہوگا۔

سورۃ الوافیہ:

سورۃ فاتحہ کا نام الوافیہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس کا نصف پڑھنا جائز نہیں۔ اسے ہر جگہ پورا ہی پڑھا جائے گا۔

سورۃ الشفاء - سورۃ الشافیہ:

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے: فاتحہ الکتاب شفا من السم۔

(التفسیر الکبیر، ۱:۱۷٦)

فاتح الکتاب زہر کے لئے شفا ہے۔

حدیث میں منقول ہے کہ صحابہ سانپ اور بچھو کے کاٹے پر اور مجنون اور اہلِ صرع (یعنی مرگی کے مریض) پر سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کرتے تھے اور مریض اسی وقت تندرست ہو جاتا تھا۔

سورۃ الرقیہ:

رقیہ رقی سے مشتق ہے۔ یہ لفظ عربی زبان میں تریاق کے لئے بولا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ سورۃ تریاق ہے۔

سورۃ الواقیہ:

یہ وقی سے مشتق ہے، جس کے معنی ہے کسی کو تکلیف اور مصیبت سے محفوظ کرنا اور چھپا لینا۔ حضورﷺ نے فرمایا: اگر تم بستر پر دراز ہوتے وقت سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص پڑھ لیا کرو تو سوائے موت کے تم ہر شے سے محفوظ و مامون ہو جاؤ گے۔

استدلالِ رسالت کی دوسری وجہ:

یہ امر بڑا واضح ہے کہ زندگی بسر کرنے کا ضابطہ اور ہدایت مہیا کئے بغیر انسانوں سے جواب طلبی اور جزا و سزا کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔ یہ بات ہرگز ممکن نہیں کہ انسانوں کو ربِ کائنات نے پیدا کر کے ذرائع و وسائلِ حیات تو مہیا کر دیئے ہوں کہ یہ کھاؤ اور پیئو اور زندگی گزارو، مگر انہیں اپنی وحی و ہدایت کی نعمت سے سرفراز فرمایا ہو اور نہ انہیں کوئی ضابطِ زندگی اور نمونہ حیات تجویز کیا ہو کہ جس کے مطابق زندگی بسر کرنا نیکی اور جس کے خلاف زندگی بسر کرنا گناہ قرار پائے۔ پھر اس کے باوجود روزِ قیامت ان سے حساب و کتاب بھی لیا جائے، جواب طلبی بھی کی جائے اور انہیں جزا و سزا بھی دی جائے۔

واسطۂ رسالت کے بغیر ایمان باللہ مردود ہے:

اللہ احد (وہ اللہ ایک ہے) لیکن نہیں، باری تعالی نے اپنی توحید والوہیت کا اعلان بھی اس انداز سے پسند فرمایا کہ اے زبانِ رسالت ! تو حرکت میں آ اور اپنی ادائے دلنوازی سے کہہ دے وہ اللہ ایک ہے۔ بیانِ توحید کا آغاز کلمۂ قل (تو کہہ دے) سے کیا گیا۔ یعنی ذاتِ حق اپنی توحید کا ذکر بھی زبان رسالت سے سننا چاہتی تھی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ اے محبوب ﷺ ! اپنی وحدت والوہیت کے بیان کا جو لطف اور مزہ تیری زبان سے سننے میں ہے وہ کسی اور جگہ کہاں، اس لئے جب تو میرے ایک ہونے کا اعلان کرے گا تو میں اس اعلان کو توحید بنالوں گا۔ وحدت اور توحید میں فرق یہی ہے کہ واسطۂ رسالت کے بغیر اقرار وحدت والوہیت کو قرآن منافقت قرار دے رہا ہے۔

رسالت .... بنائے ایمان توحید:

اگر باری تعالی چاہتے تو یہاں دین حق یا اسلام کے تعارف کے لئے عقید توحید کو ہی براہ راست بیان فرما دیتے۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا بلکہ دین اسلام کا تشخص وامتیاز نسبت رسالت سے قائم کیا گیا اور توحید کا بیان بھی نبوت ورسالت کے عمل اور وطیرہ وشعار کے واسطے سے کیا گیا تاکہ یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے کہ اسلام جس توحید کی تعلیم دیتا ہے وہ رسالت کے واسطے سے شرف قبولیت پاتی ہے۔ لیکن اس تک رسائی کی صورت صرف واسطۂ رسالت ہے۔ جب کسی کو بھی از خود زبان نبوت ورسالت کی شہادت کے بغیر خدا کی ذات وصفات کا شعور تھا۔ اسلام کے نزدیک توحید صرف واسطۂ رسالت سے ہی مقبول ہے۔ دین وملت کا تشخص اس کی بقا واستحکام اور اس کا شرف وامتیاز بھی نسبت رسالت ہی سے ہے۔ سورۃ فاتحہ میں بیان ربوبیت کے بعد جس رحمتِ الہی کا ذکر کیا گیا، وہ یقیناً واسطہ رسالت کی رحمت تھی۔ اسی دن کو سورۃ فاتحہ میں یوم الدین سے اور اس دن کی عدالت کے سربراہ کو مالک یوم الدین سے

تعبیر کیا گیا۔ چنانچہ سورۃ فاتحہ کا پہلا پیغام ربوبیتِ الٰہیہ کا پیغام تھا۔ یہی ربوبیت توحید کی دلیل تھی، یہی ربوبیت رسالت کی دلیل تھی اور یہی ربوبیت آخرت کی بھی دلیل قرار پا گئی۔ جس طرح ربوبیت، توحید کے بغیر کوئی مفہوم نہ رکھتی تھی، رسالت کے بغیر اس کا کوئی مفہوم نہ تھا، اسی طرح آخرت کے بغیر بھی اس کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ سورۃ فاتحہ کا پہلا پیغام ربوبیتِ الٰہیہ پیغام تھا، جو حیاتِ انسانی کے جملہ اِعتقادات کی اِصلاح کے لئے کافی ووافی ہے۔

سورۃ فاتحہ اور حیاتِ انسانی کا عملی پہلو:

عبادت سے مراد انتہائی عاجزی، انکساری اور تذلل کا اظہار ہے۔ عاجزی اور تذلل کے مقابلے میں صاف ظاہر ہے کہ عظمت و کبریائی ہی ہوسکتی ہے۔ اسی وجہ سے عبادت اور عبودیت دونوں لفظ بندگی اور غلامی کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ گویا عام معنوں میں کسی کی عبادت سے مراد یہ ہوگا کہ اسے عظمت و کبریائی کا مالک تصور کرتے ہوئے اپنا آقا تسلیم کیا جائے اور خود کو اس کا عاجز وحقیر بندہ۔ مدد کی ضرورت انسان کو عام طور پر دو طرح کے معاملات میں ہوتی ہے:

1- ایک کوئی ایسی مشکل درپیش ہو کہ اپنے وسائل و ذرائع سے اس کا حل میسر نہ آسکے۔

2- اور دوسرے کوئی ایسی خواہش اور آرزو ہو جس کا حصول ذاتی کوششوں سے ممکن نہ ہو۔

لہٰذا سورۃ فاتحہ نے حیاتِ انسانی کے عملی پہلو کی اصلاح اس طرح کی کہ انسان ربِ کائنات کا ایسا اطاعت گزار بندہ بن جائے کہ خوشی و غمی، عیش وطیش، فراخی و تنگی، سکھ اور دکھ، صحت اور بیماری، امیری اور غریبی، آسودہ حالی اور پریشان حالی الغرض کسی حالت میں بھی اس کی بندگی ترک نہ کرنے پائے، اس کی اطاعت اور غلامی سے منہ نہ موڑے، اور اس کے بجائے کسی بڑے سے بڑے فرعون کے سامنے بھی نہ سرِ نیاز خم کرے اور نہ دستِ سوال دراز کرے۔

لہٰذا سورۃ فاتحہ نے حیاتِ انسانی کی مقصدیت کو اتنے جامع انداز سے بیان کیا کہ نصب العین

کے تعین سے لے کر حفاظت واستقامت کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچا دینے کی ضمانت تک مہیا کر دی۔

لفظِ صراط استعمال کرنے کی حکمت:

ہدایت کا آغاز تو شعور مقصد سے ہوتا ہے اور نصب العین کے تعین کے بغیر ہدایت اور رہنمائی کا کوئی مفہوم بھی باقی نہیں رہتا۔ اگر کوئی شخص کسی سے منزل اور مقصدِ حیات کی رہنمائی طلب کرے تو اس سے اتنا تو ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے نصب العین کو جاننے اور مقصدِ زیست کو پہچاننے کا آرزومند ہے۔ گویا یہ سوال محض علمی نہیں بلکہ عملی حیثیت کا بھی حامل ہوگا۔ پہلے سوال کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ مقصد کیا ہے؟ دوسرے سوال کی نوعیت یہ ہے کہ مقصد کو حاصل کس طرح کیا جائے؟ پہلے سوال کا اندازہ یہ ہوتا ہے کہ منزل کون سی ہے؟ دوسرے سوال کا اندازہ یہ ہے کہ منزل تک پہنچا کس طرح جائے؟ پہلا سوال محض حقیقت کو جاننے کی غرض سے ہوتا ہے، دوسرا سوال حقیقت کو پانے کی غرض سے ہے۔ پہلا سوال صرف ایک تصور کو معلوم کرنے کی حد تک ہوتا، دوسرا سوال اس تصور کو واقعہ بنانے کی خاطر ہے۔ پہلے سوال کا موضوع علم تھا، دوسرے سوال کا موضوع عمل ہے۔

علم کی ابتدا شک سے ہوتی ہے، عمل کی یقین سے۔

علم میں فکر کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، عمل میں عزم وارادے کو۔

علم کا تعلق توجیہ سے ہے اور عمل کا تخلیق ہے۔

☆ اسلام محض فکر کا نہیں، عزم وارادے کا نام ہے۔

☆ اسلام محض علم کا نہیں، عمل کا نام ہے۔

☆ اسلام محض تبلیغ کا نہیں، تعمیل کا نام ہے۔

☆ اسلام محض توجیہ کا نہیں، تخلیق کا نام ہے۔

☆اسلام محض مقصودِ حیات کو جاننے کا نہیں، اس کو پانے کا نام ہے۔

☆اسلام محض فلسفیانہ موشگافیوں کا نہیں بلکہ عملی جدوجہد کے ذریعے نتائج پیدا کرنے کا نام ہے۔

سورۃ فاتحہ میں لفظِ صراط استعمال کیا گیا تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ قرآن بندوں کو محض نظری وفکری ہدایت کا طالب ہی نہیں بلکہ عملی ہدایت کا طالب بنانا چاہتا ہے اور انسانوں کو مقصدِ حیات کی معرفت کے بعد اسے حاصل کرنے کی فیصلہ کن جدوجہد میں گامزن کرنا چاہتا ہے۔

اخلاقیات:

اخلاقیات میں تمام علمی اور فلسفیانہ نظریات اس طرح بحث کرتے ہیں کہ اخلاق کی ماہیت کیا ہے؟ فضائل کیا ہیں؟ معیارا خلاق کیا ہے؟ معیارِ اخلاق کی صحت کی منطقی اساس کیا ہے؟ اوراس کے کمال کے متضمنات کیا ہیں؟ لیکن قرآنی علم ان تمام سوالات کا حتمی جواب دینے کے بعد اس امر سے بحث کرتا ہے کہ مطلوبہ معیارِ اخلاق کے مطابق انسان کی عملی زندگی کس طرح ڈھلے گی؟ اور فضائلِ اخلاق حیاتِ انسانی میں واقعہ بن کر کس طرح تبدیلی پیدا کریں گے؟ اس مسئلے پر قرآن وسنت کے سوا دنیا کے تمام فلسفے خاموش ہیں۔

عمرانیات:

عمرانیات میں تمام علمی نظریات اس طرح بحث کرتے ہیں کہ معاشرہ کیا ہے؟ کیونکر وجود میں آتا ہے؟ اوراس کے اِنضباط واِختلال کے اسباب کیا ہیں؟ لیکن قرآنی علوم ان مسائل سے آگے بڑھتے ہوئے اس امر سے بحث کرتا ہے کہ معاشرے میں پیدا ہونے والے ہر قسم کے اِختلال کو رفع کر کے ہیئتِ عمرانی کو ایک ایسی موثر وحدت میں کس طرح بدلا جا سکتا ہے جو اِفتراق واِنتشار کے تمام رجحانات پر قابو پالے؟

سیاسیات:

سیاسیات میں تمام علمی نظریات اس طرح بحث کرتے ہیں کہ ریاست کیا ہے؟ اس کے

اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ اس کے اجزا کی ماہیت اور ان کا وظیفہ وعمل کیا ہے؟ لیکن قرآنی علم ان مسائل سے آگے بڑھتے ہوئے اس امر سے بحث کرتا ہے کہ حاکم محکوم کے درمیان پیدا ہونے والے سیاسی تناقض کو رفع کر کے اس قومی نصب العین کو کس طرح حاصل کیا جائے جس کے نتیجے میں پورا معاشرہ ہر قسم کے اندرونی و بیرونی موجبات خوف و غم سے محفوظ ہو جائے؟

معاشیات:

معاشیات میں تمام علمی نظریات اس طرح بحث کرتے ہیں کہ معاشی تخلیق کا عمل کیا ہے؟ دولت کی تقسیم اور اس کے صرف کا عمل کس طرح واقع ہوتا ہے؟ اور دولت اور محنت کا باہمی توازن کیا ہے؟ لیکن قرآنی علم مسئلے کی اس جہت پر بحث کرتا ہے کہ معاشی تخلیق کو مزمومہ مفادات سے پاک کر کے اور وسائل دولت پر سے محدود گروہوں کی اجارہ داری ختم کر کے تقسیمِ دولت کے ایسے منصفانہ نظام کو کس طرح رائج کیا جائے کہ کسی فرد کی تخلیقی جدوجہد میں معاشی تعطل باقی نہ رہے اور فرد اور معاشرہ دونوں کسی سطح پر بھی حاجت مندی کا شکار نہ ہونے پائیں؟

مذہبیات:

مذہبیات میں تمام علمی نظریات اس طرح بحث کرتے ہیں کہ عقیدہ کیا ہے؟ اعمال صالحہ کیا ہیں؟ پسندیدہ اور ناپسندیدہ عقائد و اعمال میں کیا فرق ہے؟ اور ہر دو کے نتائج و اثرات کیا ہیں؟ لیکن قرآنی علم ان مسائل کا حتمی جواب مہیا کرنے کے بعد اس امر سے بحث کرتا ہے کہ اگر عقائد، اوہام اور اعمال، مردہ رسوم میں بدل چکے ہوں اور ان کے درمیان کوئی موثر تعلق باقی نہ رہا ہو تو انہیں پھر کس طرح سے زندہ کیا جائے کہ عقیدہ و عمل کا تعلق بحال ہو کر انسانوں کی سماجی زندگی میں مطلوبہ انقلاب بپا کر سکے؟ یہ آیت سوال کے ذریعے انسان کو محض مسئلے کی نوعیت کے بارے میں نہیں بلکہ اس کے حل کے بارے میں ہدایت طلب کرنے کی تلقین کر رہی ہے۔ کیونکہ فکری ہدایت، عملی ہدایت کے بغیر بے سود اور ناکافی ہے۔ (تفسیر منہاج القرآن جز اول صفحہ ۲۹۶)

قرآنی ہدایت اور مقصدِ تخلیق:

منزِل حیات اور نصب العین سے بے خبری بھی تاریکی ہے اور منزل کے صحیح راستے سے بے خبری بھی تاریکی ہے۔ قرآن کے مطابق زندگی مقصد کے حصول کی جدوجہد سے عبارت ہے اور موت اس کے اخروِی انجام ونتائج سے۔

اسلوبِ سورۃ اور نظامِ فکر وعمل:

فکر وعمل کا یہ نظام آٹھ ضابطوں پر مشتمل ہے۔

-1 صحتِ عقیدہ (اخلاص فی الایمان)

-2 صحتِ عمل (اخلاص فی العمل)

-3 فکرِ احتساب ومسئولیت

-4 منزلِ مقصود کا صحیح تعین

-5 جدوجہد میں استقامت واستقلال

-6 حصولِ مقصد میں کامیابی کا پختہ یقین

-7 اہلِ حق کی پہچان اور ان کی مصاحبت ومعاونت

-8 اہلِ باطل کی پہچان اور ان سے خصومت وعدم معاونت

قرآنی نظام فکر وعمل کی اساس اور نقطۂ آغاز عقیدے کی اصلاح ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر عمل جو اختیاری اور ارادی ہوگا، اس کا آغاز کسی نہ کسی فکر اور تصور سے ہی ہوتا ہے۔ اس فکر اور تصور کو جو در حقیقت عمل کا صورت گر ہے عقیدہ کہا جاتا ہے۔ چونکہ ہر عمل اور جدوجہد کی بنیاد عقیدہ ہے۔ اسلامی اعتقاد کی عمارت فی الواقع تین بنیادی ستونوں پر قائم کی گئی ہے:

ا۔ توحید ۲۔ رسالت ۳۔ آخرت

اسی طرح الرحمٰن الرحیم کے الفاظ پر مشتمل دوسری آیت جو باری تعالی کی خالقیت اور ربوبیت اور

یوم جزا کی مالکیت کے ذکر کے درمیان واقع ہے۔اس کی تمام رحمتوں سے ارفع رحمت اور تمام مہربانیوں سے اعلیٰ مہربانی مخلوقِ خدا کی ہدایت ورہنمائی کے لئے انبیاء ورسل کا مبعوث کرنا ہے اوران سب سے بڑھ کر کائناتِ عالم پر خدا کی عظیم رحمت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت ورسالت ہے۔ حضور ﷺ کی نسبت کے بغیر نہ خدا کی وحدانیت کا عقیدہ، عقیدہ توحید بن سکتا ہے اور نہ جزا وسزا کا عقیدہ، عقیدہ آخرت۔

گویا کامیابی وکامرانی کی ضمانت جس ضابطے کی صورت میں قرآن بیان کر رہا ہے۔وہ چار امور پر مشتمل ہے۔

۱۔ایمان ۲۔عملِ صالح ۳۔تعاون بالحق ۴۔استقامت بالصبر

مایوسی وبے یقینی درحقیقت شیوہ کفر ہے۔جب کہ اعتماد ویقین شیوہ ایمان ہے۔

مضامینِ سورۃ فاتحہ کی منطقی ترتیب

اس کے مضامین اور آیات بلکہ الفاظ بھی باہم منطقی ترتیب کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں۔اس کا ہر لفظ اور ہر آیت دعویٰ بھی ہے اور دلیل بھی۔

الحمدللہ دعویٰ ...... رب العالمین دلیل

'الحمدللہ' دعوی ہے۔جس میں یہ کہا گیا ہے کہ تمام تعریفوں اور خوبیوں کا مستحق صرف اللہ ہے۔رب العالمین اس دعوے کی دلیل ہے کہ وہ ساری کائنات کا پروردِگار ہے۔گویا اس کا ربِ کائنات ہونا اس کے مستحقِ حمد ہونے کی دلیل قرار پا گیا۔

رب العالمین دعویٰ ...... الرحمٰن الرحیم دلیل

ربوبیت کا مقتضی یہ ہے کہ رب اپنے ہر مربوب کو پستی سے اٹھا کر بام عروج تک پہنچادے یعنی ہر کمال سے نواز دے یہ کام شفقت وعنایت کے بغیر ممکن نہیں۔

الرحمٰن الرحیم دعویٰ ...... مالک یوم الدین دلیل

ہر فرد کائنات پر اسی کی رحمتوں اور نعمتوں کا سایہ ہے اور ہر شخص اس کے احسانات وانعامات سے نوازا جارہا ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ اس دنیا کے اختتام پر ہر ایک سے جواب طلبی وہی کرے گا اور ہر ایک کو اس کے کئے پر جزاوسزا بھی وہی دے گا۔

مالک یوم الدین دعویٰ ...... ایاک نعبد دلیل

عبادت مکمل غلامی و بندگی کا نام ہے جو شخص جس کی غلامی و بندگی کرتا ہے۔اس کا مالک اوراس کی جزاوسزا کا مختار بھی وہی ہوتا ہے۔لہذا جب ہم اس کے سوا کسی کو لائق عبادت نہیں سمجھتے تو اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ ہمارا مالک اور جزاوسزا کا مختار بھی وہی ہے۔

اِیاک نعبد دعویٰ ..... اِیاک نستعین دلیل

غلام کے لئے ضروری ہے کہ مدد بھی اسی سے چاہے جس کی وہ بندگی کرتا ہے۔آقا ومولا یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کے بندے کسی اور کے سامنے دامنِ سوال دراز کرتے پھریں۔مادی یا روحانی طور پر صاحب استطاعت انسانوں کو دوسروں کی مدد کرنے پر مامور بھی اسی مستعانِ حقیقی نے کیا ہے اور وہ فی الحقیقت امدادِ الٰہی کے ذریعہ ومظہر کے طور پر اپنا اپنا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ان سے ظاہری استعانت بھی درحقیقت باری تعالی سے استعانت ہے۔

اِیاک نستعین دعویٰ ..... اِھدنا الصراط المستقیم دلیل

ہدایتِ باری تعالی سے اس لئے مانگی جارہی ہے کہ وہ ہدایت عطا کرتا ہے۔ہدایت سے بڑھ کر اور کونسی بہتر مدد ہوسکتی ہے۔اس لئے وہی اس لائق ہے کہ اس سے سوال کیا جائے کیونکہ ساحلِ مراد تک پہنچانا اسی کے دست قدرت میں ہے۔

اِھدنا الصراط المستقیم دعویٰ ..... صراط الذین انعمت علیھم دلیل

جب تک دنیا میں کوئی سیدھا راستہ موجود نہ ہو اور اس پر کچھ خوش نصیب پہلے سے گامزن نہ ہوں تو اس کی تمنا ہی عبث ہوگی۔ اس لئے فرمایا گیا کہ سیدھا راستہ موجود ہے اور وہ وہی ہے جس پر خدا کے کئی انعام یافتہ بندے چل رہے ہیں۔ وہی صراط مستقیم ہوگا۔

صراط الذین انعمت علیھم دعویٰ ..... غیر المغضوبِ علیھم دلیل

جن لوگوں پر خدا کا غضب ہوا ہو اور وہ راہِ حق سے بہک چکے ہوں، جب ان کی راہ پر چلنے سے اور ان کی رفاقت و مصاحبت سے روکا جا رہا ہو تو صاف ظاہر ہے کہ جو خدا کے انعام یافتہ اور مقرب و مقبول بندے ہیں، ان کی راہ پر چلنے کا حکم ہوگا۔

سورۃ فاتحہ اور صفاتِ باری تعالی

اس میں باری تعالی کی بارہ صفات نمایاں طور پر بیان کی گئی ہیں۔

۱۔محمود	۲۔اِلٰہ	۳۔رب	۴۔رحمٰن
۵۔رحیم	۶۔مالک	۷۔معبود	۸۔مستعان
۹۔ھادی	۱۰۔منعم	۱۱۔قہار	۱۲۔مُضِل

الٰہ اس ذات کو کہتے ہیں جو خالقِ کائنات ہو، خود ہر کمال کی مالک ہو اور ہر کمال کا منبع و سرچشمہ بھی ہو۔ ہر کمال اسی سے شروع ہوتا ہو اور اسی پر ختم بھی ہوتا ہو۔ رب العلمین کے الفاظ باری تعالی کی صفتِ ربوبیت پر دلالت کرتے ہیں۔ صرف خود ہی باکمال نہیں بلکہ اپنی مخلوق کو بھی اس کے حسبِ حال کمال عطا کرتا ہے۔ خدا رحمان ہونے کی بنا پر صرف خود ہی پیکر رحمت نہیں بلکہ رحیم ہونے کی وجہ سے دوسروں کو بھی دولت رحمت سے نوازتا ہے۔

سورۃ فاتحہ اور صفاتِ عبدیت

صفاتِ عبدیت بھی تعداد میں بارہ ہی ہیں۔

۱۔حامد ۲۔مخلوق ۳۔مربوب ۴۔محتاج فی الدنیا

۵۔محتاج فی الاخرۃ ۶۔مملوک ومحکوم ۷۔عابد و مطیع ۸۔مستعین و مستمد (مدد چاہنے والا) ۹۔طالبِ ہدایت یا ہدایت یافتہ ۱۰۔منعم علیہ یا انعام یافتہ

۱۱۔مستحقِ قہر وغضب یا مغضوب ومقہور ۱۲۔مستحقِ ضلالت یا گمراہ

ذاتِ باری تعالیٰ محمود ہے اور پوری کائنات میں سب سے اعلیٰ حامد انسان ہے۔ کیونکہ اسی کو سب سے زیادہ اس کے محاسن وکمالات کی معرفت ہے۔ تربیت نام ہی اپنے فضائل وکمالات کا رنگ دوسرے میں درجہ بدرجہ منتقل کر دینے کا ہے۔ لہٰذا انسان باری تعالیٰ کا مربوبِ اتم ہونے کے باعث اس کی صفاتِ حسن وکمال کا مظہر ہے۔ صحیح معنوں میں انسان وہ ہے، جو یہ سمجھے کہ میں ہر وقت اس کی رحمت اور فضل وعنایت کا محتاج ہوں اور اس کی طرف ہر حال میں راغب اور متوجہ رہے۔ جب بندہ اس کی ہدایت صدقِ دل سے طلب کرتا ہے تو ذاتِ حق اسے اپنی نعمتِ ہدایت سے بہرور کر دیتی ہے اور پھر وہ مخلوقِ خدا کے لئے ہدایتِ ربانی کا مظہر بن جاتا ہے۔ جب ذاتِ حق کسی بندے کو اپنے انعام سے نوازتی ہے تو دیگر مخلوق کا میلان طبع اس کی طرف کر دیتی ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ، نافرمانوں کے حق میں قاہر ہے۔

اللہ اور بندے کا پنج جہتی تعلق

اس میں بندے کا اپنے رب کے ساتھ پانچ قسم کا تعلق بیان کیا گیا ہے۔

1 - اللہ 2 - رب 3 - رحمان 4 - رحیم 5 - مالک

ذاتِ حق کا پہلا اسم 'اللہ' تھا۔ اس کے ساتھ انسان کا پہلا تعلق، تعلقِ عبادت قائم ہوگیا۔ دوسرا اسم

'رب' ہے۔اس کے ساتھ انسان کا دوسرا تعلق، استعانت یعنی طلبِ مدد کا قائم ہو گیا۔ذاتِ باری تعالیٰ کا تیسرا اسم مبارک 'رحمان' اس کے معنی دنیا میں ہر ایک پر نہایت مہربانی کرنے والا۔ذاتِ حق کے چشمۂ رحمانیت کا فیض بھی زیادہ تر اسی دنیا سے تعلق ہے اس لئے 'رحمٰن' اور 'اِھد نا' کے باہمی تعلق کی بنا پر بندے کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ ہر قدم پر راہِ راست طلب کرنے کا تعلق بھی ذاتِ باری تعالیٰ سے ہی قائم کیا جائے۔چوتھا اسم مبارک رحیم بیان ہوا جس کا اطلاق ایک اعتبار سے آخرت کی رحمت پر ہوتا ہے۔دنیا کی رحمت تو انسان کے عمل اور سیرت و کردار کے حوالے کے بغیر ہی میسر آ جاتی ہے۔کیونکہ یہ رحمت مخلوقات کو زندہ رکھنے کے لئے ہے۔پانچواں اسم مبارک مالک ہے۔اس کا بیان بالخصوص جزا و سزا کے دن کی مالکیت کے حوالے سے کیا گیا ہے۔مقامِ بندگی بارگاہ ایزدی میں سراسر عاجزی اور نیازمندی کا نام ہے۔یہی وہ مقام ہے جہاں بندہ خدا کا محبّ ہونے کے علاوہ اس کا محبوب بن جاتا ہے اور قدرت الٰہی ہر گھڑی اس کی ہر آرزو کی تکمیل کرتی ہے۔

اسمائے خمسہ اور معراجِ انسانی

1- خلق 2- تربیت 3- بقاء 4- تکمیل 5- نقلِ روح

باری تعالیٰ کا اسم اللہ اس کی شانِ خالقیت پر دلالت کرتا ہے۔لہٰذا انسان کو فیضانِ الوہیت سے خلعتِ وجود نصیب ہوئی تو اس کی خلق کا ظہور ہوا۔اس کے بعد انسان کی تربیت کی گئی یعنی اسے اعلیٰ مقام کی طرف پرواز کے قابل بنایا گیا۔یہ باری تعالیٰ کی ربوبیت کا فیضان تھا۔اس کے بعد انسان کو اس دنیا میں بقا عطا کی گئی اور اس کے مصالح و حکم سے نوازا گیا۔یہ باری تعالیٰ کی رحمانیت کا فیضان تھا۔اس کے بعد اسے منزل تک پہنچایا جاتا ہے۔آخر میں انسانی روح عالمِ شہادت سے عالمِ برزخ کی طرف اور بعد ازاں عالمِ آخرت کی طرف منتقل ہو جائے گی۔یہ اس کی مالکیت کا فیضان ہے۔

رب العالمین کے الفاظ سے مرتبہ تربیت کا پردہ اٹھتا ہے اور انسان خدا کے جلوں کو رحمانیت کے روپ میں آشکار دیکھتا ہے۔ الرحیم کے الفاظ سے مرتبہ کمال کا پردہ اٹھتا ہے اور انسان خدا کے جلوں کو رحیمیت کے روپ میں آشکار دیکھتا ہے۔ جب انسان نے خلق و تربیت، بقاو کمال اور نقل روح ہر مرحلے پر خود کو تصورِ ذات میں گم کردیا بلکہ اپنی ہستی کو اس کی ہستی کے تصور میں فنا کردیا تو اسے مشاہد حق نصیب ہو گیا۔ یہی مقام مشاہدہ انسان کی حقیقی معراج ہے۔ لیکن مقامِ شہود کی یہ معراج فنائے تام کے بغیر نصیب نہیں ہوسکتی۔ یہ معراج جو سورۃ فاتحہ کی چوتھی آیت کے مقام پر نصیب ہو رہی ہے۔ حدیثِ رسول ﷺ میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ جبرئیل نے عرض کی:

ماالاحسان (یارسول اللہ ! احسان کیا ہے) حضور ﷺ نے فرمایا:

الِاحسان ان تعبد اللہ کا نک تراہ فِان لم تکن تراہ فانہ یراک۔ (صحیح بخاری، ۱:۱۲، کتاب ایمان ،رقم:۵۰)

احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس حال میں کرے کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ پھر اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو بے شک وہ تجھے دیکھتا ہی ہے۔

''اِیاک نعبدُ'' سے قبل 'مالِکِ یومِ الدِین' وارد ہوا ہے۔ یہ آیت مرتبہ نقل روح کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ یعنی انسان کے دارِ دنیا سے دارِ جزا کی طرف منتقل ہو کر بارگاہ ایزدی میں حاضری کا ذکر کیا جارہا ہے۔ اس کے فورا بعد انسان اپنا کلام غیابت سے حضوریت کے صیغے کی طرف منتقل کرتا ہے۔ گویا وہ دارِ فانی کو چھوڑ کر جب دارِ بقا میں اپنے ربِ کریم کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے اور اس کے جلوذات کا دیدار کرتا ہے تو انسان کا بارگاہِ ایزدی سے دوری کے بجائے قرب، غیب کی بجائے حضور اور محروم دیدار کی بجائے شرفِ وصال سے نوازا جانا ہی حقیقی معراج ہے۔

سورۃ فاتحہ اور پانچ بنیادی ضابطے

ا۔ سورۃ فاتحہ اور ضابطۂ عبادت

۲۔سورۃ فاتحہ اور ضابطۂ استعانت

۳۔سورۃ فاتحہ اور ضابطۂ طلبِ ہدایت

۴۔سورۃ فاتحہ اور ضابطۂ طلبِ استقامت

۵۔سورۃ فاتحہ اور ضابطۂ طلبِ نعمت

۱۔سورۃ فاتحہ اور ضابطۂ عبادت

تمام عبادت میں سے اعلیٰ وارفع عبادت نماز ہے، جو سات ظاہری اعمال سے مرکب ہے۔

تکبیرِ تحریمہ۔ قیام۔ رکوع۔ قومہ۔ سجدہ۔ جلسہ،سجدہ۔ قعدہ اخیرہ

۲۔سورۃ فاتحہ اور ضابطۂ استعانت

یہاں عبادت کو استعانت پر مقدم رکھا گیا ہے۔اگر باری تعالیٰ کی مدد شامل حال نہ ہو تو انسان کو تو فیقِ عبادت ہی نصیب نہیں ہوتی ۔ یہ آیت بندے اور خدا کے درمیان دو جہتی تعلق کو بیان کرتی ہے۔

(1) حقِ الوہیت (باری تعالیٰ کا حق)

(2) حقِ عبودیت (بندے کا حق)

خدا کا حق یہ ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔اور بندے کا حق یہ ہے کہ اس کی مدد واعانت کی جائے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ہمارے اوپر مومنوں کی مدد کرنا لازم ہے۔

سورۃ فاتحہ کا یہ اسلوب درحقیقت انسانوں کو یہ تعلیم دے رہا ہے کہ تم بندے ہو، تمہیں اپنی فکر نہیں ہونی چاہیے۔تمہارا کام اپنے آقا و مالک کو منانا ہے۔اس کی رضا و خوشنودی کا حصول ہے۔اس کی عبادت واطاعت ہے۔اس کے حق کی ادائیگی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے: صبر اور نماز کے ذریعے مدد طلب کرو۔

صبر مشکلات ومصائب پر خوش رہنے کا نام ہے اور صلوۃ اس کا شکر بجالانے کا۔ صبر وصلوۃ در حقیقت بندگی کا امتحان ہے۔

۳۔ سورۃ فاتحہ اور ضابطۂ طلبِ ہدایت

ہدایت کی کئی استعدادیں انسان کے اندر بھی حیقیء اور طبعی طور پر ودیعت کی گئی ہیں۔

۔ فطری ہدایت ..... جو انسان کو جبلی طور پر پیدائش کے وقت سے میسر ہوتی ہے۔

۲۔ حسی ہدایت ..... جو انسان کو حواسِ خمسہ کے ذریعے نصیب ہوتی ہے۔

۳۔ عقلی ہدایت ..... جو انسان کو عقل کی بناپر غور وفکر سے نصیب ہوتی ہے۔

۴۔ وجدانی ہدایت .... جو انسان کو صفائے قلب کے باعث روحانی طور پر نصیب ہوتی ہے۔

انسانی عقل کا فیصلہ ظن ہے اور ہدایتِ ربانی کا فیصلہ حق۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئاً۔ (النجم ۵۳:۲۸)

بیشک ظن، حق کی جگہ ذرہ بھر فائدہ نہیں پہنچا سکتا) یعنی ظن بالکل حق کی جگہ نہیں لے سکتا۔

قرآن مجید نے اللہ تعالی کے انعام یافتہ بندوں کے چار طبقات بیان کئے ہیں۔

1-انبیا 2-صدیقین 3-شہداء 4-صالحین

۴۔ سورۃ فاتحہ اور ضابطۂ طلبِ استقامت

حقیقت یہ ہے کہ ایک مرتبہ ہدایت میسر آجانے سے بات ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے بعد اس ہدایت پر ثابت قدم رہنا، اس سے بھی نازک مسئلہ ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم صرف ہدایت ہی نہیں بلکہ استقامت کی بھی راہ دکھلاتا ہے۔ چنانچہ نیک لوگوں سے خدا کے لئے محبت ومصاحبت روزِ قیامت بھی باعث سعادت ونجات ہوگی۔

۵۔ سورۃ فاتحہ اور ضابطۂ طلبِ نعمت

جب انسان حالتِ نماز میں کھڑا ہو کر ذکرِ الٰہی کرتا ہے اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت میں مشغول ہوتا ہے

تو اس پر خدا کی نعمتوں کے سب دروازے کھل جاتے ہیں۔ جنت کے آٹھ دروازے ہیں:

1-باب المعرفت 2-باب الذکر 3-باب الشکر 4-باب الرجاء 5-باب الخوف

6-باب الاخلاص 7-باب الدعاء 8-باب الاقتداء (کمافی التفسیر الکبیر)

جب انسان نماز میں داخل ہو کر **سبحانك اللهم وبِحمدِك وتبارك اسمك وتعالى جدك ولا اِله غيرك** کے الفاظ میں ذاتِ باری تعالیٰ کی ثنا کرتا ہے تو اس پر جنت کا پہلا دروازہ باب المعرفہ کھول دیا جاتا ہے۔ جب وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے کلمات پر پہنچتا ہے تو ان برکت سے اس پر جنت کا دوسرا دروازہ 'باب الذکر' کھول دیا جاتا ہے۔ کیونکہ بسم اللہ باری تعالیٰ کا اعلیٰ ذکر ہے۔ اس کے بعد وہ الحمد للہ رب العلمین کہتا ہے۔ تو اس پر جنت کا تیسرا دروازہ 'باب الشکر' کھلتا ہے۔ اور اسے شکر کی نعمتوں سے نواز دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ الرحمٰن الرحیم کہتا ہے یہ خدا کی رحمت کا ذکر ہے اور رحمت کی بنا پر کسی سے امید وابستہ ہوتی ہے۔ اس لئے اس پر جنت کا چوتھا دروازہ 'باب الرجاء' (امید کا دروازہ) کھول دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ مالک یوم الدین کہتا ہے تو اس پر جنت کا پانچواں دروازہ 'باب الخوف' کھلتا ہے۔ اور انسان خوفِ الٰہی کی نعمتوں اور برکتوں سے نوازا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اِیاک نعبد و اِیاک نستعین کہتا ہے۔ تو اس پر جنت کا چھٹا دروازہ 'باب الاخلاص' کھول دیا جاتا ہے۔ جس کے ذریعے اسے عبودیت اور ربوبیت کی معرفت میں اخلاص نصیب ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اِھدنا الصراط المستقیم کہتا ہے تو اس پر جنت کا ساتواں دروازہ 'باب الدعاء' کھل جاتا ہے۔ جس سے وہ دعا کی نعمتوں اور برکتوں سے نوازا جاتا ہے۔ جب وہ آخر میں صراط الذین انعمت علیھم کہتا ہے تو اس پر جنت کا آٹھواں دروازہ 'باب الاقتداء' کھل جاتا ہے۔ جس کے باعث وہ صلحاء واولیاء کی نیک روحوں کی اقتدا میں علیین کے اعلیٰ مقامات میں داخل ہوتا ہے۔

سورۃ فاتحہ بطور اجمالِ قرآن: معارف قرآن کے بے کنار سمندر کو خود ہی بصورت فاتحہ

کوزے میں بند کر دیا ہے۔اگر ایسا اہتمام نہ کیا جاتا تو قرآن کا اس قدر جامع اور موجز خلاصہ کا وشِ انسانی سے کبھی بھی تیار نہ ہوسکتا۔یہ سورۃ انسانی زندگی میں روزانہ ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھتا ہے۔اس کے علاوہ بھی کئی مواقع پر اس کی تلاوت کرتا ہے اور مر جانے کے بعد دوسرے لوگ بھی اس کی خاطر یہی سورۃ پڑھتے رہتے ہیں۔چنانچہ یہ سلسلہ ہمیشہ اسی طرح جاری رہتا ہے اور سورۃ فاتحہ کا تعلق انسان سے کبھی بھی منقطع نہیں ہونے پاتا۔اسی لئے قرآن مجید نے اس سورۃ کا نام 'سبعا من المثانی' رکھا ہے۔صفحہ (۳۴۵)

سورۃ فاتحہ کے اجمالِ قرآن ہونے کی پہلی وجہ

جب انسان کائنات میں ہر طرف اپنے خالق و مالک کے احسانات وانعامات کا غیر محدود سلسلہ دیکھتا ہے اور اپنے اوپر اپنے رب کی نوازشات بغیر کسی صلے کے محسوس کرتا ہے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ میں انتہائی عاجزی اور مسکنت کے ساتھ اس کی بندگی کروں۔جذبہ شکر کی اسی تحریک سے اس کی بارگاہ میں کمال خضوع کے ساتھ جھک جانا عبادت کہلاتا ہے، یعنی شکر کا جذبہ بندے کو اپنے رب کی عبادت پر اکساتا ہے۔پھر یہی عبادت استعانت کے لئے زوردار محرک بن جاتی ہے۔
سب سے پہلے انسان نے اپنی جبلی استعداد سے سوال کیا کہ خدا کو پانے کا راستہ کیا ہے؟ لیکن جبلی ہدایت نے یہ کہہ کر معذوری ظاہر کردی کہ میری پرواز اس حد سے آگے ممکن نہیں۔پھر انسان حواس خمسہ کی طرف متوجہ ہوا لیکن حسی ہدایت نے بھی کوئی راہنمائی نہ کی، اور یہ جواب دیا کہ جو ہستی میرے ادراک سے ماوراء ہے میں اس کی طرف صحیح راہنمائی کیسے کرسکتی ہوں۔پھر انسان نے عقل و خرد کا دروازہ کھٹکھٹایا، لیکن عقلی ہدایت نے یہ کہہ کر کہ میں چراغ راہ ہوں، منزل نہیں ہوں خاموش ہوگئی۔انسان نے وجدانی و روحانی استعداد کا دامن بھی تھاما لیکن وہ بھی یقینی قطعی علم مہیا نہ کرسکی۔
یہاں انسان ورطہ حیرت میں گم تھا، پریشان و مضطرب تھا اور زبانِ حال اسے پکار رہا تھا کہ میری نفسی صلاحیتیں اور استعدادیں مجھے منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکیں۔جب انسان نے اس مقام پر

اپنی بے بس کا اعتراف کرلیا تو عالم امر سے ندا آئی کہ اب بارگاہِ رب العزت سے ہی سوال کر کہ تجھے راہِ حق نصیب ہو چنانچہ انسان حکمِ الٰہی کے مطابق پکار اٹھا۔ اِھد نا الصراط المستقیم اے باری تعالیٰ ! میں ہر طرف سے مایوس ہو چکا ہوں، اب تو ہی مجھے اپنی راہ کی ہدایت عطا کر۔ اس پر جنابِ الٰہی سے جواب آیا، اے انسان ! میں نے عالمِ انسانیت کو اپنی راہ اور اپنی بارگاہ تک پہنچانے کے لئے کائنات میں نبوت و رسالت کا نظام بپا کر رکھا ہے، تو عقل و خرد کے تراشیدہ آستانوں کو چھوڑ کر آستانہ نبوی ﷺ پر جھک جا۔ نبوی ہدایت کی روشنی سے ہی تجھے میری راہ مل جائے گی۔ مجھ تک پہنچنے کے لئے دامنِ نبوت سے وابستہ ہو جا۔ انعام یافتہ بندوں کی اصطلاح میں خود قرآن ہی نے دوسرے مقام پر چار طبقات کو شامل کر دیا تھا کہ خدا کو پانے کی راہ انعام یافتہ بندوں کی راہ ہے اور انعام یافتہ بندوں میں انبیا کرام کے علاوہ ان کے پیروکاروں میں سے صدیقین، شہدا اور صالحین بھی شامل ہیں۔ صدیقین، شہدا اور صلحا یہاں تینوں طبقات میں اہلِ علم و تحقیق کو اس لئے صراحتاً شامل نہیں کیا کیونکہ ان کے ہاں تحقیقی اور علمی اختلاف کی گنجائش ہے۔ جس سے عوام کو پریشانی لاحق ہو سکتی ہے لیکن اہلِ دل اور اہلِ نظر) یعنی امت کے صدیق، شہدا اور صالحین (کا مشرب چونکہ مشربِ تسلیم ہے، اس لئے وہاں فکری انتشار کا اندیشہ باقی نہیں رہتا، چنانچہ طالبانِ ہدایت اور سالکانِ راہِ حق کو یہی تعلیم دی جا رہی ہے۔

سورۃ فاتحہ کے اجمالِ قرآن ہونے کی دوسری وجہ

اگر قرآن مجید کے تمام مضامین کو سمیٹا جائے تو انہیں بنیادی طور پر تین عنوانات پر تقسیم کیا جا سکتا ہے، توحید، رسالت اور آخرت۔ کائنات و عوالم کے جس گوشہ کو بھی قدرت نے اپنے فیضان ربوبیت سے پالا ہے، بلاشبہ وہی گوشہ وجود مصطفوی ﷺ کی رحمت سے مستفید و مستنیر ہو رہا ہے، خواہ وہ وجود اور گوشہ عالم امر سے متعلق ہو یا عالمِ خلق سے، عالمِ ارواح سے متعلق ہو یا عالمِ شہادت سے، عالمِ برزخ سے متعلق ہو یا عالم آخرت سے، وجودِ مصطفوی ﷺ باری تعالیٰ کی ایسی رحمت

ہے جو صرف خود ہی رحمت نہیں بلکہ زحمت کو بھی رحمت میں بدل دیتا ہے۔ مثلاً عذابِ الٰہی، زحمت ہے۔ جو فسق اور کفر پر تحقیق ہوتی ہے، لیکن کفر کے باوجود عذاب اٹھ جائے یا موخر ہو جائے تو یہ بلا شک و شبہ خدا کی رحمت ہے۔ باری تعالیٰ نے کفار و مشرکین اور فاسقین کے بارے میں ارشاد فرمایا:

مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعذِ بَھُم وَ اَنتَ فِیھِم۔(الانفال،۸:۳۳)

اللہ تعالیٰ اسے مناسب نہیں سمجھتے کہ لوگوں کو عذاب دیں درآنحالیکہ آپ ان میں موجود ہوں۔

گویا وجودِ مصطفویﷺ خلقِ خدا کے حق میں بلا استثنا باری تعالیٰ کی ایسی رحمت اور نعمت ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے عذاب جیسی زحمت بھی مرتفع ہو جاتی ہے اور اس زحمت کی جگہ رحمت لے لیتی ہے۔ حضورﷺ کی بعثت کے بعد کسی نئے پیغمبر کی بعثت کی آرزو کرنا سب سے بڑھ کر کفرانِ نعمت ہے کیونکہ جس طرح خدا کی رحمانیت و رحیمیت سے بڑھ کر رحمت کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا اسی طرح وجودِ مصطفویﷺ سے بڑھ کر کائنات میں خدا کی رحمانیت و رحیمیت کی کوئی تصویر نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ذاتِ حق نے بنی نوع انسان پر بالعموم اور مسلمانوں پر بالخصوص بے شمار انعامات و احسانات کیے، لیکن کبھی بھی کسی پر اپنا احسان نہ جتایا مگر نبی اکرمﷺ کی بعثت کا ذکر مومنوں پر احسان جتا کر کیا اور برملا یہ ارشاد فرمایا:

لقد من اللہ علی المؤمنین اِذ بعث فیھم رسولاً مِن انفُسِھِم ۔(آل عمران،۳:۱۶۴)

بے شک اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان پر بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں انہی میں سے رسول (حضرت محمدﷺ) کو مبعوث کر دیا ہے۔ شرک دو ہی صورتوں میں ہو سکتا ہے، ذات میں یا صفات میں عبادت میں اخلاص، توحید ذات ہے اور استعانت میں اخلاص توحید صفات ہے۔ وہ چیز جو خدا کے وجود کے اعتراف کو ایمان باللہ میں اور اس کی وحدت کے اعتراف کو عقیدہ توحید میں بدلتی ہے، وہ بھی تعلیم رسالت ہے۔ اس کے بغیر ہر چیز پایہ اعتبار سے ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ سند ایمان

کے طور پر لَا اِلٰـهَ اِلا اللّٰـه کے دعویٰ کی صرف ایک ہی قطعی دلیل ہے اور وہ مُحمّدٌ رَسُولُ اللّٰه ہے۔ (تفسیر منہاج القرآن جز اول صفحہ ۱۵۱)

سورۃ فاتحہ کے اجمالِ قرآن ہونے کی تیسری وجہ

قرآنی مطالب و تعلیمات کا منتہائے مقصود انسان کی اصلاح اور اس کی زندگی کو دنیا و آخرت میں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرنا ہے۔ نظامِ فکر و عمل جو پورے قرآن حکیم کی تعلیمات کا نچوڑ اور لبِ لباب ہے، درج ذیل آٹھ (8) نکات پر مشتمل ہے۔

1- صحتِ اعتقاد 2- اخلاصِ عمل 3- فکرِ احتساب و مسئولیت 4- منزلِ مقصود کا صحیح تعین 5- جدوجہد میں عزم راسخ اور استقامت 6- کامیابی کا پختہ یقین و اعتماد 7- اہلِ حق کی پہچان اور ان کی مصاحبت 8- اہلِ باطن کی پہچان اور ان سے عدم تعاون

سورۃ فاتحہ کی اسی جامعیت کے باعث اسے قرآن کا دیباچہ یا باب اول ہونے کا شرف حاصل ہے۔

سورۃ فاتحہ بطورِ تفصیلِ تسمیہ

تسمیہ ہر کام کے آغاز سے انجام تک باری تعالیٰ پر توکل کا درس دیتی ہے۔ فاتحہ بھی ہر معاملے میں اول سے آخر تک خداشناسی و خداپرستی کا درس دیتی ہے۔ تسمیہ خداپرستی کا عنوان ہے لیکن سورۃ فاتحہ اس کا مکمل مضمون ہے۔ تسمیہ میں صرف اسمِ ذات اللہ سے آغاز کیا گیا ہے۔ لیکن فاتحہ میں 'اللہ' کی شانِ الوہیت کا تفصیلی بیان بھی موجود ہے۔ علیٰ ھذا القیاس تسمیہ نے انسانی زندگی کی ابتدا سے انتہا تک پورے ضابطہ و نظام کی بنیاد فراہم کی تھی کہ اللہ انسانی زندگی میں سیاسی قوت کا سرچشمہ ہے الرحمٰن انسانی زندگی میں معاشی بقا کا سرچشمہ ہے اور الرحیم انسانی زندگی میں مذہبی استحکام کا سرچشمہ ہے۔

سورۃ فاتحہ نے سیاست، معیشت اور مذہب پر مشتمل پورے نظامِ زندگی کی تفصیل مہیا کر دی۔ ہم

بڑے وثوق سے اس امر کا اظہار کر سکتے ہیں کہ تسمیہ اجمال ہے اور فاتحہ اس کی تفصیل یا تسمیہ عنوان ہے اور فاتحہ اس کا مضمون ہے۔

سورۃ فاتحہ سے ارکانِ ایمان پر اِستدلال

نیکی کی تعریف کرتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَلٰکِنَّ الْبِرَّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ۔ (البقرہ۲:۱۷۷)

بلکہ اصل نیکی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور) اللہ کی (کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائے۔

ایمان باللہ:

خدا کے ہونے بلکہ اس کے صرف ایک ہونے پر ایمان لانا اور اسے ہر قسم کے شریک سے منزہ تصور کرتے ہوئے ساری کائنات کا خلق و مالک اور پروردِگار سمجھنا ایمان باللہ کا بنیادی مفہوم ہے۔اسلامی اعتقاد کا یہ پہلا جزو ہے جس سے اسلام کا خمیر اٹھتا ہے۔

ایمان بالکتب:

خدا کی عبادت واستعانت ہی وہ تعلیم ہے، جو ہمیں آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے ذریعے نصیب ہوتی ہے۔اسی پر یقین فی الحقیقت ایمان بالکتب کی روح ہے۔

ایمان بالملائکہ:

ملائکہ کا وجود نظامِ رسالت کا ہی ایک حصہ ہے۔ اس لئے ان پر ایمان لانا عین تقاضائے عقیدہ رسالت ہے۔ وہ اس حقیقت سے صرف نظر کر بیٹھتے ہیں کہ سائنسی تحقیق کا دائرہ کار صرف طبیعی کائنات اور اس کے حقائق تک محدود ہے۔اس کا مابعد الطبیعی حقائق اور ماورائے

محسوسات سے کوئی تعلق نہیں۔ ملائکہ ہوں یا عالمِ آخرت، وجودِ رسالت ہو یا ہستی باری تعالی، یہ سب چیزیں ماورائی حقیقتیں ہیں۔ ہر شخص کو اس حقیقت سے آگاہ رہنا چاہیے کہ مذہب کے باب میں صحیح اور حتمی فیصلہ صاحبِ نبوت کا قول ہے۔ خواہ وہ قرآن سے ثابت ہو یا حدیث سے۔ سائنس تو صرف کائنات کی طبعی حقیقتیں منکشف کرنے کا عمل ہے اور وہ بھی تقریباً اسی فیصد (80) ظنی ہے۔

ایمان بالقدر:

اس سے مراد یہ عقیدہ رکھنا ہے کہ خیر وشر کی قدرت انسانوں کو باری تعالی کی طرف سے حاصل ہوتی ہے۔ قادرِ مطلق صرف اللہ ہے، انسان نہیں۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ یہ قدرت انسانوں کے عزم وارادے میں دخل انداز نہیں ہوتی کیونکہ اس سے اس کا اختیار سلب ہو جاتا ہے۔ پھر وہ نہ اپنے کیے کا ذمہ دار رہتا ہے اور نہ بارگاہِ ایزدی میں جوابدہ۔ لہذا انسان اپنے عمل کا کاسب ضرور ہے، خالق نہیں۔ جزا وسزا سب کچھ اس کے کسب کا نتیجہ ہے۔ جس میں وہ کلیتاً مختار اور صاحبِ ارادہ ہے۔

اگر راہِ ہدایت کو سمجھنا اور اپنانا یا راہِ ضلالت کو سمجھنا اور اپنانا انسان کی اپنی ذمہ داری نہ ہوتی تو وہ ان میں سے کسی کے کسب کی بنا پر بھی نہ جزا کا مستحق ہو سکتا ہے نہ سزا کا۔ اس کا مستحق جزا (انعمت علیھم) اور مستحقِ سزا (مغضوب علیھم) ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سورۃ فاتحہ کے مضمون کے مطابق انسان ہر دو راستوں کو اپنانے اور ان کا صلہ وانجام پانے کا ذمہ دار ہے۔ یہ ذمہ داری، بغیر ارادہ واختیار کے ممکن نہیں۔ اگر انسان کو یہ حاصل نہ ہو تو وہ ذمہ دار نہ رہا۔ اگر ذمہ دار نہ ہو تو باری تعالی کے سامنے جوابدہ نہ رہا۔ اگر جوابدہ نہ ہو تو جزا وسزا کا کوئی سوال نہ رہا۔ اگر جزا وسزا نہ ہو تو حشر ونشر کا کوئی وجود نہ رہا۔ اگر حشر ونشر نہ ہو تو حیات بعد الموت کا کوئی تصور نہ رہا۔ اگر حیات بعد الموت نہ ہو تو قیامت کا وجود نہ رہا۔ اگر قیامت کا وجود نہ ہو تو عالمِ آخرت باقی نہ رہا۔ اگر عالمِ آخرت نہ ہو تو

اس دنیوی زندگی کا کوئی مقصد نہ رہا۔ اگر اس دنیوی زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو تو نظامِ رسالت کی کوئی ضرورت نہ رہی اور اگر نظامِ رسالت نہ ہو تو وجودِ خدا کی کوئی معرفت باقی نہ رہی۔

سورۃ فاتحہ سے ارکانِ اسلام پر استدلال

ایمان فی الحقیقت توحید و رسالت کے اقرار و تصدیق ہی کا نام ہے اور یہی اسلام کا پہلا رکن ہے۔ اہلِ علم وعمل جانتے ہیں کہ ایمان کی پرورش و تربیت اور اس کی ترقی و کمال کا اعلیٰ منہاج نماز ہے۔ لہٰذا اسم رب کی تجلی سے بندہ نماز کی حقیقت کو پاتا ہے۔ رحمانیت کے انوار کی تجلی انسان کو زکوۃ کی حقیقت سے آشنا کرتی ہے اور وہ بھی ذاتِ رحمان کی طرح پیکرِ رحمت بن جاتا ہے۔

اسم رحیم میں مانگنے والوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا اور ان سے لطف و کرم کے ساتھ پیش آنا شامل ہے۔ روزہ التزام نیت کے ساتھ صبح سے شام تک کھانے پینے اور بعض دیگر حوائجِ انسانی سے پرہیز کرنے کا نام ہے۔ روزہ انسان کی شخصیت کو رحیمیت کے نور سے منور کرتا ہے۔ اس لئے اسم رحیم کی تجلی مسلمانوں کو اسلام کے چوتھے رکن صومِ رمضان کی حقیقت عطا کرتی ہے۔

قیامت کا دن فی الواقع تمام انسانوں کی حقیقی ہجرت کا دن ہے۔ یہ وہ دن ہے جب تمام لوگ اپنے وطن، گھر بار، اعزا و اقارب اور دنیوی تعلقات کو چھوڑ کر الگ تھلگ اور خالی ہاتھ محض مسافروں کی طرح بارگاہِ ایزدی میں حاضر ہوں گے۔ اس آیت کی تجلی سفرِ حج کی حقیقت عطا کرتی ہے۔ سورۃ فاتحہ ارکانِ اسلام کی حقیقت بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اگر انسان ان پانچ خصوصیات کو اپنے اندر پیدا کر کے راسخ کرے تو وہ یہ سمجھے کہ اس نے ارکانِ اسلام کی روح اور سورۃ فاتحہ کی حقیقت کو پا لیا ہے اور بیشک یہی انسانیت کا کمال ہے۔

سورۃ فاتحہ اور تشکیلِ شخصیت کے سات مراحل

ا۔ انسان ..... عالمگیر انسانی اخوت کا پیکر

۲۔انسان ..... رحمت اور شفقت کا پیکر

۳۔انسان ..... عدالت اور امانت کا پیکر

۴۔انسان .... استغنا اور عزتِ نفس کا پیکر

۵۔انسان ..... تواضع اور نیاز مندی کا پیکر

۶۔انسان .... اعتدال اور توازن کا پیکر

۷۔انسان .... حق و باطل کے درمیان واضح امتیاز کا پیکر

ا۔انسان: عالمگیر انسانی اخوت کا پیکر

غیر ذی شعور مخلوق، حیوانات ہوں یا جمادات و نباتات، جن کو مانگنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ ہر کسی کو اس کی عالمگیر ربوبیت کا فیض میسر آ رہا ہے۔اس کی بارگاہ میں پہنچ کر سب عصبیتیں اور محدود گروہی وفاداریاں، سب رنگ و نسل کے امتیازات اور طبقاتی تفاوت مٹ کر ایک وحدت میں گم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس کی ربوبیت سب کے لئے یکساں ہے۔سورۃ فاتحہ کی پہلی آیت انسان کا دامن پکڑ کر تنبیہ کرتی ہے کہ تو بھی اپنے رب کریم کی آفاقی ربوبیت کا مظہر بنتے ہوئے پوری انسانیت کے لئے پیکرِ اخوت بن جا، نفرتوں اور عصبیتوں کے وہ تمام بت جو محدود ذاتی مفادات کی خاطر تراشے گئے ہیں توڑ دے۔ انسانی عظمت کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ انسان تنگ نظری، تعصب اور محدود سوچ کا حامل ہو جائے۔ اگر عمل، اخوت و محبت کے بجائے وحشت و بربریت پر دلالت کرے اور زبان و قلم پر وحدت و اخوت کے نعرے ہوں تو اس کی حیثیت محض دجل و فریب کی سی ہے۔ جس سے ہر ایک کو دھوکے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ (تفسیر منہاج القرآن جز اول صفحہ ۳۶۵)

۲۔انسان: رحمت و شفقت کا پیکر

رحمتِ الٰہی کا ذکر قرآن مجید میں صریح الفاظ کے ساتھ تین سو (300) سے زائد مقامات پر آیا ہے۔ اگر ایسے تمام مقامات جمع کر لیے جائیں جہاں اگرچہ لفظ رحمت صراحت کے ساتھ استعمال

نہیں ہوا۔لیکن بیانِ مضمون، رحمت کا ہی ہوا ہے۔مثلاً اس کی ربوبیت، مغفرت، رافت، کرم، عفو ،حلم اور دیگر انعامات ایزدی جو دنیا و آخرت میں بندگان خدا کے لئے مقرر کیۓ گئے ہیں تو ان کی تعداد، شمار سے ماورا ہو جاتی ہے اور بیان رحمت اتنا پھیل جاتا ہے کہ پورا قرآن، ہی مضمون رحمت کا بیان دکھائی دیتا ہے۔

اسلام نے انسان کے اندر خدا پرستی کی بنیاد جلال پر نہیں، جمال پر رکھی ہے۔قہر و غضب پر نہیں، رحمت و رافت پر رکھی ہے۔خوفِ سزا پر نہیں لطفِ عطا پر رکھی ہے۔وحشت پر نہیں محبت پر رکھی ہے، یہاں تک کہ تصورِ جزا پر بھی نہیں، تصویرِ رضا پر رکھی ہے۔صفتِ رحمت سے تخلیق ہی انسانیت کا کمال ہے۔انسانی اخلاق کا چراغ بھی صفاتِ الہیہ سے ہی روشن ہوتا ہے۔قرآن حکیم میں باری تعالی نے ہیں نے بیس سے زائد مقامات پر گناہ گار انسانوں کو عبادی (میرے بندو) یا یا عبادی)اے میرے بندو (کے الفاظ سے خطاب کیا ہے۔جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا:

قُل یٰعِبَادِیَ الَّذِینَ اسرَفُوا عَلٰی اَنفُسِهِم ۔ (الزمر،۳۹:۵۳)

فرمادیجئے پیارے نبی ﷺ !اے میرے گناہگار بندو۔

۳۔انسان: عدالت و امانت کا پیکر

یوم حقیقی معنوں میں یوم عدل ہوگا۔کیونکہ ہر حقدار کو حق مل جائے۔ہر شخص کو وہی مقام ملے جس کا وہ حقیقت میں مستحق اور اہل ہے، تو اس عمل کو عدل کہتے ہیں۔اگر حق دار کو صحیح مقام نہ ملے یا غیر اہل کو وہ مقام مل جائے جس کا وہ حقدار نہ تھا، تو اس کا نام ظلم ہے۔

انسان کو قوت و امانت کا حامل بھی ہونا چاہیے۔وہ اپنی اخلاقی شخصیت کے اعتبار سے اس قدر مضبوط، پختہ اور طاقت ور ہو کہ ظالم کو صحیح انجام تک پہنچا سکے اور مظلوم کی دادرسی بھی کر سکے۔وہ اپنے بچاؤ کے لئے بھی کسی کو نشانۂ ستم نہ بننے دے، یہاں صرف رحمت نہیں بلکہ رحمت کے ساتھ قوت و امانت اور طاقت سزا بھی ہونی چاہیے۔ظالموں کو اپنے انجام سے باخبر رکھنے کے لئے بتایا

جارہا ہے کہ میں صاحبِ رحمت ضرور ہوں لیکن صفتِ رحمت کمزوری نہیں کہ میں عذاب کے حقداروں کو عذاب نہ دے سکوں۔سن لو ! میں جبار وقہار بھی ہوں۔میری عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ مظلوموں کو جزا اور رحمت ملے اور ظالموں کو سزا اور قہر وغضب، میری ہستی اپنی صفات کے اعتبار سے متوازن ہے غیر متوازن نہیں۔اس لئے باری تعالی نے اپنی ربوبیت کو دو صفات سے متصف کر کے بیان کیا ہے۔صفتِ رحمت اور صفتِ مالکیت وعدالت۔یعنی میری رحمت اور عدالت دونوں مل کر نظامِ ربوبیت کو چلا رہی ہیں۔اگر دونوں میں سے ایک بھی مفقود ہو جائے تو ربوبیت کا نظام درہم برہم ہو جائے۔سورۃ فاتحہ انسان کی شخصیت کی تشکیل کے لئے تیسرا اصول عدالت اور امانت مہیا کرتی ہے۔

نہ کسی امیر کی امارت، دولت مندی اور اثر ورسوخ تمہیں عدل سے انحراف کرنے دے اور نہ کسی غریب کی غربت، بے کسی اور قابلِ ترس حالت۔عدل امیری اور غریبی دونوں حالتوں سے ماورا ہے۔یعنی محض ان حالتوں سے متاثر ہو کر عدل نہ کرنا، خود ظلم ہے۔انسان کو اسی ظلم سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔عدل کے معنی برابر ہونے کے ہیں۔اگر رحمت اور مواخذہ دونوں برابر ہیں تو یہ عدل ہے۔اگر ان میں سے ایک بھی کم ہے تو یہ ظلم ہے۔ماں کی ممتا ہو یا شفقت پدری ہو اور بچے کی غلطی پر اس کا مواخذہ وتادیب نہ ہو تو اس بچے کی صحیح پرورش نہیں ہو سکتی۔صحیح پرورش کے لئے شفقت اور تادیب دونوں کا امتزاج ضروری ہے۔اسی کا نام عدالت ہے اور یہی شخصیت کے متوازن کا مقصود ہے۔قرآن کا مردِ مومن بھی قوی وامین ہے۔بدھ مت اور جین مت کی تعلیمات کی طرح محض شفیق نہیں کہ وہ شفقت، مستقل کمزوری اور عملی زندگی میں ناکامی کا باعث بن جائے۔اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مردِ مومن شفقت ورحمت کا ایسا پیکر ہو کہ طوفانوں کے بھی دل دہل جائیں۔

۴۔انسان: استغناوعزتِ نفس کا پیکر

انسان پوری دنیا کے ناخداؤں اور فرعونوں کے سامنے یہ برملا اعلان کردے۔نہ میرا سر خدا کے سوا

کسی اور کے سامنے جھک سکتا ہے اور نہ میرا دست طلب خدا کے سوا کسی اور کے سامنے دراز ہو سکتا ہے۔ یہاں پہنچ کر انسان زبردست انقلابی شخصیت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ سورۃ فاتحہ اس کی زبان سے اپنے ربِ عظیم کے حضور یہ اقرار کرواتی ہے کہ اے اللہ ! میں تیرے سوا دنیا کی ہر طاقت سے مستغنی ہوں۔ یہی میری بندگی ہے اور یہی میری زندگی۔

۵۔ انسان: تواضع و نیاز مندی کا پیکر

سورۃ فاتح انسانی شخصیت کی صحیح تشکیل کے لئے اسے استغنا اور عزتِ نفس کی تعلیم دے کر اب تواضع اور نیاز کا درس دے رہی ہے۔ سورۃ فاتحہ کے ذریعے انسان کو بارگاہِ ایزدی میں سراسر تواضع اور نیاز مندی کا پیکر بننے کا سبق دیا جا رہا ہے تاکہ انسان کے اندر استغنا کا تصور رفتہ رفتہ غرور و تکبر میں نہ بدل جائے۔ عدم التفات اور بے پرواہی کا وطیرا اگر فرعون صفت، طاقتور اور ظالم و جابر افراد کے ساتھ روا رکھا جائے تو اس کا نام استغنا ہے۔ اس کے برعکس یہی وطیرہ کمزور، غریب اور بے کس و مظلوم افراد کے ساتھ روا رکھا جائے تو اس کا نام تکبر ہے۔ کیونکہ ارشاد فرمایا گیا ہے:
''التکبر مع المتکبرین عبادہ''۔ متکبر افراد کے ساتھ تکبر کرنا عبادت ہے۔ گویا متکبر افراد سے استغنا نیکی ہے اور کمزور افراد سے استغنا گناہِ عظیم ہے۔ پہلا استغنا انسانی عزت کی علامت ہے اور دوسرا انسانی ذلت کی۔ بندگی کی عظمت یہی ہے کہ بندہ خود کو بارگاہ میں عاجز و ناتواں سمجھے۔

۶۔ انسان: اعتدال و توازن کا پیکر

سیدھی راہ وہ ہے جو انسانوں کے لئے باعث نعمت ہے۔ گویا سیدھی راہ اپنانے سے انسان وبال و عذاب کی صورتوں سے بچ جاتا ہے اور خدا کے دامنِ عافیت میں رہتا ہے۔ یہی اس کی نعمت ہے۔

صِرَاطَ الَّذِینَ اَ نعمتَ عَلَیھِم۔ (ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا)

غَیرِ المَغضُوبِ عَلَیھِم وَلاَ الضَّآلِّین

(ان لوگوں کا نہیں جن پر غضب کیا گیا ہے اور نہ ہی گمراہوں کا)

اگر مذکورہ بالا دونوں آیات کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ راستے تین قسم کے بیان ہوئے ہیں:

۱۔ نعمت کا راستہ

۲۔ غضب کا راستہ

۳۔ ضلالت کا راستہ

جو راستہ باعثِ نعمت قرار دیا گیا ہے وہ درمیانی راستہ ہے کیونکہ اس کی مخالفت دو سمتوں میں ہوا کرتی ہے۔ ایک افراط کی سمت میں اور دوسری تفریط کی سمت میں۔ افراط اور تفریط دونوں سے بچا اعتدال اور توازن کے راستہ میں ممکن ہے۔ چنانچہ اس کا نام راہِ نعمت ہے۔ سورۃ فاتحہ کی اصطلاح میں جو راستہ افراط پر مبنی ہے اسے راہِ غضب اور جو تفریط پر مبنی ہے اسے راہِ ضلالت کہیں گے۔

صاف ظاہر ہے کہ سیدھی راہ پر چلتے ہوئے بھٹکنے کے دو ہی امکانات ہوتے ہیں۔ دائیں یا بائیں۔ دونوں غلط راستوں کے درمیان کی راہ جس میں نہ افراط ہو نہ تفریط درمیانی راہ ہے۔ اپنی زندگی کے جملہ امور کو دونوں طرف کی انتہا پسندی سے بچاتے ہوئے اعتدال و توازن اور میانہ روی کی راہ اختیار کرلو تاکہ منزلِ مقصود کو پاسکو۔ یہ تعلیم درحقیقت قرآنی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ نیکی محض اس عمل کو کہتے ہیں جو حکمِ الٰہی کی اطاعت کی نیت سے صادر ہوا ہو۔ قرآنی فلسفہ یہی ہے کہ برائی کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ حقیقت عدل سے انحراف ہو۔ یہاں تک کہ شرک جو گناہِ عظیم ہے، عقیدے میں اعتدال سے انحراف ہی کا نام ہے۔ شانِ مخلوق میں افراط ہو یا شانِ الوہیت میں تفریط دونوں صورتیں شرک کو جنم دیتی ہیں۔

۷۔ انسان: حق و باطل کے درمیان واضح امتیاز کا پیکر

حق و باطل کے امتیاز کا شعور فطرتِ انسانی میں اصلاً ودیعت کر دیا گیا ہے مگر اصل مسئلہ جو ہدایتِ ربانی کا موضوع تھا اور آج بھی ہے، یہ ہے کہ حق و باطل کا صحیح تعین کس طرح ہو؟ گویا قرآن کی رو

سے ہدایت یہی ہے کہ صدق و کذب، خیر و شر اور حق و باطل کے درمیان ہر سطح پر امتیاز قائم رکھا جائے۔اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ ہدایت حق و باطل کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھنے کا نام ہے اور گمراہی، حق و باطل کے درمیان سمجھوتے کا۔نیکی و بدی اور اچھائی و برائی کے درمیان جس سمجھوتے کا نام ہم نے رواداری، حکمت اور مصلحت رکھ دیا ہے وہ نہ رواداری ہے اور نہ حکمت و مصلحت، بلکہ اس کا نام گمراہی، منافقت اور بے ضمیری ہے کیونکہ ہدایت، ایمان اور ضمیر سب کی آواز ایک ہی ہے کہ حق باطل سے اور باطل حق سے متمیز نظر آئے۔اس کے برعکس اہلِ شقاوت قدم قدم پر بھٹکتے اور ڈگمگاتے ہیں، کذب و باطل کیساتھ سمجھوتے کا نام بصیرت و حکمت رکھتے ہیں اور اپنے کردار میں خیر و نیکی کی خالصیت برقرار نہیں رکھ سکتے۔اگر اہلِ سعادت کی راہ ثابت قدمی سے اپنائی جائے تو آج اخلاقی انحطاط کے انتہائی دور میں بھی زندگی معروضی نتائج سے خالی نہیں ہو سکتی۔نتائج کا پیدا نہ ہونا فی الواقع ہمارے عمل کے نقص کے باعث ہوتا ہے۔کئی معاملات میں ہم حق کی آواز سے اپنے کانوں کو بند کئے ہوئے رہتے ہیں۔حق شخصیت کے اندر کلی اور ہمہ گیر انقلاب کا نام ہے۔شخصیت کے اندر حق خالصتاً جاگزیں ہو تو اسے ایمان کہتے ہیں۔باطل خالصتاً جاگزیں ہو تو اسے کفر کہتے ہیں اور حق و باطل کے رجحانات ملے جلے ہوں یعنی دونوں کی آمیزش ہو تو اسے منافقت کہتے ہیں۔

سورۃ فاتحہ اور تعلیماتِ طریقت

اہلِ طریقت کے نزدیک نفسِ انسانی تین بنیادی خصوصیات سے عبارت ہے جن کی اصلاح صوفیانہ عمل اور ریاضت سے کی جاتی ہے۔وہ خصوصیات درج ذیل ہیں:

ہوس ـــــ غضب ـــــ شوات

☆ ہوا و ہوس کی زیادتی سے نفسِ انسانی 'شیطانیت' کی صفت اپناتا ہے۔

☆ غضب کی زیادتی سے نفسِ انسانی 'سبعیت' کی صفت اپناتا ہے۔

☆شہوت کی زیادتی سے نفسِ انسانی 'بہیمیت' کی صفت اپناتا ہے۔

نفسانی ہوا و ہوس اور حرص و لالچ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہر نعمت کی طلب اور خواہش اپنے لئے کرتا ہے اور دوسروں کو کسی نعمت سے بہرہ ور دیکھ کر حسد کی آگ میں جلنے لگتا ہے۔ ابلیس بھی اسی صفت حسد کے باعث راندہ درگاہ ہوا۔ بلکہ اس کی بنیاد ہی پر شیطان کے لقب سے معروف ہوا۔

نفسانی غضب کا علاج 'الرَّحمٰن الرّحیم' سے کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس آیت سے رحمتِ باری تعالیٰ کا مضمون دل پر وارد ہوتا ہے۔ انسانی طبعیت کو غصے اور غیظ و غضب کی کیفیت سے نجات دے سکتا ہے۔ رحمت کا یہی مفہوم نفسِ انسانی کو غضب سے پاک کر دینے کے لئے کافی ہے۔

نفسانی شہوت کا اثر زائل کرنے کے لئے 'مالِکِ یومِ الدِین' سے رہنمائی ملتی ہے۔ اگر آخرت کے مواخذے اور سزا کا خوف صحیح معنوں میں دل و دماغ پر طاری ہو جائے تو شہوانی خیالات از خود کافور ہو جاتے ہیں۔ ان کا غلبہ حقیقت میں آخرت کے تصور سے غفلت کے باعث ہوتا ہے۔

سورۃ فاتحہ نے خود پسندی کا اعلان 'اِیاک نعبد' کے ذریعے فراہم کیا ہے جس میں انسان بارگاہِ ایزدی میں اپنی عاجزی اور بے بسی کا اعتراف کرتے ہوئے انتہائی خضوع و خشوع کے ساتھ حقِ بندگی ادا کرتا ہے۔ جب انسان کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کر دیتا ہے تو اس کی نخوت و ناموس کے جھوٹے پندار کا بھرم وہیں کھل جاتا ہے۔ اس لئے سورۃ فاتحہ نے استعانت کو نخوت و فرعونیت کا علاج قرار دیا ہے۔ جہاں تک شہوت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اخلاقی بے راہروی کا تعلق ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہدایت و استقامت کا سامان فراہم کیا جائے۔ طریقت و تصوف کی

ساری تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ بندہ اپنے دل میں خدا کی کامل عظمت اور قدرت کا نقش ثبت کرے۔

۲۔ اس کے دل میں اپنی عاجزی اور فروماندگی کا احساس پوری طرح جاگزیں ہو جائے۔

۳۔ وہ ذاتِ حق سے اپنا تعلقِ عبودیت اس طرح استوار کرے کہ وہ اس کے ماسوا سے بے نیاز ہو

جائے۔

۴۔وہ انعاماتِ ایزدی کے حصول کے لئے ہمہ وقت اس کے مقبول اور انعام یافتہ بندوں کی ظاہری اور باطنی صحبت میں رہے۔

۵۔وہ رضائے الٰہی کی خاطر ہر اس تعلق اور ہر اس چیز سے علاقہ منقطع کرلے جو اس کی ناراضگی کا باعث بنتی ہو۔

اور حقیقت یہ ہے کہ یہی تعلقاتِ فاتحہ کا ماحصل ہے۔تعلیماتِ طریقت کی روح اور اصل حقیقت سورۃ فاتحہ کے اندر ضبط کردی گئی ہے۔اس لئے یہ سورۃ انسان کے باطن کی اصلاح کی آئینہ دار بھی ہے۔(تفسیر منہاج القرآن جز اول صفحہ ۳۹۳)

سورۃ فاتحہ اور فرائضِ نبوت کی تکمیل

اس آیتِ کریمہ کی روشنی میں فرائض نبوت کی تکمیل کے ضمن میں چار تربیتی ضابطوں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔تلاوتِ آیات ۲۔تزکیۂ نفوس ۳۔تعلیم کتاب ۴۔تعلیم حکمت

تلاوتِ آیات کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو خدا کی ہستی کا یقین ہوجائے اور اس کی ذات وصفات کی معرفت نصیب ہو۔

تزکیۂ نفس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کا قلب و باطن ہر قسم کی محبت و رغبت اور دنیوی الفت کی میل کچیل سے پاک ہو اور صرف خدا کی محبت اور عشق دل میں فروغ پاسکے۔

تعلیمِ کتاب کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو اپنی اور کائنات کی حقیقت کا علم ہوجائے۔وہ یقین کے ساتھ یہ جان سکے کہ وہ کون ہے؟ اس کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ انسان اور کائنات کی اصل حقیقت کی تعلیم کتاب سے ہی ممکن تھی۔اس لیے اس کو فرائض نبوت میں شامل کردیا گیا۔

تعلیمِ حکمت مقصد یہ تھا کہ انسان کو یہ شعور عطا کیا جائے کہ زندگی میں کون سا طرزِ عمل ایسا ہے، جس سے اس کا مقصودِ حقیقی میسر آئے گا، اور کون سا طرزِ عمل ایسا ہے جس جس سے وہ ناکام و نامراد ہوگا۔ حقیقت میں یہی دینِ حق کے چار مقاصد ہیں۔ جن کے حصول کی تعلیم اسلام کا ماحصل ہے کہ انسان کو خدا کی ہستی کا یقین اور اس کی ذات وصفات کی معرفت ہو، اس سے والہانہ محبت کا رشتہ استوار ہو، انسان کو اپنی اور کائنات کی حقیقت کا یقینی علم حاصل ہو اور اسے کائناتِ ہستی کے اندر زندگی بسر کرنے کے لئے صحیح اور غلط طرزِ عمل کا شعور میسر آئے تا کہ وہ اس کے مطابق کامیاب زندگی بسر کر سکے۔

'اَلحمدللہ ربِ العلمِین' کے الفاظ کائنات اور موجوداتِ عالم کے خالق اور پروردگار کی ہستی کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ سورۃ فاتحہ کی پہلی آیت خدا کے ہونے اور اس کی ذات وصفات کی معرفت کا درس دیتی ہے۔ لہٰذا اس سے پہلے فریضۂ نبوت کی تعمیل کی راہ ملتی ہے۔ کیونکہ فرائضِ نبوت اور مقاصد دین میں سب سے پہلا فریضہ اور مقصد و مطلب یہی تھا کہ خدا کی ہستی کا یقین پیدا ہو اور اس کی ذات وصفات کی معرفت کی راہ میسر آئے۔ دوسرا مقصد خدا تعالی سے محبت اور والہانہ عشق پیدا کرنا تھا۔ جس کی تکمیل بھی سورۃ فاتحہ کی ابتدائی آیات کے ذریعے ہوتی ہے۔ محبوب کے لئے تین خوبیوں کا حامل ہونا انتہائی ضروری ہے۔

☆ پہلی خوبی اس کا حسن و جمال ہے۔

☆ دوسری خوبی اس کے لطف وکرم اور شفقت وعنایت کی ہے۔

☆ تیسری خوبی محبوب کا عادل ہونا ہے۔ اسے چاہیے کہ اپنے طلب گاروں میں سے ہر ایک کو اس کے صحیح مقام پر رکھے۔

سورۃ فاتحہ کی پہلی آیات محبوب حقیقی کی انہی تین خوبیوں کے بیان پر مشتمل ہیں۔

'اَلحمدللہ ربِ العلمِین' کے ذریعے یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ ہر تعریف اور کلمۂ حمد کی مستحق اللہ کی

ذات ہے۔ الرحمٰن الرحیم کے ذریعے یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ وہ محبوب لطف و کرم اور شفقت و عنایت میں بھی کوئی حد نہیں رکھتا۔ 'مالکِ یومِ الدین' کے ذریعے یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ یہ محبوب عادل اور منصف مزاج ہے۔ اس نے آج تک کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ گویا سورۃ فاتحہ انسانوں کو یہ دعوت دیتی ہے کہ جب عشق و محبت کے سارے تقاضے بتمام و کمال صرف اسی محبوب کی ذات میں پورے ہوتے ہیں تو تم اسے چھوڑ کر ناقص محبتوں کا دم کیوں بھرتے ہو۔

تیسرا مقصد انسان اور کائنات کی اصل حقیقت کو آشکار کرنا تھا۔ اسی حقیقت سے آشنائی تیسرا فریضہ نبوت تھا جو سورۃ فاتحہ کی تعلیمات کا اہم رکن بنا دیا گیا ہے۔

چوتھا مقصد انسان کو یہ شعور عطا کرنا تھا کہ کس طرزِ عمل میں دنیا و آخرت کی کامیابی کی ضمانت ہے اور کس میں تباہی و بربادی کی تا کہ انسان اپنے مقام و منصب کو پہچانتے ہوئے جادۂ صحیح پر گامزن ہو سکے۔

سورۃ فاتحہ نے وہ طرزِ عمل بھی صراحت کے ساتھ بیان کر دیا کہ وہ ان چار ارکان پر مشتمل ہے۔

۱۔عبادت ۲۔استعانت ۳۔استقامت ۴۔معیت انعام یافتگان

سورۃ فاتحہ اور تصورِ وحدت:

جب نزولِ قرآن اور بعثتِ محمدی ﷺ کا وقت آیا اس وقت فکرِ انسان پر چھ مختلف الوہی تصورات چھائے ہوئے تھے۔

۱۔چینی تصور ۲۔ہندوستانی تصور ۳۔مجوسی تصور

۴۔یہودی تصور ۵۔مسیحی تصور ۶۔اہلِ عرب کا مشرکانہ تصور

اسلام نے دنیا کے تمام باطل تصورات اور مسخ شدہ حقائق کو رد کرتے ہوئے تصورِ وحدت کو اس کی صحیح نکھری ہوئی کامل صورت میں پیش کیا، اس نے بانی اسلام ﷺ کی تعظیم و احترام، ان کے بے انتہا کمالات و معجزات اور شرف و عظمت کی لاتعداد و غیر متصور بلندیوں کے باوجود کسی صورت میں

ان کی عبادت کی راہ نہیں کھولی، جیسا کہ دوسرے مذاہب نے ہمیشہ کیا تھا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا وہ اعلان جو انھوں نے حضور ﷺ کی وفات پر برسرِ منبر کیا تھا۔ اس حقیقت کا شاہد عادل ہے۔

(تم میں سے) جو کوئی حضرت محمد ﷺ کی پرستش کرتا تھا، سو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ حضرت محمد ﷺ وفات پا چکے ہیں (اور وفات پانے والے کی عبادت نہیں ہو سکتی) اور (تم میں سے) جو کوئی اللہ کی پرستش کرتا تھا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی ذات ہمیشہ زندہ ہے اور اس کے لئے کبھی موت نہیں۔ اس اعلان نے اسلام کے اندر شرک کے تمام توہمات و خیالات کا ہمیشہ کے لئے قلع قمع کر دیا جو کبھی بھی کسی باطل خیال آرائی سے پیدا ہو سکتے تھے۔

الحمد للہ رب العلمین

قرآن مجید نے باری تعالی کی تعریف کے لیے سب سے پہلا لفظ حمد استعمال کیا ہے۔ اصطلاح میں کسی کی ارادی اور اختیاری خوبی کی زبان سے تعریف کرنا حمد کہلاتا ہے۔ اہلِ علم وفن نے حمد کے مفہوم کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

الحمد هو الثنا على الجميل الاختيارى من نعمة أو غيرها۔

حمد اس تعریف کو کہتے ہیں جو کسی کی اختیاری خوبی پر کی جائے خواہ وہ کسی انعام کے مقابل ہو یا اس کے بغیر۔

ابو حیان اندلسیؒ نے ’حمد‘ کی تعریف یوں کی:

الحمد الثنا على الجميل من نعمة أو غيرها باللسان وحده -

حمد اس تعریف کو کہتے ہیں جو زبان سے کسی کی خوبیوں پر کی جائے خواہ وہ کسی انعام کے بدلے ہو یا اس کے بغیر۔

حمد اور مدح میں فرق:

حمد جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، اس کی تعریف کو کہتے ہیں جو ایسی خوبی

اور کمال پر کی جائے جو صاحبِ کمال کے اپنے ارادے اور اختیار سے اس کے اندر موجود ہو۔ مثلاً علم، سخاوت، اخلاق، رحم اور انعام واحسان وغیرہ ایسے محاسن وفضائل ہیں جو کسی شخص کے اندر محض ارادی اور اختیاری طور پر ہی پائے جاتے ہیں غیر ارادی طور پر نہیں۔ ایسی خوبیوں پر حمد ہوگی جبکہ حسنِ صورت، خوش آوازی اور قد وقامت وغیرہ ایسے شخصی فضائل ہیں جو انسان میں غیر ارادی اور غیر اختیاری طور پر پائے جاتے ہیں۔ ان خوبیوں میں انسانی کسب واختیار کو دخل نہیں ہوتا، لہذا ان پر کی جانے والی تعریف حمد نہیں کہلائے گی بلکہ اس تعریف کو اصطلاحاً مدح کا نام دیا جائے گا۔ کیونکہ مدح ہر قسم کی اختیاری وغیر اختیاری خوبی پر ہوتی ہے۔ مدح کی تعریف یوں کی گئی ہے:

ھوالثنا علی الجمیل مطلقاً۔ (تفسیر البیضاوی، ۱:۹)

مدح اس تعریف کو کہتے ہیں جو مطلقا کسی خوبی کی بنا پر کی جائے (خواہ وہ اختیاری ہو یا غیر اختیاری)۔

مدح عام ہے اور حمد خاص۔ ہر حمد کو مدح کہا جاسکتا ہے لیکن ہر مدح کو حمد نہیں۔ باری تعالی نے اپنی تعریف کے لئے لفظ حمد کا استعمال اس لیے فرمایا کہ ہر حمد میں مدح کا مفہوم ازخود موجود ہے جبکہ مدح کا لفظ استعمال فرمانے میں یہ افادیت نہ تھی کیونکہ ہر مدح، حمد کو شامل نہیں۔ بنابریں اس کا ہر کمال واجب ہوا، ممکن نہ رہا اور بر بنائے وجوب، اس کا ہر کمال قدیم ہوا، حادث نہ رہا۔ اس لیے اس کا ہر کمال ازلی اور ابدی ہوا اور یہی شانِ الوہیت ہے۔ یہ اس کا اعجازِ کلام ہے کہ وہ ایک لفظ کے انتخاب سے کئی معارف کا احاطہ فرمالیتا ہے۔ حمد صرف زندہ اور ذی شعور کے لیے ہوتی ہے مردہ کے لیے نہیں۔ چنانچہ باری تعالی نے اپنے لیے مدح کے بجائے حمد کا لفظ منتخب فرما کر بالواسطہ یہ واضح فرمادیا کہ میں 'حَیٌّ لَّا یَمُوتُ' ہوں، ہمیشہ زندہ رہوں گا اور کبھی موت سے ہمکنار نہیں ہوں گا۔ بلکہ میں خود موت وحیات کا خالق ہوں اور حیات وممات میرے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی لفظ حمد نے اس کے زندہ خدا ہونے کی دلیل فراہم کی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

من لم یحمد الناس لم یحمد اللّٰه۔ (التفسیر الکبیرا:۲۱۸)

جو لوگوں کی حمد نہیں کرتا وہ اللہ کی حمد نہیں کر سکتا۔ ارشادِ باری تعالی ہے:

اِن مِّن شیءٍ اِلَّا یُسَبِحُ بِحمدِہ۔ (الاسراء،۱۷:۴۴)

کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو۔

حمد اور شکر میں فرق:

شکر سے مراد کسی شخص کا ایسا قولی، عملی یا اعتقادی فعل ہے جس سے اس کے منعم کی تعظیم اور اس کے انعام واحسان کا اظہار ہو۔ شکر کی تعریف اصطلاحاً یوں کی جاسکتی ہے: شکر اس قولی فعلی یا اعتقادی عمل کو کہا جاتا ہے جس میں منعم کی تعظیم اور اس کے احسان کے اعتراف کا اظہار ہو۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَقُلِ الحمدُ لِلّٰہِ الَّذِی لَم یَتَّخِذ وَلَدًا وَّلَم یَکُن لَّہ شَرِیك فِی المُلكِ۔ (الاسراء،۱۷:۱۱۱)

اور اللہ کی حمد بیان کر جس نے اپنے لیے کوئی اولاد نہیں بنائی اور نہ ہی کائنات کی بادشاہی میں اس کا کوئی شریک ہے۔

یہاں اللہ تعالی کی ایسی ذاتی خوبی اور اختیاری کمال پر حمد کا حکم ہے جس میں کسی دوسرے پر انعام کا ذکر نہیں۔

فَقُلِ الحمدِ لِلّٰہِ الَّذِی نَجّانَا مِنَ القَومِ الظّٰلِمِین (المؤمنون،۲۳:۲۸)

پس اللہ کی حمد بیان کر کہ اس نے ہمیں ظالم قوم سے نجات عطا فرمائی۔ واضح ہو گیا کہ حمد کا دامن شکر پر بھی محیط ہے۔ امام راغب اصفہانی نے صراحت کی ہے: شکر صرف نعمت کے مقابلے میں ادا کیا جاتا ہے۔ پس ہر شکر حمد ہے مگر ہر حمد شکر نہیں۔

یہ واضح ہے کہ حمد کے لیے محمود کی طرف سے کسی نعمت کا عطا کیا جانا ضروری نہیں۔ حمد ہر صورت میں

ہوسکتی ہے اس لیے ہر شکر، بنیادی طور پر حمد کہلائے گا لیکن ہر حمد شکر قرار نہیں پاسکتی۔ حمد ہر صورت میں درست ہے مگر شکر صرف متعدی صفات پر ممکن ہے لازم پر نہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: حمد شکر کا کمال ہے جو شخص اللہ کی حمد بیان نہیں کرتا وہ اس کا شکر ادا نہیں کرسکتا۔ لفظِ حمد میں از خود اعلیٰ وارفع شکر موجود ہے اس لیے اسے ہی مقامِ تعریف میں اپنایا گیا۔ حمد اور شکر میں فرق کا یہ پہلو بھی اہم ہے کہ حمد اپنے مورد میں خاص ہے اور شکر عام یعنی حمد صرف زبان سے ادا ہوتی ہے جبکہ شکر تینوں موارد سے، اس لئے اہلِ علم وفن نے شکر کی تین اقسام بیان کی ہیں۔ شکر باللسان، شکر با لجنان اور شکر بالارکان۔ ان اقسام کو شکر قولی، شکر اعتقادی اور شکر فعلی کا نام دیا جاتا ہے۔ جب انسان زبان سے باری تعالیٰ کی حمد کرتا ہے تو صاف ظاہر ہے اس کا دل بھی اس کی تائید کررہا ہوتا ہے۔ اگر دل ساتھ شریک نہ ہو تو حقیقت میں حمد ہی نہیں، یہ محض ریاکاری ہوگی۔ حمد ہمیشہ قلبی لذت اور باطنی حلاوت کے ساتھ زبان سے ظاہر ہوتی ہے۔ بصورتِ حمد بندے کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال کا اعتراف، اس کے احسان وانعام کا اقرار اور اس کی تعظیم وتکریم ہمیشہ باطن سے جنم لے کر ظاہر سے عیاں ہوتی ہے۔ اس طرح حضورِ الٰہی میں تواضع، خشوع اور تذلل کی کیفیت باطن کے علاوہ بندے کے ظاہر سے بھی آشکار ہونے لگتی ہے۔ یہاں لفظِ حمد کا استعمال یہی تقاضا کررہا ہے کہ شکر مندی اور تعظیم ایزدی کی حالت اور کیفیت کا اظہار محض بندے کے باطن تک محصور نہیں رہنا چاہئے بلکہ اس کے ظاہر سے بھی عیاں ہونا چاہئے جبکہ لفظِ شکر سے یہ لازم نہیں آتا۔ کیونکہ محض دل سے شاکر ہونا بھی تقاضائے شکر کو پورا کردیتا ہے۔ اس تصور سے یہ وضاحت بھی ہوجاتی ہے کہ فرائض کے باب میں محض دل کی عبادت اور طاعت وبندگی ..... جس کا ظہور وصدور ظاہر سینہ ہورہا ہو ... شریعتِ اسلامیہ میں کوئی معنی نہیں رکھتی۔ حمد فی الواقع سری وجہری دونوں کیفیتوں کی جامع ہے۔

ذاتِ الٰہی چونکہ ہر قسم کی نعمت کی مصدر ہے۔ خلق وایجاد، ابقاو تربیت اور تکمیل الغرض سب نعمتیں

اس کے فیضانِ کرم سے ہیں۔ حضرت ابنِ عباس نے فرمایا: الحمدللہ ھوالشکر۔

(جامع البیان، ۱:۴۶)

اللہ کی حمد بیان کرنا ہی حقیقت میں شکر ہے۔

حضرت ابنِ عباس کے فرمان کا مقصد یہ ہے کہ حقیقت میں بہترین شکر یہی ہے کہ انسان اللہ تعالی کی حمد بیان کرے کیونکہ حمدِ الہ کے بغیر شکر کا کوئی معنی نہیں۔

حمد میں ایک لطیف وجدانی اشارہ:

اللہ تعالی کے نزدیک اس کی حمد سے زیادہ محبوب شے دنیا میں کوئی نہیں۔ حمد اس کلام کا لفظِ اول ہے، محمدﷺ اس کے فیضان کا نقشِ اول۔ حمد باری تعالی کی ربوبیت کا استحقاق ہے، محمدﷺ اس کی ربوبیت کا اعجاز۔ حمد صفاتِ باری کی دلیل ہے محمدﷺ ذاتِ باری تعالی کی دلیل۔ حمد میں بھی تعیمہ ہے، محمدﷺ میں بھی تعیم۔۔ حمد کو بھی تمام نعمتوں پر محیط کیا گیا ہے۔ محمدﷺ کا دامنِ رحمت بھی سب نعمتوں پر محیط۔ حمد ہر ذرہ کائنات سے عیاں ہے محمدﷺ ہر ذرہ کائنات میں نہاں۔ محمد مطلوبِ انس وجاں ہے محمدﷺ مقصودِ انس وجاں۔ چنانچہ کلامِ الہی کا افتتاح ذکرِ حمد سے کیا گیا اور اختتام جن وانس پر۔

جملہ اسمیہ کے استعمال کی حکمت:

اہل نحو وادب کی اصطلاح میں الحمدللہ جملہ اسمیہ خبریہ ہے۔ قرآن مجید نے یہاں جملہ فعلیہ استعمال نہیں کیا یعنی احمد اللہ یا نحمد اللہ (میں اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں یا ہم اللہ کی حمد بیان کرتے ہیں) نہیں کہا گیا بلکہ یہاں محض اس کے محمود ہونے کا ذکر ہے، کسی کے حامد ہونے کا نہیں۔ اس کی چند حکمتیں ہیں:

۱۔ اگر جملہ فعلیہ استعمال کیا جاتا تو کہنے والے کو کسی بھی سطح پر یہ گمان ہوسکتا تھا کہ میں اس کی حمد پر قادر ہوں۔

۲۔دوسری حکمت یہ بھی ہے کہ انسان کو باور کرایا جائے کہ اے انسان ! اللہ تعالی تیری حمد سے محمود نہیں ہوا بلکہ حمد کرنے والوں کی حمد اور شکر کرنے والوں کے شکر سے پہلے بھی وہ محمود تھا اور اس کے بعد بھی محمود رہے گا۔کوئی اس کی حمد کرتا ہے تو اس سے اس کی ربوبیت اور محمودیت میں مطلقاً کوئی اضافہ نہیں ہوتا بلکہ دنیا میں کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے وہ پھر بھی بغیر کسی کمی کے بدستور محمود رہتا ہے۔

۳۔سب حمد کا لائق اللہ ہے تو وہ اس امر کا اعتراف کر رہا ہوتا ہے کہ اس کائنات میں ہر حامد سے بہتر کئی اور حامد ہیں۔

۴۔اس اسلوبِ بیان میں بندوں کے حق میں رحمت و بخشش بھی ہے کہ اگر بندہ زبان سے یہ کہے کہ اے اللہ میں تیری حمد کرتا ہوں لیکن اس کا دل نفسانی غلبے کے باعث غافل ہو تو یہ قول نفاق اور کذب قرار پا سکتا ہے کہ اس نے اپنی نسبت زبان سے ایسی بات کہی ہے جو واقعتاً مطابق حال نہیں جبکہ الحمد للہ کہنے میں انسان کو اس تکلیف سے بری کر دیا گیا کہ اگر کوئی غافل انسان بھی الحمدللہ کی تحمید کرنا چاہے تو آسانی سے کر سکے کیونکہ ساری حمد تیرے لائق ہے کہنے میں نفسانی طور پر غافل اور بیدار دونوں برابر ہیں کہ حامد محض اس کے محمود ہونے کا اقرار کر رہا ہے اپنے حامد ہونے کا نہیں۔اسی طرح ایسا نہ ہو کہ کوئی غافل شخص زبان سے کہے کہ میں تیری حمد کرتا ہوں مگر اس کا حال اس کے خلاف ہو اور یہ قول بھی کذب و نفاق بن جائے۔اس ربِ کریم کے لطف و کرم کا کیا عجب عالم ہے کہ اس نے اپنی حمد کے معاملے میں غافلوں کو بھی اپنی بارگاہ میں اعزاز و اکرام اور شرفِ قبولیت عطا فرما دیا ہے۔الحمد للہ کے اسلوبِ بیان میں شانِ ثبات ہے اور یہی مقصودِ حمد ہے۔

الحمد میں لامِ تعریف کی حکمت:

قاعدہ نوں اور اصولِ تفسیر کی رو سے لامِ تعریف درج ذیل تین صورتوں میں سے کسی پر بھی محمول

ہوسکتی ہے:

ا۔لام جنس ۲۔لامِ عہد ۳۔لامِ استغراق

ا۔لامِ جنس کی صورت میں الحمد کا معنی جنسِ حمد ہے۔یہی لام حقیقت کے لئے بھی متصور ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے الحمد کا مفہوم یہ ہوگا کہ حقیقی حمد وستائش صرف اللہ کے لئے ہے۔

۲۔لامِ عہد کی صورت میں الحمد کا معنی حمدِ کامل ہے۔حمد اور تعریف ہر لامظ سے کامل اور نقص سے مبرا ہے وہ صرف تیرے لائق ہے لہذا حمدِ کامل کا مستحق صرف تو ہی ہے۔

۳۔لامِ استغراق کی صورت میں الحمد کا معنی تمام تعریفیں ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں مختلف محاسن اور کمالات کے حوالے سے جس قدر بھی تعریفیں مخلوق کی زبان سے صادر ہوتی ہیں یا محض علمی وجود رکھتی ہیں وہ سب کی سب اصلاً اللہ تعالی ہی کے لئے ہیں۔

الحمدللہ میں لامِ اختصاص کی حکمت:

الحمدللہ کا مفہوم یہ ہوا کہ حمد وثنا اور تعریف وستائش کے باب میں جو کچھ بھی سوچا، سمجھا اور کہا جاسکتا ہے سب اللہ کے لئے ہے کیونکہ حسن وجمال اور عظمت وکمال کا جو نظارہ جہاں بھی جلوہ فگن ہے اسی کا ہے اور اسی سے ہے۔ارشادِ باری تعالی ہے:

وَلَهُ الحَمدُ فِى السَّمٰوٰتِ والاَ رضِ وَعشِيًّاوَّحِينَ تَظهِرُ ون

(الروم۳۰:۱۸)

اوراسی کی حمد وستائش ہے آسمانوں اورزمین میں، پچھلے پہر بھی اور جب تم پر دوپہر ہو۔

مزیدارشاد فرمایا گیا:

لَه' اَلحَمدُ فِى الُا ولٰى وَالاٰ خِرَةِ وَلَهُ الحُكمُ وَاِلَيهِ تُرجَعُون ۔

(القصص،۲۸:۷۰)

دنیا اور آخرت میں ساری تعریفیں اس کے لئے ہیں اور (حقیقی) حکم وفرمانروائی (بھی) اسی کی ہے

اور تم اسی کی طرف لوٹائے جا گئے۔

عالمِ مکاں کی سب بلندیوں کا منتہٰی بھی انہی پاکیزہ اور وجد آفریں صداں سے معمور ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَتَرَی الۡمَلٰٓئِکَۃَ حَآفِّیۡنَ مِنۡ حَوۡلِ الۡعَرۡشِ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّہِمۡ وَقُضِیَ بَیۡنَہُمۡ بِالۡحَقِّ وَقِیۡلَ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔ (الزمر،۳۹:۷۵)

اور تم فرشتوں کو دیکھو گے عرش کے اردگرد حلقہ باندھے اپنے رب کی حمد وستائش کے ساتھ تسبیح کرتے ہوں گے اور لوگوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ سب حمد وستائش اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

یہاں کتنے حسین پیرائے میں عالمِ آخرت کے آخری فیصلے کا ذکر کیا گیا ہے کہ روزِ قیامت ہر نیک و بد اور مومن و کافر کے اعمال کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے دنیوی زندگی کے معاملات کا حتمی فیصلہ سنایا جائے گا،اور بات یہاں آ کر ختم ہوگی کہ حمد وستائش سب اسی کے لیئے ہے۔

لفظِ اللہ کی تحقیق:

الحمدللہ میں دوسرا لفظ اللہ ہے۔اس کے مختلف مادہ ہائے اشتقاق کو جاننا ضروری ہے جو مختصرا درج ذیل ہیں:

۱۔ اَلَہَ ۔۔۔۔۔عبادت کرنا

۲۔ اَلِہَ ۔۔۔۔متحیر و درماندہ ہونا

۳۔ اَلَہ ۔۔۔۔سکون پانا

۴۔ اَلَہ ۔۔۔۔جھکنا،راغب کرنا اور رجوع کرنا

۵۔ اَلَہ ۔۔۔۔عطا کرنا،اجرت دینا

۶۔ اَلَہ ۔۔۔۔پناہ ڈھونڈنا اور پناہ دینا

۷۔الولہ۔۔۔۔۔عقل کا گم ہو جانا

۸۔لا ۔۔۔۔۔بلند مرتبہ

۹۔ ولاہ ۔۔۔۔۔مخفی ہونا

۰۔ولاہ ۔۔۔۔۔مسخر کرنا

۔ولاہ ۔۔۔۔۔ارادہ کرنا

مذکورہ بالا تمام مطالب کو سامنے رکھ کر لفظِ اللہ کا جو جامع معنی سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ وہ ذات ہے جو عبادت کے لائق ہے جس کو جاننے میں انسان تحیر اور درماندگی میں مبتلا ہے۔مضطرب طبیعتوں اور بے چین دلوں کو اسی سے سکون ملتا ہے۔

وحدت، وحدانیت اور توحید کا مفہوم:

اللہ تبارک وتعالی کا ایک ہونا توحید نہیں ہے، بلکہ یہ اس کی وحدت ہے۔

اس باب میں تین الفاظ اہم ہیں:

ا۔وحدت ۲۔وحدانیت ۳۔توحید

واسطۂ رسالت سے اللہ تعالی کو ایک ماناوہی وہ عقیدہ ہے جو ایمان بنتا ہے اور ہم اسی کو عقید توحید کہتے ہیں۔

واحد اور توحید کے درمیان معنوی ربط:

عربی گرائمر کی رو سے لفظِ توحید باب تفعیل کا مصدر ہے اور اس کے لغوی معنی ایک ہونا کے ہیں۔اس کا مادہ اشتقاق وحد ہے اور اِسی سے واحد مشتق ہے جس کے معنی ایک کے ہیں۔

واحد کی اقسام:

واحد کی تین قسمیں ہیں:

۱۔واحد عددی ۲۔واحد جنسی ۳۔واحد نوعی

واحد عددی

واحد عددی دو کے آدھے کو کہتے ہیں۔

واحد جنسی

واحد جنسی اسے کہتے ہیں جو اپنی جنس کے اعتبار سے ایک ہو مثلاً حیوان ایک جنس ہے اور جسم نامی ایک جنس ہے۔تمام جانوروں میں حیوانیت مشترک جنس ہے لہذا یہ تمام جانور ایک جنس کے لحاظ سے واحد جنسی ہیں۔

واحد نوعی

واحد نوعی وہ ہے جو اپنی نوع کے لحاظ سے ایک ہو مثلاً حیوان کی کئی انواع ہیں۔کوئی حیوان صاھل یعنی ہنہنانے والا جانور ہے، کوئی حیوان مفترس یعنی چیرنے پھاڑنے والا جانور ہے اور کوئی حیوانِ ناطق جیسے انسان۔انسان حیوانِ ناطق ہونے کی حیثیت سے اپنی نوع کا ایک فرد کہلاتا ہے۔

خلاصۂ کلام

تمام تعریفات کے مطابق اللہ تعالیٰ کو نہ تو واحد عددی، نہ واحدِ جنسی اور نہ واحد نوعی مان سکتے ہیں کیونکہ اس سے شرک لازم آتا ہے تو پھر لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم مسلمان اللہ تعالیٰ کو وہ واحد مانتے ہیں جسے زبان مصطفیٰ ﷺ نے بیان کیا ہے اور اس کا اظہار قل ھو اللہ احد میں ہے۔ پوری امت کا متفق علیہ اور مجمع علیہ عقیدہ ہے کہ اللہ رب العزت نہ واحد عددی ہے نہ واحد جنسی ہے اور نہ واحد نوعی، بلکہ اللہ تعالیٰ کے واحد ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ واحد حقیقی ہے اور اس کی ذات

ازل سے ہی وحدتِ ذاتی سے متصف ہے اور وہ ہر قسم کے اشتراک، اشتباہ، مماثلت، تعدد، تکثر، تجزی، حلول، اتحاد، امکان، حدوث، ترکیب، تحلیل اور تبعیض سے پاک ہے اور ان تمام عقائدِ حقہ کا اعلان زبانِ رسالت مآب ﷺ سے لفظ قل سے کروایا گیا ہے۔

وحدت اور توحید میں فرق

خدا کا ایک ہونا تصورِ وحدت ہے۔ اگر زبانِ رسالت مآب ﷺ کے واسطے کے بغیر اپنی عقل، فہم اور سمجھ سے خدا کو ایک جانا جائے تو یہ تصورِ وحدت ہے اور زبانِ رسالت مآب ﷺ سے سن کر اللہ تعالیٰ کو ایک مانا جائے تو یہ عقیدہ توحید ہے، اس لئے ارشاد فرمایا گیا: '**قُل هُوَ اللّٰهُ اَحَد**' اے نبی ﷺ آپ فرما دیجئے وہ اللہ ہے جو یکتا ہے۔ سننے والے آپ کی زبان سے سن کر اور آپ کی بات کو مان کر مجھے ایک مانیں اور ایک جانیں گے تو ان کی وحدت، توحید میں بدل جائیگی۔

تصورِ توحید کے کامل فہم کے لئے چند وضاحتیں

معبود کو تمام صفات (خاصہ و مشترکہ) سے یکسر مبرا قرار دینا تعطیل اور اس کے لئے صفات کے اثبات کے ساتھ مشابہتِ مخلوق کی نفی تنزیہہ کہلاتی ہے۔ جبکہ صفاتِ الٰہیہ کو وہی درجہ دینا جو مخلوق کی صفات کا ہے تشبیہ کہلاتا ہے۔ لیکن صفاتِ خاصہ کا اختصاص رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی صفات (مشترکہ) کے فیض کو مخلوق سے متعلق جاننا ک بین التشبیہ والتنزیہہ کہلاتا ہے اور یہی نظریہ قرآنی تصورِ توحید سے کامل مطابقت رکھتا ہے۔

توحید فی الصفات

توحید فی الذات یا ایجابی توحید کا تو ہر مذہب نے پرچار کیا، لیکن توحید فی الصفات (خاصہ) یا سلبی توحید سے انکی تعلیمات یکسر عاری رہیں۔ قرآن نے نہ صرف توحید فی الذات پر

زور دیا بلکہ توحید فی الصفات کا بھی ایسا کامل نقشہ کھینچا کہ ہمیشہ کے لئے شرک وتشبیہ کا دروازہ بند کر دیا۔یہی وجہ ہے کہ سورۃ فاتحہ میں توحید ایجابی اور توحید سلبی دونوں کی وضاحت کے لیے ' **اِیَّاكَ نَعبُدُ وَ اِیَّاكَ نَستَعِین** ' کی تلقین کی گئی ہے۔

ذبح اور نذرِ عبادت اسی کا حق ہے، اس کی صفت رحمان ہے۔اس کی یہ صفت کسی اور کے لئے جائز نہیں جبکہ رحیم مخلوق کے لئے جائز ہے۔وہی سجدہ عبادت کا حقدار ہے وہی موت وحیات کا خالق بھی ہے اور مالک بھی اسی طرح اسی کے گھر کا حج ہے، اسی کے گھر کا طواف ہے اسی کے نام پر قربانی ہے اسی کی رضا کے لئے اعمال اور عبادات ہیں۔الغرض ایسی بہت سی صفات خاصہ ہیں جن میں وہ وحدہ لاشریک ہے، یہی توحید فی الصفات ہے۔

عوام وخواص کیلئے ایک اِلہ

قرآن سے پہلے خواص وعوام کی استعداد کے مطابق الگ الگ تصور اِلہ کا پرچار کیا جاتا تھا اور اسے حقیقت ومجاز سے تعبیر کیا جاتا تھا۔خواص کے لیے خدا کا حقیقی تصور جبکہ عوام کے لیے خدا کا مجازی تصور روا رکھا جاتا، جس کی ایک مثال ہندو خداشناسی کی ہے جو عوام کے لیے دیوتاں کی پرستش، خواص کے لیے براہ راست خدا کی پرستش اور اخص الخواص کے لیے وحدالوجود کے مشاہدات پر بنی تھی۔اسلام، ایمان اور احسان پر مشتمل ہے۔اسلام، توحید ورسالت کا اقرار اور دیگر چار ارکان یعنی نماز، روزہ، حج زکوۃ کی انجام دہی، جبکہ ایمان، اقرارِ توحید ورسالت میں کامل پختگی اور احسان، مجاہدہ ومراقبہ کے ذریعہ ایمان میں علم الیقین سے حق الیقین تک کے مراتب کا حصول ہے۔قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَالَّذِینَ جَاهَدُوافِینَالَنَهدِ یَنَّهُم سُبُلَنَااللّٰهُ لِمَعَ المُحسِنِین۔

(العنکبوت،۶۹:۲۹)

اور جو لوگ ہمارے حق میں جہاد(اور مجاہدہ) کرتے ہیں تو ہم یقیناً انہیں اپنی (طرف سیر اور

وصول کی) راہیں دکھا دیتے ہیں، اور بے شک اللہ صاحبانِ احسان کو اپنی معیت سے نوازتا ہے۔

یہاں پر نہ صرف اصحاب جہد وطلب کے لیے عملی مجاہدات و مکاشفات کا راستہ کھلا چھوڑ دیا گیا ہے بلکہ ہر انسان کی ذہنی و فکری صلاحیت کے مطابق اسے اسلام، ایمان اور احسان کے انتخاب کے لیے آزادی بھی عطا کر دی ہے۔ گویا اسلام کے تصور الہ کا میخانہ ایک اور جام الگ الگ ہیں جبکہ ہر شخص اپنی اپنی طلب وصلاحیت اور ظرف کے مطابق اپنے اپنے جام کے انتخاب کے لیے آزاد ہے۔

اللہ کو کس طرح مانا جائے:

رہنمائی، معرفت، پہچان اور رسائی صرف وہی ہے جو واسطہ نبوت سے میسر آئے اس کے علاوہ باقی سب کچھ عقل کوتاہ کی ٹھوکریں ہیں۔ انسان چاہے تو عمر بھر ٹھوکریں کھانے کی راہ اپنالے اور چاہے تو درِ نبوت پر جبین تسلیم خم کر کے منزل ہدایت کو پالے۔ اس لئے باری تعالی کو ماننے کا معیار علم و تحقیق نہیں ایمان بالغیب ہے۔ غیب سے مراد وہ حقائق و موجودات ہیں جن کا ادراک حواس سے ہو سکتا ہے نہ عقل سے بلکہ وہ صرف انبیا کے بتانے سے معلوم ہوتے ہیں۔

پس جو کچھ زبان نبوت سے ادا ہوا اسے بغیر دیکھے اور پرکھے اسی طرح مان لینا ایمان بالغیب ہے اور یہی مقبول ہے۔ اگر کوئی شخص نبی ﷺ کو حق اور حجت مطلقہ مانے بغیر اللہ کو ماننا چاہتا ہے تو یہ ناممکن ہے۔ علامہ ابنِ تیمیہؒ فرماتے ہیں:

امت کے لیے اپنے رب تک رسائی کے لیے کوئی راستہ نہیں سوائے رسول معظم ﷺ کے اور اس کے علاوہ کوئی دیگر راستہ ہے نہ کوئی سبب۔

رَبِ العلمِینِ

لفظِ رب کی علمی تحقیق: یہ لفظ سورۃ فاتحہ میں ذات باری تعالی کی پہلی صفت کے طور پر استعمال

ہوا ہے، جس کے معنی مربی اور مالک کے ہیں ۔ کفار و مشرکین کی طرح انسانی زندگی میں شرک، تصورِ خالقیت کی راہ سے کم اور تصورر بوبیت کی راہ سے زیادہ داخل ہوا ہے۔ یہ امر ثابت اور مسلم ہے کہ کفار و مشرکینِ عرب اللہ تعالیٰ کو نام خواہ کچھ بھی دیتے ہوں، اسے رب الارباب ضرور مانتے تھے۔ فی الحقیقت رب صرف مربی کو نہیں بلکہ نہایت ہی کامل مربی کو کہا جا سکتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ جو ہر جہت سے خود کامل ہو وہی دوسرے کی بھی کامل تربیت کرنے کا اہل ہو سکتا ہے۔ تفسیر البیضاوی میں تربیت کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

تربیت سے مراد کسی چیز کو درجہ بدرجہ اس کے کمال تک پہنچانا ہے۔

ائمہ تفسیر نے بالعموم رب کے معنی میں دو صفات کو شامل قرار دیا ہے:

۱۔ تربیت ۲۔ ملکیت

پس دونوں کی اپنی اپنی جگہ معنوی حکمت و افادیت ہے۔

تربیت:

لفظِ رب اصلاً تربیت کے معنی میں ہے اور اس سے مراد کسی چیز کو درجہ بدرجہ مختلف احوال میں سے گزارتے ہوئے آخری کمال کی حد تک پہنچا دینا ہے۔ کمال سے مراد کسی چیز کی وہ حالت ہوتی ہے جہاں وہ اپنی جملہ صفات کے اعتبار سے انتہا کو پہنچ جائے۔ نظامِ تربیت کا کمال یہ ہے کہ مربوب (تربیت پانے والا) تدریجی اور ارتقائی منزلوں میں سے گزرتا ہوا اپنی صفات کی آخری حد کو پالے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذاتِ اقدس کو قرآن مجید میں کم و بیش نو سو اڑسٹھ (۹۶۸) مرتبہ شانِ ربوبیت کے ذریعے بصراحت متعارف کرایا ہے۔

ربوبیت بطورِ نظام اور آئینہ دارِ وحدت

ربوبیت: ایک باقاعدہ نظام اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی اور اس کے انفسی و آفاقی

لوازمات میں سے جو کچھ بھی عطا کیا ہے وہ سب ایک مقرر نظام اور طے شدہ مقدار کے مطابق دیا ہے، تاکہ یہ ساری نعمتیں اور بخششیں ایک نظام بن کر کائنات میں ظہور پذیر ہوں اور بدنظمی اور بے ترتیبی کا تصور نہ ابھرے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِن مِن شی ءٍ اِلّا عِندَ نَاخز آئِنه' وَمَانُنَزِلُه' اِلّا بِقَدَرٍ مَعلُوم (الحجر،۱۵:۲۱)

اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کے ہمارے پاس (بے حساب) خزانے نہ ہوں۔ مگر ہم اسے بے ترتیبی اور بے نظمی سے نہیں اتارتے بلکہ جو کچھ بھی (دنیا میں) اتارتے ہیں، مقررہ مقدار کے مطابق (نظم سے) اتارتے ہیں۔

اسی طرح ارشاد فرمایا گیا:

وَکُلَّ شَی ءٍ عِندَہ' بِمِقدَارٍ۔ (الرعد،۱۳:۸)

اور اس کی بارگاہ (علم و عطا) میں ہر چیز کا ایک اندازہ (اور نظم) مقرر ہے۔

مزید فرمایا گیا: اِنَّ کُلَّ شَی ءٍ خَلَقنَاہ بِقَدَرٍ۔ (القمر،۵۴:۲۹)

ہم نے (کائنات میں) جس قدر اشیا پیدا کی ہیں، سب ایک مقرر نظم اور اندازے کے ساتھ پیدا کی ہیں۔

ربوبیت یہ نہیں کہ انسان کو زمین پر فقط پانی مہیا کیا جائے بلکہ ربوبیت یہ ہے کہ اسے اس کی ضرورتوں کے مطابق فراہم کیا جائے۔ دھوپ اور روشنی انسان کی ناگزیر ضروریات میں سے ہیں، سو ربوبیت یہ نہیں کہ یہ نعمتیں بغیر کسی نظم اور اندازے کے مہیا کر دی جائیں کیونکہ ان کی کثرت بھی مہلک ہو سکتی ہے اور قلت بھی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَلَکِن یُنَزِّلُ بِقَدَرٍمَّا یَشَآ ءُ اِنَّه' بِعِبَادِہ خَیرٌ بَصِیرٌ۔ (الشوری،۴۲:۲۷)

لیکن وہ جو کچھ چاہتا ہے (اور مناسب سمجھتا ہے) مقرر نظم اور اندازے کے مطابق دنیا میں اتارتا ہے۔ بیشک وہ اپنے بندوں (کی حاجتوں اور ضرورتوں) سے پورے طور پر باخبر ہے (اور ان کے نفع ونقصان کے سارے معاملات کو) دیکھنے والا ہے۔

سورج کے نظامِ گردش کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَالشَّمسُ تَجرِی لِمُستَقَرٍ لَّهَاذَالِكَ تَقدِيرُ العَزِيزِ العَلِيم۔

(یسین،۳۶:۳۸)

اور سورج اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے، یہ غالب علم والے رب کا مقرر کردہ نظام ہے۔

نظامِ ربوبیت اور اصولِ وحدت:

جس طرح ربوبیت خود ایک نظام کی متقاضی تھی، سو اسی کے مطابق اسے کارفرما کیا گیا، اسی طرح نظامِ ربوبیت، ہر جگہ اور ہر سمت اصولِ وحدت کا متقاضی تھا، سو اس کو بھی اسی کے مطابق کارفرما کیا گیا، کیونکہ اس کے بغیر ربوبیتِ الٰہیہ توحید کی دلیل نہیں بن سکتی۔ قرآن مجید اس تصور کو یوں بیان کرتا ہے:

وَلَم يَكُن لَّه ' شَرِيكٌ فِی المُلكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَیءٍ فَقَدَّ رَه ' تَقدِيرًا

(الفرقان،۲۵:۲)

اور کائنات کی بادشاہی (اور سلطنت وملکیت) میں اس کا کوئی شریک نہیں اور (یہی وجہ ہے کہ) اس نے ہر شے کو پیدا فرما کر اسے ایک مقررہ نظم اور اندازے سے قائم کر دیا ہے۔ (جس میں کوئی خلل یا تضاد دکھائی نہیں دیتا)۔

اس اصول کو ہم مخلوق کے مختلف طبقات میں یکساں طور پر کارفرما دیکھ سکتے ہیں۔ ہر دور میں تمام اشیا کے احوال بدلتے رہتے ہیں، تقاضے متغیر ہوتے ہیں۔ سامان نشوونما میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہے۔ مگر ان سب کی سمت اور ضابطے بنیادی طور پر ایک ہی ہیں۔ کسی کے خاتمے کو مر جانا کہتے ہیں،

کسی کو مرجھا جانا، کسی کو پامال ہونا، کسی کو ٹوٹ جانا، بات ایک ہی ہے مگر الفاظ مختلف ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اَللّٰہُ الَّذِی خَلَقَکُم مِن ضَعفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِن بَعدِ ضُعُفٍ قُوَّۃً ثُمَّ جَعَلَ مِن بَعدِ قُوَّۃٍ ضُعفًاوَشیبۃ یَخلُقُ مَا یَشآءُ وَھُوَا لعَلِیمُ القدِیرُ۔

(الروم۔۳۰:۵۴)

یہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے تمہیں ناتوانی کی حالت میں پیدا کیا، پھر اس ناتوانی کے بعد (تمہیں) قوت سے نوازا، پھر اس قوت (کے زمانے) کے بعد تمہیں دوبارہ ناتوانی کی حالت دی اور بڑھاپے تک پہنچایا اور وہ جو (حالت) چاہتا ہے، پیدا کرتا ہے علم اور قدرت والا (رب) ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

اَلَم تَرَاَن اللّٰہَ اَنزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءَ فَسلَکَہ' یَنَابِیعَ فِی الاَرضِ ثُمَّ یُخرِجَ بِہ زَرعًا مُّختَلِفًا اَلوَانُہ ثُمَّ یَھِیجُ فَتَرَاہ' مُصفَرًّا ثُمَّ یَجعَلَہ' حُطَامًا اِنَّ فِی ذَالِکَ لَذِکرٰی لِاُولِی الاَلبابِ۔ (الزمر،۳۹:۲۱)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے بارش برسائی، پھر زمین میں پانی کے چشمے رواں ہو گئے پھر اس سے اس کے ذریعے رنگ برنگ کھیتیاں اگائیں (اور وہ لہلانے لگیں) پھر انہوں نے مزید نشوونما پائی اور وہ پک کر تیار ہو گئیں پھر (ترقی کے بعد ان پر ضعف اور انحطاط آیا اور) تم دیکھتے ہو کہ ان پر زردی چھا گئی پھر انہیں خشک کر کے ریزہ ریزہ کر دیا۔ بیشک اس (پورے نظام) میں دانشمندوں کیلئے بڑی عبرت ہے۔

جمادات، نباتات، حیوانات اور عالمِ انس ہر جگہ زندگی کے آغاز و انجام اور عروج و زوال کے یکساں قوانین کا نافذ العمل ہونا اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ ان تمام موجودات کو تخلیق کرنے اور

پالنے والی ذات ایک ہی ہے اور اس کی ربوبیت و پروردگاری میں ہر جگہ ایک ایک ہی اصول کارفرما ہے۔ یہی نظامِ وحدت اس کی وحدانیت پر دلیلِ قاطع ہے۔

نظامِ ربوبیت اور قرآن کی دعوتِ فکر

اس نے بنی نوعِ انسان کو کائناتِ پست و بالا میں کارفرما نظامِ ربوبیت کے مختلف مظاہر کی نسبت سوچنے اور سمجھنے کی کھلی دعوت دی ہے۔ قرآنی استدلال کا نقطِ اولی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و شعور اور فہم و بصیرت سے اسی لئے نوازا ہے کہ وہ اس کی مدد سے حقیقت کی راہ معلوم کرے۔ مظاہرِ قدرت کو تعقل اور تفکر کی آنکھ سے دیکھے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَکَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْھَا وَھُمْ عَنْھَا مُعْرِضُوْنَ۔ (یوسف، ۱۲:۱۰۵)

آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر ان کا گزر ہوتا رہتا ہے اور وہ ان پر دھیان نہیں کرتے۔

کان، آنکھ اور دل و دماغ ہر کسی سے باز پرس کا معنی یہ ہے کہ ان سے پوچھا جائے گا کہ کانوں کو سماعت اس لئے دی تھی کہ وہ حق کی آواز سنیں، آنکھوں کی بصارت اس لئے دی تھی کہ وہ حق کا نظارہ کریں اور دل و دماغ کو فہم و تدبر اس لئے دیا تھا کہ وہ حقائق و واقعات میں غور و فکر کریں، تاکہ انہیں سماعت، بصارت اور بصیرت کی تینوں راہوں سے ربوبیتِ الٰہیہ کی معرفت نصیب ہو۔

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ۔ (الذاریات، ۵۱:۲۰)

اور یوں تو یقین رکھنے والوں کے لئے زمین میں (بے شمار) نشانیاں ہیں۔

وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔ (الذاریات ۵۱:۲۱)

اور (اے لوگو) خود تمہارے نفسوں میں بھی (اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں) پھر کیا تم غور نہیں کرتے۔

خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوَاتِ وَالاَرضَ بِالحَقِّ اِنَّ فِی ذَالِکَ لَاٰیَۃ لِلمؤمِنِینَ (العنکبوت، ۲۹:۴۴)

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو ایک نظام کے مطابق بنایا (بے شک) اس میں ایمان لانے والوں کے لئے بڑی نشانی ہیں۔

نظامِ کائنات: ربوبیتِ الہیہ پر دلیلِ ناطق

خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالاَرضَ بِالحَقِّ یُکَوِّرُالَّیلَ عَلَی النَّھَارِ وَیُکَوِّرُالنَّھَارَعَلَی الَّیلِ وَسَخَّرَ الشَّمسِ وَالقَمَرَ کُلٌّ یَجرِی لَاجَلِ مُّسَمًّی الاھُوَ العَزِیزُالغَفَّار۔ (الزمر، ۳۹:۵)

اس نے (اپنی قدرت کاملہ) سے آسمان اور زمین کو صحت تدبیر اور درستی کے ساتھ بنایا، وہ رات کو دن پر لپیٹتا اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے اور اسی نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ (سب اس کے حکم کے تابع اپنے اپنے کاموں پر لگے ہیں) سب ایک وقت معین تک) اسی طرح (چلتے رہیں گے۔) پھر ان کی پرستش کرنا کہاں کی عقلمندی ہے (یادرکھو) لائق پرستش (وہی صاحبِ عزت بخشنے والا) اس کی پرستش کرو وہ زبردست بھی ہے اور بڑا بخشنے والا بھی۔

قرآن خود ہی جواب دیتا ہے نہیں نہیں۔ تخلیق حق ہے، ایک ارادے اور مقصد کے ساتھ ہے، ایک خالق کے اِذن اور قدرت سے ہے اور ایک باقاعدہ نظام کے تابع ہے۔ اسی کا نام ربوبیت الہیہ ہے۔ سورۃ النمل میں ارشاد ہوتا ہے:

اَمَّن یَھدِیکُم فِی ظُلُمَاتِ البَرِّ وَالبَحرِوَمَن یُّرسِلُ الرِّیَاحَ بُشرًا بَینَ یَدَی رَحمَتِہ ءَ اِلٰہُ مَّعَ اللّٰہِ تَعَالَی اللّٰہُ عَمَّا یُشرِکُونَ۔ (النمل، ۲۷:۶۳)

بھلا کون تم کو خشکی اور تری کی تاریکیوں میں راستہ بتاتا ہے اور کون اپنی رحمت بارش سے قبل ہواں کو خوشخبری دے کر بھیجتا ہے کہ آنے والی رحمت کی نشانیاں قلب پر منکشف ہونے لگتی ہیں (اب بتا)

کیا ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ ان کے شرک سے بہت بلند و برتر ہے۔

اب قرآن مجید باری تعالیٰ کی توحید مطلق، ربوبیت کاملہ اور قدرت واسعہ کی طرف متوجہ کرنے کے لئے انتہائی موثر نفسیاتی اسلوب اپنا رہا ہے اور انسانی زندگی کے مختلف گوشوں، ضرورتوں اور تقاضوں کو موضوعِ کلام بنا رہا ہے:

اَفَرَءَ یۡتُم مَاتُمنُونَ۔ بھلا دیکھو جس نطفہ کو تم ٹپکاتے ہو (اس سے انسان کون بناتا ہے)۔

ءَ اَنتُم تَخلُقُونَه اَم نُحنُ الخَالِقُون۔ کیا اس کو تم (انسان) بناتے ہو یا اس کے بنانے والے ہم ہیں۔

عَلٰٓی اَن نُبَدِل اَمثَالَکُم وَنَنشِئَکُم فِی مَالَا تَعلَمُون ۔اس بات سے کہ (تم کو اس دنیا سے اٹھا لیں اور) تمہاری طرح کے اور لوگ تمہاری جگہ لے آئیں اور تم کو ایسی حالت (صورت یا ایسے جہان) میں پیدا کریں جس کو تم نہیں جانتے۔

اِنَّا لَمُغرَ مُونَ۔ ہم تو تاوان میں پڑ گئے (قرض دار بھی ہوئے اور کچھ نہ ملا)۔

نظامِ ربوبیت اور انسانی زندگی کا کیمیائی ارتقاء

حیاتِ عالم میں نظامِ ربوبیت کے مظاہر

ربو بیب اور تربیت ور بوبیت کا معنی ارتقائی تدریجی اور مرحلہ وار پرورش کے مفہوم پر ہی دلالت کرتا ہے۔ رب العالمین کے الفاظ کے ذریعے اس امر کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ کائنات ہمیں جس شکل میں آج نظر آ رہی ہے یہ اس کی وہ اصل ابتدائی شکل نہیں، جس میں اسے اولاً تخلیق کیا گیا تھا بلکہ تخلیقی ارتقا کے مختلف مراحل اور مدارج طے کرتی ہوئی یہاں تک پہنچتی ہے۔

امرِ تخلیق اور اصولِ ارتقا

قرآن مجید رب العالمین کی شانِ تخلیق کو دو الفاظ امر اور خلق کے ذریعے واضح کرتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

اَلَالَہٗ الخَلقُ وَالاَ مرُ ۔ (الاعراف، ۷:۵۴)

خبردار ! اسی کے لئے ہے خلق بھی اور امر بھی۔

اس حوالے سے امر ابداع (عدم سے وجود میں لانا) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور خلق کا ایک استعمال ابداع کے مقابلے میں ایجادالشیئ من الشیئ (ایک شے سے دوسری شے وجود میں لانا) کے معنی میں ہوتا ہے۔ امر پہلا مرحلہ ہے اور خلق دوسرا۔

کن، ارادحق یا مشیتِ ربانی سے اس شے کو جس کا وجود پہلے فقط درجہ علم میں ہوتا ہے دو صفات عطا کردی جاتی ہیں:

۱۔ منظوریت (Objectivity)

۲۔ استمرار (Persistence/Existence)

جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شئے وجودِ علمی سے وجودِ خارجی میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اب دیکھے جانے کے قابل ہو جاتی ہے اور برقرار رہ سکتی ہے۔ یہ عالمِ غیر نامی (inorganic world) کا آغاز ہوتا ہے۔ جمادات وغیرہ کا تعلق اسی عالم سے ہے بعدازاں اسے امرِ کن کے فیضانِ مسلسل سے صفتِ نمو (Organism) عطا کر دی جاتی ہے اور عالم نامی (Organic world) وجود میں آ جاتا ہے۔ نباتات کا تعلق اس عالم سے ہے پھر اس عالم سے امر کن کے ذریعے سے ہی شعور (Conscience) کا اضافہ کیا جاتا ہے تو عالمِ حیوانات (Animal world) کا ظہور عمل میں آتا ہے۔ ہر چیز خواہ اس کا تعلق کسی بھی عالم سے ہو وہ ایک ارتقائی نظام کے تحت وجود میں لائی گئی ہے۔ یہی رب العالمین کا مفہوم ہے۔

کیمیائی ارتقا کے سات مراحل

انسانی زندگی کا کیمیائی ارتقا کم و بیش سات مرحلوں سے گزر کر تکمیل پذیر ہوا۔

۱۔تراب (inorganic matter)

۲۔ماء (water)

۳۔طین (Clay)

۴۔طین لازب (adsorbable clay)

۵۔صلصال من حما مسنون (old physically & chemically altered mud)

۶۔صلصال کالفخار (dired & highly purified clay)

۷۔سلالہ من طین (extract of purified clay)

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نبوت و ولایت کے مقاماتِ رفیعہ سے نوازا اور ختمِ نبوت کے بلند ترین منصب پر رسولِ اکرم ﷺ کو فائز کر کے سب سے ارفع درجے تک پہنچا دیا۔ اگرچہ نوعِ بشر کو یہ تمام مناصب عطا ہوئے لیکن رسول معظم ﷺ کو وہ تقدس اور عظمت حاصل ہوئی کہ انہیں ان تمام عوارض سے مبرہ و منزہ کر دیا گیا جن کا انسان شکار ہو سکتا ہے۔

انسانِ واحد سے بنی نوعِ انسان کا ظہور

اس میں نفسِ واحدہ کے الفاظ معنوی طور پر ایک فرد پر دلالت کرتے ہیں۔ اس کا اطلاق امیبا یا اس جیسے دوسرے یک خلوی جانداروں پر نہیں ہوتا۔ ایسا اس لئے کہ یک خلوی جانداروں میں کوئی ازدواجی یا زناشوئی کا تعلق نہیں ہوتا اور وہ بغیر کسی جنسی عمل کے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ یہ فطری مظاہراتی عمل لاکھوں سال سے بغیر کسی تبدیلی کے جاری و ساری ہے اور آج تک اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ لہٰذا ایک خلوی جانداروں میں مذکر اور مؤنث کا

کوئی وجود نہیں ۔جیسا کہ ارشاد فرمایا:

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلآئِکَۃِ اِنِّی خَالِقٌ بَشَرًمِن صَلصَالٍ مِن حَمَاءٍ مَّسنُونٍ ۔(الحجر،۱۵:۲۸)

اور(وہ واقعہ یاد کیجئے) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں سنِ رسیدہ (اور) سیاہ بودار، بجنے والے گارے سے ایک بشری پیکر پیدا کرنے والا ہوں۔

اس بنا پر یہ قرآنی بیان مطلقاً مفروض ارتقا کو رد کرتا ہے۔اس میں اس امر کا اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کی تخلیق گارے سے ہوئی نہ کہ یک خلوی جانداروں اور دوسرے حیوانوں سے اگرایسا ہوتا تو بصورتھ دیگر دابہ کالفظ طین کی جگہ استعمال کیا جاتا۔قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَمَا مِن دَآبَّۃٍ فِی الاَ رضِ وَلَاطَآئِرٍ یَّطِیرُ بِجَنَاحَیہِ اِلَّا اُمَمٌ اَمثَالُکُم ۔(الانعام،۶:۳۸)

اور(اے انسانوں) !کوئی بھی چلنے پھرنے والا (جانور) اور پرندہ جو اپنے دو بازوں سے اڑتا ہو (ایسا) نہیں ہے مگر یہ کہ (بہت سی صفات میں) وہ سب تمہارے ہی مماثل طبقات ہیں۔

اپنڈکس ہرگز غیر ضروری نہیں

اپنڈکس جسم کے چند مستعد ترین اعضا میں سے ایک ہے جو نچلے بدن کے لئے لوزتین (tonsils) کا کام کرتی ہے۔وہ آنتوں کا لعاب چھوڑتی اور آنتوں کے بیکٹیریا کی اقسام اور ان کی تعداد میں باقاعدگی لاتی ہے۔

ریاضی(Mathematics)

ریاضیاتی اعتبار سے بھی ارتقا بالکل ناممکن ہے۔امیبا سے کیڑا بننے تک ارتقا کے لئے جینی کوڈ میں 1020*39 تبدیلیاں مطلوب ہیں، جو فی سیکنڈ ایک تبدیلی کی شرح سے 100 کھرب سال .... گویا موجودہ کائنات کی عمر سے 500 گنا زیادہ وقت ...... میں مکمل ہوسکتی

ہیں۔ایک بوزنہ (ape) سے انسان بننے کے ارتقائی عمل کے لئے 3*10520 تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔

اسلامی تصورِ تخلیق ہی حق ہے

حقیقت یہی ہے کہ دنیا میں کوئی جانور بھی اِرتقائی عمل کی پیداوار نہیں۔قرآن مجید میں ارشاد ہے:

لَقَد خَلَقنَا الاِنسَانَ فِی اَحسَنِ تَقوِیم ۔(التین،۹۵:۴)

بیشک ہم نے انسان کو بہترین (اعتدال اور توازن والی) ساخت میں پیدا فرمایا ہے۔

اس آیتِ کریمہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انسان ایک الگ مخلوق کے طور پر معرضِ وجود میں آیا ہے اور یہ کسی دوسری مخلوق سے ارتقا کے نتیجے میں ظاہر نہیں ہوا۔انسان کی تخلیق خلقِ آخر ہونے کے ناطے تخلیقِ خاص (Special creation) ہے، جسے اللہ رب العزت نے ایک مناسب وقت پر تخلیق کیا۔

بشریتِ محمدی ﷺ کی جوہری حالت

حضور ﷺ کا پیکرِ بشریت بھی نور کی طرح لطیف تھا۔آپ ﷺ کی بشریتِ مطہرہ کے اس پاکیزہ اور نورانی جوہر کی حالت کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے پیکرِ اقدس پر کبھی مکھی نہیں بیٹھتی تھی۔جیسا کہ کتبِ سیر و فضائل میں صراحتاً منقول ہے:

اِنَّ الذُبَابَ کَانَ لَا یَقعَ عَلٰی جَسدِہٖ وَلَا ثِیَابِہٖ ۔(الشفاء۱:۵۲۲)

مکھی نہ تو آپ ﷺ کے جسدِ اقدس پر بیٹھتی تھی اور نہ آپ کے لباس پر۔

نظامِ ربوبیت اور رحمِ مادر میں انسانی وجود کا ارتقا

یہاں یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ انسانی تخلیق میں باری تعالیٰ نے نظامِ ساعت کو نظام

ِبصارت اور نظامِ عقل وفہم پر مقدم رکھا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا:

ثُمَّ سَوّٰهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۔ (السجدہ، ۳۲:۹)

پھر اسے (اعضائے جسمانی کے تناسب سے) درست کیا اور اس میں اپنی طرف سے جان پھونکی اور تمہارے لئے (سننے اور دیکھنے کو) کان اور آنکھیں بنائیں اور (سوچنے سمجھنے کے لئے) دِماغ، اگر تم کم ہی (ان نعمتوں کی اہمیت اور حقیقت کو سمجھتے ہوئے) شکر بجالاتے ہو۔

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر ارشاد ربانی ہے:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا۔
(الدھر، ۷۶:۲)

بیشک ہم نے انسان کو مخلوط نطفے (mingled fluid) سے پیدا کیا۔ پھر ہم اسے مختلف حالتوں میں پلٹتے اور جانچتے ہیں، حتیٰ کہ اسے سننے والا (اور) دیکھنے والا (انسان) بنا دیتے ہیں۔

یہاں بھی اس امر کی بخوبی صراحت ہے کہ انسانی ایمبریو (embryo) کی نشوونما میں انسان کے نظامِ سماعت کو پہلے وجود میں لایا جاتا ہے اور نظامِ بصارت بعد میں تشکیل پاتا ہے۔ انسان کی تخلیق مخلوط قطرے یعنی نطف امشاج سے ہوئی ہے۔ دو گمٹیوں سے بننے والا خلیہ زائیگوٹ کی تشکیل مادہ منویہ اور بیضئہ خلیہ کے ملاپ سے ہوتی ہے۔ سورۃ المؤمنون میں ارشاد ہے:

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً۔ (المؤمنون، ۲۳:۱۴)

پھر ہم نے اس نطفہ کو (رحمِ مادر کے اندر جونک کی صورت میں) معلق وجود بنا دیا پھر ہم نے اس معلق وجود کو ایک (ایسا) لوتھڑا بنا دیا (جو دانتوں سے چبایا ہوا لگتا ہے)۔

لفظِ علق خون چوسنے والی جونک کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس سے مراد ٹھیک سات سے چوبیسویں دن کے دوران انسانی جنین کی حالت ہے جب وہ بیض رحم کی (Endometruim) کے

ساتھ اسی طرح چپکا ہوتا ہے جیسے جونک جسم کی کھال کے ساتھ چپکی ہوتی ہے۔ہم نے اس معلق وجود کو جو جونک سے مشابہت رکھتا ہے،لوتھڑے کی شکل دی سورۃ المؤمنون کی مذکورہ آیت نمبر 14 میں عربی لفظ 'مُضغۃ' کا معنی دانتوں سے چبایا ہوا گوشت کا لوتھڑا ہے۔ یہ چبائی ہوئی شکل دانتوں کے نشانات سے مشابہ عضلات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ عضلات ریڑھ کی ہڈی اور جانوروں کے بنیادی اجزا کی ابتدائی صورتوں کے مظہر ہیں:

فَخَلَقنَا المُضغَۃَ عِظٰمًا فَکَسَونَا العِظٰمَ لَحمًا ۔ (المؤمنون،۲۳:۱۴)

پھر ہم نے اس لوتھڑے سے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنایا، پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔

آنکھوں کے عضلات کی ساخت سے پہلے اندرونی کانوں کے حصے تشکیل پاتے ہیں اور دماغ جو تفہیم اور سوجھ بوجھ کا مقام ہے سب سے آخر میں وجود میں آتا ہے۔

وَنُقِرُّ فِی الارحَامِ مَا نَشَاءُ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی ۔ (الحج،۲۲:۵)

اور ہم جسے چاہتے ہیں رحموں میں مقررہ مدت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں۔

العٰلمین کا مفہوم

اَلعَالَم اِسمٌ لِمَا یعلم بہ ۔ (المفردات:۵۸۱)

عالم وہ اسم ہے جس سے کسی کو جانا اور پہچانا جائے۔

گویا عالم وسیلۂ علم ہے۔ عالم علامت میں سے نکلا ہے،اسے عالم اس لئے کہتے ہیں کہ یہ خالق کے وجود کی علامت ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی معرفت کے ذریعے اور وسیلے کے طور پر پوری کائنات کو تخلیق کیا ہے۔ایسی کائنات جو ممکن الوجود ہے مگر واجب الوجود پر دلالت کر رہی ہے۔ عالم ذریع علم ہے اور وہ ذاتِ حق خود مقصودِ علم ۔امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

العالم الته فی الدلالته علی صانعه ۔ (المفردات،۸۲:۵۸)

عالم اپنے بنانے والے کے وجود کیلئے آلہ دلالت ہے۔

اسی قبیل سے علم ہے، جس کے معنی جھنڈے کے ہیں۔ وہ بھی کسی عمارت، دفتر، شخصیت یا لشکر کی علامت ہوتا ہے۔ اندھیری رات میں اگر کہیں دیا جل رہا ہو جو وہاں کسی انسان کی موجودگی کا پتہ دے تو اسے بھی علم کہا جائے گا۔

العلمین کتنی کائناتوں کو محیط ہے!

انواعِ خلق کے لحاظ سے ایک عالم پوری کائنات ہے تو پھر عالمین کی وسعت کتنے عالموں اور کائناتوں کو محیط ہوگی۔ حضرت وہب بن منبہ بیان کرتے ہیں:

اللہ تعالی کے تخلیق کردہ اٹھارہ ہزار عالم ہیں اور دنیا ان میں سے ایک ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَمَا یعلَم جُنُودَ رَبِكَ اِلَّا هُوَ ۔ (المدثر،۷۴:۳۱)

اور آپ کے رب کے لشکروں کو بجز اس کے کوئی نہیں جانتا۔

یہاں لشکروں سے مراد مختلف انواعِ خلق ہیں، جو ارض وسما کی وسعتوں میں جدا جدا عالموں میں موجود ہیں، جن کی صحیح تعداد اور حتمی تفصیلات خالقِ کائنات کے سوا کسی اور کو معلوم نہیں۔ اسی طرح ارشاد فرمایا گیا:

وَیَخلَقُ مَالَا تَعلَمُون ۔ (النحل،۱۶:۸)

اور وہ اس قدر تخلیق کرتا ہے کہ تمہیں خبر تک نہیں۔

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سلسلہ تخلیق ازل سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ بنابریں اس کے تخلیق کردہ عوالم اس قدر ہیں کہ کسی کو ان کا اندازہ بھی نہیں۔ اس امر کی تائید اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے:

یَزِیدُ فِی الخَلقِ مَا یشآءُ ۔ (فاطر،۳۵:۱)

وہ اپنی تخلیق میں اضافہ فرما رہا ہے جیسے وہ پسند کرتا ہے۔

یہ سب مقامات بتاتے ہیں کہ نا معلوم دن بدن اور لحظہ بہ لحظہ کتنی کائناتیں اور عوالم منصۂ خلق پر ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ چنانچہ جن علما نے مختلف عالموں کی تعداد کا ذکر کیا ہے وہ کسی نہ کسی خاص نسبت اور جہت سے کیا ہے۔

۱۔ اہلِ علم پر جوں جوں علوم وفنون منکشف ہوتے رہے ہیں وہ اپنی اپنی بساط اور ذوق وفہم کے مطابق عالمین کی اقسام بیان کرتے رہے ہیں۔ کوئی عالمِ اجسام اور عالمِ ارواح کی تقسیم اس طور بیان کرتا ہے کہ عالمِ اجسام میں پھر اجسام علویہ اور اجسام سفلیہ کے عوالم ہیں۔ اجسامِ علویہ میں شمس وقمر دیگر سیارات، افلاک وکواکب، عرش وکرسی، سدرالمنتہیٰ، لوح وقلم اور جنت وغیرہ کے عالم شامل ہیں۔ اجسامِ سفلیہ میں کرارض، کرما، کرہوااور کرنار ہیں۔

۲ ۔ بعض اہلِ علم عالمِ اکبر اور عالمِ اصغر کی تقسیم کرتے ہیں۔ عالمِ اکبر سے مراد ساری خارجی کائنات ہے، جس کی وسعتیں زمین وآسمان کو محیط ہیں اور عالمِ اصغر خود وجودِ انسانی ہے جو عالمِ اکبر کی جملہ حقیقتوں کا جامع ہے۔ عالمِ اکبر جن حقائق کی تفصیل ہے، عالمِ اصغران سب کا اجمال ہے۔ بایں طور کائناتِ عالمِ مفصل ہے اور انسان عالمِ مجمل۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَفِی الارضِ اٰیٰاتٌ لِلمُوقِنِین۔ وَفِی انفسِکُم اَفَلا تُبصِرُون ۔

(الذٰریٰت،۵۱: ۲۰،۲۱)

اور زمین میں یقین والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ اور خود تمہارے اندر بھی نشانیاں ہیں کیا تمہیں نہیں سوجھتا۔

اسی طرح **سَنرِیھِم اٰیٰتِنَافِی الآفَاقِ وَفِی وَفِی اَنفُسِھِم** میں واضح طور پر عالمِ انفس اور عالمِ آفاق کا ذکر ہے۔ دونوں میں فرق یہی ہے کہ جو آیاتِ الٰہیہ عالمِ آفاق میں منتشر ہیں وہ سب عالمِ انسان میں مجتمع ہیں۔ اس لئے کہا گیا ہے:

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ (روح المعانی، ۱:۹۷)

جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا پس اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

رب العلمین سے پتہ چل رہا ہے کہ رب ایک ہے، کیونکہ رب کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ العلمین میں شامل ہے۔ جو لفظِ رب کا مضاف الیہ اور ذاتِ رب کا مربوب ہے۔ جب ایک رب ہے اور باقی عالم تو اشتراک کا امکان کہاں سے ہو گیا! مضاف الیہ کو مضاف کیسے سمجھا جائے، مربوب کو مربی کیسے کہا جائے، زیرِ پرورش کو پرورش کرنے والا کیسے بنایا جائے، مخلوق کو خالق محتاج کو مستغنی ممکن کو واجب اور زیرِ کفالت کو کفیل کیسے سمجھ لیا جائے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ شرک کا گمان ہی عقل کے نقصان یا فقدان پر دلالت کرتا ہے۔

رب العلمین محض ایک آدھ صفت سے خاص نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ہمہ صفتی رب ہے۔ اس کی ربوبیت کل کائنات کے لئے ہے، جو ہر شے کی ہر ضرورت کی کفالت کی ذمہ دار ہے۔ چونکہ موجوداتِ عالم کی ضرورتیں بے شمار ہیں، اس لئے رب العلمین کی صفات بھی بے شمار ہیں، جن سے وہ ہر زیرِ پرورش وجود کی ہر ضرورت کی تکمیل فرماتا ہے۔ مخلوقات عالم میں سے اہم ترین مخلوق انسان ہے اور انسان کی جملہ ضروریات میں سے اہم ترین ضرورت ہدایت اور زندگی کا لائحہ عمل ہے، جس کی تعمیل شریعت اور روحِ ربانی کے بغیر ممکن نہیں۔

رب العلمین کے الفاظ خود جزا و سزا کے نظام کا اثبات کر رہے ہیں کیونکہ وہ تربیت ہی کیسی جس کے اختتام پر امتحان نہ ہو اور نیک و بد کے ساتھ انجام کار صحیح انصاف نہ ہو۔ پس وہی شخص اللہ تعالی کو محبوب تر ہے جو لوگوں کے رویے، کردار، حسد اور مخالفت و مخاصمت سے بے نیاز ہو کر رحمت اور بھلائی کی خیرات بانٹتا چلا جائے۔ اس کا مقصود کسی سے انتقام لینا نہ ہو، بلکہ ہر ایک کے لئے بھلائی چاہنا ہو، جو مخلوق خدا کی جس قدر بڑھ کر پرورش کرے گا اللہ تعالی کے فیضان پرورش سے اسی قدر زیادہ فیض پائے گا۔

دوزندگیاں

جس طرح یکے بعد دیگرے انسان پر دوموتیں وارد ہوتی ہیں، اسی طرح یکے دیگرے انسان کو دوزندگیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ان میں سے پہلی زندگی تو واضح ہے کہ اس مرادِ عالمِ شہادت میں رنگ و کیف کی موجودہ زندگی ہے، یہ نور وظلمت اور ہست و بود کی زندگی ہے۔ مگر دوسری زندگی سے مراد قیامت کی زندگی نہیں، بلکہ عالمِ برزخ کی زندگی ہے۔ یہ مرنے سے لے کر قیامت تک کی زندگی ہے۔ برزخ دو چیزوں کے درمیان روک اور آڑ کو کہتے ہیں۔ اصطلاحِ شریعت میں اس سے مراد موت سے قیامت تک کا درمیانی عرصہ ہے، جو ایک طرح سے روک سے مماثلت رکھتا ہے۔ اس درمیانی عرصے کے لئے برزخ کا اطلاق اس زندگی کی عمومیت پر دلالت کرتا ہے اور اس سے مراد فقط قبر نہیں بلکہ انسان کی ہر وہ حالت ہے جس سے وہ اس درمیانی عرصے میں دوچار رہتا ہے۔ خواہ قبر ہو، غرق ہو، حرق) جلنا (ہو یا کسی جانور کا نگل جانا ہو۔ اس کی زندگی کا اصطلاحی نام حیاتِ برزخی ہے جبکہ اخروی زندگی (آخرت) کا آغاز اس وقت سے ہوگا جب اس زندگی اور اس مادی کائنات کو کلیتہً فنا کر دیا جائے گا۔

قرآن حکیم انسانوں کی راہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا وہ دستورِ حیات ہے جس کے قوانین وضوابط مکمل، ہمہ گیر، دائمی اور ابدی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سرچشمہ رشد و ہدایت سے سیراب ہونے کے ساتھ اس کی تکریم کا بھی حکم دیا ہے۔ اس تکریم کے دو پہلو ہیں: ایک ظاہری اور باطنی۔ اس کے باطنی احترام کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو منزل من اللہ سمجھا جائے اور اس سے متعلق ہر طرح کے شک اور وسوسے سے اپنے دل کو پاک رکھا جائے۔ قرآن حکیم کی تعظیم و تکریم کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ اسے ذوق وشوق سے پڑھا جائے اور سمجھا جائے۔ اگر ذکرِ عذاب پر خوف طاری نہ ہو، اگر جنت کی بشارت و خوش خبری پر بشاشت پیدا نہ ہو، اگر جہاد کے حکم سے حرارتِ ایمانی پیدا نہ ہو، اور اگر عظمت و کبریائی کے ذکر سے دل مائل بہ سجود نہ ہوں تو اس کی تکریم کا حق ادا نہیں ہو گا۔ قرآن اگر روح ہے تو آپ ﷺ اس کا قالب ہیں، قرآن اگر جان ہے تو حضور اکرم ﷺ اس کا جسم ہیں۔ اسلام کا اساسی اور بنیادی عقیدہ عقید توحید ہے اور یہ اسلامی نظامِ زندگی کی شہ رگ ہے۔ آیۃ الکرسی میں ذات واجب الوجود کے بارے میں انسانی ضمیر کی تطہیر کی گئی ہے۔ اس میں مقامِ الوہیت اور مقامِ عبدیت کی اچھی طرح وضاحت کی گئی ہے، الوہیت اور عبدیت کے تمام تر تقاضوں اور حدود و شرائط کو تفصیلا اجاگر کیا گیا ہے۔

(معارف آیۃ الکرسی افادات شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری صفحہ ۲۳)

کبھی تلوار کے وار خالی جاتے ہیں اور کبھی خواب سچے نکلتے ہیں۔

اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اَلَّا ھُوَ: اللہ ذات واجب الوجود کا اسم ذاتی ہے۔ لانفی جنس الہ معبود۔ الا کلمہ استثنا ھو ضمیر واحد مذکر غائب یعنی اللہ وہ ہے کہ کوئی معبود نہیں مگر صرف وہ۔

اَلحَیُّ: حیی اصل میں حیو تھا۔ واوی ہوکری میں مدغم ہوگیا۔ یہ حیات سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں زندگی، الحیی زندہ کامل حیات کا مالک جس پر کبھی فنا طاری نہ ہو سکے۔ کمالِ وجودیہ میں سب سے پہلا کمال حیات ہے۔ حیی لغت میں اس زندہ شے کو کہتے ہیں جو واقف ہو، سنتا ہو، دیکھتا ہو اور قادر ہو۔ پس صفتِ حیات تمام صفاتِ کمال کا مبدا ہے۔

القیوم: قیوم وہ جو نہ صرف اپنی ذات سے قائم ہو بلکہ دوسروں کے بھی قیام کا سبب ہو۔

لا تا خذہ سنۃ ولا نوم: سن اونگھ اس کا مادہ وسنہے یعنی غفلت اور خواب، نوم، نام ینام نوما سے ہے۔ نہ اس پر اونگھ طاری ہوتی ہے اور نہ نیندوہ ہر وقت باخبر اور مستعد ہے۔ نیند کی ابتدا اور انتہا دونوں کی نفی کی گئی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ غفلت اور لاپرواہی کے اثرات سے پاک ہے۔

لہ ما فی السموت وما فی الارض: یعنی زمین وآسمان میں جو کچھ ہے صرف اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے کسی اور کا کوئی حق نہیں۔

من ذاالذی یشفع عندہ الا باذنہ: شفاعت کے لیے اذنِ الٰہی کی قید ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کسی کو شفاعت کا حق حاصل نہیں۔ یہ بات اس کے مختارِ مطلق ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم: جو کچھ ان کے سامنے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے یعنی وہ تمام کائنات کے اول وآخر کا کامل علم رکھتا ہے۔

ولا یحیطون بشیءٍ من علمہ اِلا بماشآءَ: بماشا جو کچھ وہ

چاہے ماموصول ہے۔

وسع کرسیه السموت والارض :

ولا یوده حفظهما: ولا یوده) اد، یوداودا (واحد مذکر غائب اس کا مادہ اود ہے۔جس کے لغوی معنی جہد و مشقت کے ہیں۔ حفظہما سے مراد ان دونوں کی حفاظت یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات پر آسمانوں اور زمین کی دیکھ بھال گراں نہیں ہے۔اس کو کسی کی مدد اور سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔

وھوالعلی العظم : یہ دونوں اسم صفت ہیں۔العلی کا مادہ علو ہے اور عظیم کا مادہ ع۔ظ۔م ہے۔

سورۃ فاتحہ کی تلاوت کا اجر وثواب قرآن حکیم کی دوتہائی تلاوت کے برابر ہے۔سورۃ اخلاص کا ایک بار پڑھنا قرآن حکیم کے ایک تہائی حصہ کے اجر وثواب کے برابر ہے۔

جس شخص نے ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھی اسے جنت میں جانے سے موت کے سوا کوئی اور چیز روکنے والی نہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے پوچھا: تمہارے ساتھ کتاب اللہ کی کون سی آیت سب سے عظیم ہے انہوں نے کہا '**اللہ لا الہ الاھوالحی القیوم۔**

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی کو پڑھا، اللہ تعالیٰ اس کو دوسری نماز تک اپنی حفاظت میں رکھتا ہے اور آیت الکرسی کی حفاظت صرف نبی، صدیق یا شہید ہی کرتا ہے۔اس سے ثابت ہوا ہے کہ فرض نمازوں کے بعد آیت الکرسی کا پڑھنا نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کی سنت پر عمل کرنا ہے۔

سوتے وقت اگر کوئی آیت الکرسی پڑھ لے تو رات بھر اللہ تعالیٰ کا ایک نگہبان اس کی حفاظت کرتا

ہے اور اس سے شیطان قریب نہیں آ سکتا۔ آیت الکرسی ہر طرح کے شر و فتنہ و فساد کے تدراک کے لیے اکسیرِ عظیم کا درجہ رکھتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔ سورۃ بقرہ میں ایک آیت ہے یہ قرآن کی آیتوں کی سردار ہے جس گھر میں یہ پڑھی جائے گی اگر اس میں شیطان ہے تو وہ یقیناً نکل بھاگے گا یہ آیت، آیت الکرسی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کمزور نہیں بلکہ اسے شیطانی اور ابلیسی قوتوں پر غالب ہونے کی طاقت ودیعت ہوئی ہے۔ نفس اور شیطان کے سامنے ہتھیار ڈال کر یہ کہنا کہ میں کمزور ہوں یہ غلط ہے۔

حضرت قتادہؓ سے مروی ہے کہ جو شخص بستر پر لیٹ کر آیت الکرسی پڑھتا ہے صبح تک دو فرشتے اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے آیت الکرسی کی ایک زبان اور دو ہونٹ ہیں وہ ساقِ عرش کے پاس مالک کائنات کی تسبیح و تقدیس کرتی ہے۔ آیت الکرسی کی یہ حقیقت اور عظمت ہے کہ اس کا تلاوت کرنے والا مسلسل ذکر کی لذتوں سے سرشار رہتا ہے اور وہ شخص حفاظتِ خداوندی میں رہتا ہے۔

حضرت ابو ذر نے عرض کیا یا رسول اللہ ! آپ کے اوپر سب سے عظیم آیت کون سی نازل ہوئی حضور ﷺ نے فرمایا: 'اللہ لا الہ الا ھو الحیی القیوم' اخیر تک پڑھی۔ جو شخص آیت الکرسی پڑھتا ہے اللہ تعالی بذاتِ خود اس کی روح قبض فرماتا ہے گویا آیت الکرسی کی کثرتِ تلاوت کے نتیجے میں وہ شخص اعزاز یہ کمال و عزت حاصل کرتا ہے۔

ابو امامہ سے روایت ہے جو ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھتا ہے اللہ تعالی بذاتِ خود اس کی روح قبض فرماتا ہے اور وہ اس مجاہد کا درجہ پاتا ہے جس نے اللہ تعالی کے نبیوں اور رسولوں کی جانب سے جہاد کیا ہو اور وہ اس میں شہید کیا گیا ہو۔

حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھتا ہے اسے جنت میں داخل ہونے سے صرف موت روکے رکھتی ہے اس کا انتقال ہوا نہیں کہ جنت میں داخل ہوا اور جو شخص سوتے وقت آیت الکرسی پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گھر اور اس کے پڑوسی کے گھر اور اس کے آس پاس کے گھروں کو امان دے دیتا ہے۔

آیت الکرسی رحمانی حصار ہے۔ اہلِ اللہ قرآنی آیات کے دم سے اور ذکر سے جو بیماروں کے گرد حصار بناتے ہیں وہ اصلاً اس حدیث سے ثابت ہے۔ لہٰذا آیات و احادیث کے نورانی کلمات سے روحانی علاج کرنا شرعاً درست ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا آیت الکرسی عرش کے نیچے سے مجھے دی گئی اور مجھ سے پہلے کسی اور نبی کو یہ نہ دی گئی۔ جو شخص فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھے گا وہ دوسری نماز تک اللہ کے ذمہ اور حفاظت میں رہے گا۔

حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت ہے ایک شخص حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے شکایت کی کہ اس کے گھر کی چیزوں میں کوئی برکت نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: کیا تم آیت الکرسی نہیں پڑھتے؟ جس کھانے اور سالن پر تم آیت الکرسی پڑھو گے اللہ تعالیٰ اس کھانے اور سالن میں برکت دے گا۔

آیت الکرسی کو قرآن کریم کی عظیم ترین آیت ہونے کا امتیاز اس لیے حاصل ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے بنیادی اسما و صفات کو حاوی ہے۔ مثلاً معبودیت، وحدانیت، حیات، علم، قیومیت، مالکیت، قدرت، ارادہ وغیرہ صفات اس میں پائی جاتی ہیں اور یہی اسما و صفات میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ ذکر کی جانے والی چیزوں میں اللہ تعالیٰ سب سے عظیم ہے اس لیے اس کی توحید کا ذکر بھی تمام ذکروں میں عظیم ترین ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی مخلوقات جنت

ودوزخ، آسمان وزمین میں سے کوئی بھی سورۃ بقرہ کی آیت، آیت الکرسی سے زیادہ عظمت کی حامل نہیں۔آسمان وزمین اور پہاڑ کوئی بھی آیت الکرسی سے عظمت میں بڑھا ہوا نہیں۔

جو شخص ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھتا ہے اسے اللہ تعالی شکر گزار بندے کا دل، صدیقین کا عمل اور انبیا کا ثواب عطا فرماتا ہے اور اس کے اوپر اپنا دست رحمت پھیلاتا ہے اور وہ انتقال کرتے ہی جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے حضورﷺ نے فرمایا: جو شخص کرب واضطراب کے وقت آیت الکرسی اور سورۃ بقرہ کی آخری دو آیتیں پڑھے گا اللہ تعالی اس کی فریاد رسی فرمائے گا۔حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسولﷺ نے فرمایا: قرآن کی سب سے عظیم آیت **اَللّٰہ لا لہ الا ھو الحیی القیوم** ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہﷺ نے فرمایا: قرآن کی آیتوں کی سردار آیت الکرسی ہے۔

آیت الکرسی سے چند فوائد مستبط کیے گئے ہیں:

1- پہلا فائدہ یہ ہے کہ سارا قرآن اللہ تعالی کا کلام ہے۔مگر اس کی آیات کی تاثیرات جداگانہ ہیں۔جیسے تمام انبیا واولیاء اللہ تعالی کے پیارے ہیں مگر ان کے مراتب مختلف ہیں۔

2- اللہ تعالی کے اصولی اسما وصفات یہ ہیں: وحدانیت، حیات، قیومیت، علم، ملک، قدرت اور ارادہ چونکہ آیت الکرسی میں ان سب کا ذکر موجود ہے اس لیے یہ آیت عظیم اذکار ہے۔

3- تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے شیطان بھاگتا ہے، بے چین دل کو چین آتا ہے۔اس سے غصہ، شر اور حرام شہوات دور ہوتی ہیں اور دین ودنیا کی حفاظت ہوتی ہے۔

اس سے ہر طرح کے شرک کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

1- توحید فی الالوھیت اور شرک فی الالوھیت

2- توحید فی الربوبیت اور شرک فی الربوبیت

3- توحید فی الذات اور شرک فی الذات

4- توحید فی الخلق والایجاد اور شرک فی الخلق والایجاد

5- توحید فی العبادت اور شرک فی العبادت

6- توحید فی القدرت اور شرک فی القدرت

7- توحید فی الدعا اور شرک فی الدعا

8- توحید فی العلم اور شرک فی العلم

9- توحید فی الاسماء والصفات اور شرک فی الاسماء والصفات

10- توحید فی الافعال اور شرک فی الافعال

11- توحید فی التحریم اور شرک فی التحریم

12- توحید فی النذور اور شرک فی النذور

13- توحید فی الحلف اور شرک فی الحلف

14- توحید فی الاحکام اور شرک فی الاحکام۔

جیسی اہم اور نازک مباحث کو آیت الکرسی کی روشنی میں بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

یہ آیتِ مبارکہ دس مستقل جملوں پر مشتمل ہے:

پہلا جملہ: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

دوسرا جملہ: اَلحَیُّ القَیُّومُ انہیں اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کی حیثیت حاصل ہے۔

تیسرا جملہ: لَا تَاخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوم اس کے برعکس مخلوقات کی صفات وہبی، عطائی ہونے کے ساتھ ساتھ مقید اور حادث ہیں۔

چوتھا جملہ: لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الاَرضِ اللہ تعالیٰ کی شانِ قیومی کے

لازمی منطقی نتیجے کی وضاحت وصراحت پر مشتمل ہے۔اس میں مالک الملک ہونے کا بیان بھی ہے اور الملک الحق ہونے کا اعلان بھی۔

پانچواں جملہ: مَن ذَاالَّذِی یَشفَعُ عِندَہ' اِلَّا بِاِذنِہ میں شفاعت باطلہ کا رداور شفاعت صحیحہ کا اثبات کیا گیا ہے۔

چھٹا اور ساتواں جملہ: یَعلَمُ مَا بَینَ اَیدِیھِم وَ مَا خَلفَھُم ۚ وَلَا یُحِیطُونَ بِشَیءٍ مِن عِلمِہٖ اِلَّا بِمَاشَآءَ یہ دونوں جملے اللہ تعالی کی شانِ الوہیت وقیومیت کے بیان اور اس کی صفاتِ کاملہ میں سے وجودِ واجب، حیاتِ کاملہ، قدرتِ مطلقہ، ملکیتِ تام اور اختیارِ کلی کی بالواسطہ تصریح کے بعد ان جملوں میں خالق اور مخلوق کے علم کے تقابل سے واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالی کا علم ذاتی بھی ہے اور کامل بھی۔اس کے برعکس ماسوٰی اللہ کا علم مقید، محدود اور خالص عطائی اور وہبی ہے۔

آٹھواں اور نواں جملہ: وَسِعَ کُرسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضَ ۚ وَلَا یَؤُدُہ حِفظُھُمَا آسمانوں اور زمینوں کی تمام وسعتیں اللہ تعالی کے احاطہ اقتدار میں ہیں اور پوری کائنات اسی کے زیرِ نگیں ہے۔

دسواں جملہ: وَھُوَالعَلِیُّ العَظِیم دو اسمائے حسنی پر مشتمل ہے یعنی وہ بلند وبالا بھی ہے اور بزرگ و برتر بھی اور صاحبِ عظمت وسطوت بھی ہے اور حاملِ شان وشوکت و بلندی بھی۔اللہ تعالی کی صفات اس کے وجود ہی کی طرح ذاتی بھی ہیں اور غیر محدود ولا متناہی بھی۔حضور نبی اکرم ﷺ نے اسے قرآن کریم کی عظیم ترین آیت بھی قرار دیا اور تمام آیاتِ قرآنی کی سردار بھی۔

آیت الکرسی اور اسماء وصفاتِ باری تعالی

آیت الکرسی میں اللہ تعالی کے سترہ اسماء گرامی مذکور ہوئے ہیں، بعض ظاہرا اور بعض

اشارو کنای۔جن کا بیان اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ آیت الکرسی کے مضامین اللہ تعالیٰ کی معرفتِ علمی کے حصول کے لیے مینار نور کا درجہ رکھتے ہیں۔وہ سترہ اسماء وصفاتِ باری تعالیٰ درج ذیل ہیں۔

1-اللہ 2-ھو 3-الحیی 4-القیوم 5-لاتاخذوہ کی ضمیر 6-لہ کی ضمیر 7-عندہ کی ضمیر 8-باذنہ کی ضمیر 9-یعلم کی ضمیر 10-علمہ کی ضمیر 11-شاءکی ضمیر 12-کرسیہ کی ضمیر 13-یودہ کی ضمیر 14-حفظھما کی ضمیر مستتر جو مصدر 'الحفظ کی فاعل ہے۔ 15-ھو 16-العلیی 17-العظیم

یہ اللہ تعالیٰ کی وہ صفات ہیں جن سے اس کی علمی معرفت کی راہ نصیب ہوتی ہے۔اس لحاظ سے آیت الکرسی معرفتِ الٰہی کا خزانہ بھی ہے اور اس کے وصال وقرب کا راستہ بھی۔جس طرح آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کے سترہ اسما وصفات مذکور ہوئے ہیں اسی طرح ہر ایک صفتِ الوھیت کے مقابلے میں ایک صفتِ عبدیت ہے۔اس اعتبار سے صفاتِ عبدیت بھی تعداد میں سترہ بیان کی جاسکتی ہیں۔

آیت الکرسی ربط بین الآیات کی روشنی میں

آیت الکرسی سورۃ بقرہ کا قلب ہے اور 'الحیی القیوم' بمنزلہ روح اور جان کے ہے اور باقی تمام آیات اعضا اور جوارح کی مانند ہیں۔سورۃ بقرہ دوسو چھیاسی آیات اور چالیس رکوع پر مشتمل ہے۔کوئی ایسا رکوع نہیں کہ جس میں حیات اور قیومیت اور ہمیشہ کی زندگانی کا مضمون مذکور نہ ہو۔گویا سورۃ بقرہ 'الحیی القیوم' ہی کی شرح اور حیات و قیومیت ہی کی وضاحت و توضیح ہے۔'ذَالک الکتاب لاریب فیہ' سے قرآن حکیم کا آبِ حیات ہونا بیان کیا گیا اور یہ حقیقت واضح کی گئی کہ ایمان اور تقویٰ ہی سے حیاتِ ابدی حاصل ہوتی ہے اور کفر و نفاق سے دائمی ہلاکت و بربادی۔جب بنی اسرائیل کا قصہ تمام ہوا تو ایک دوسرے خاندان کی حیات کا ذکر کیا گیا یعنی

حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہؑ اور ان کی اقامت اور بیت اللہ کی تعمیر کا ذکر ہوا۔ بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل کی حیات کے سربستہ رازوں کو منکشف کرنے کے بعد چند اقسامِ حیات کا ذکر کیا۔ شہادت فی سبیل اللہ، مصائب پر صبر کرنا، قصاص کو جاری کرنا، وصیت کو بغیر تغیر و تبدل کے جاری کرنا، روح کو زندہ رکھنے کے لیے روزہ رکھنا، دین کی بقا کے لیے جہاد کرنا، شعائرِ ملتِ ابراہیمی کو زندہ اور قائم رکھنے کے لیے حج و عمرہ کرنا، مال و آبرو کی حیاتِ حقیقی قائم رکھنے کے لیے شراب اور جوئے سے پرہیز کرنا، حقوق نکاح اور زوجیت کے زندہ اور قائم رکھنے کے لیے ایلا، خلع، طلاق، عدت، آدابِ مباشرت اور اجرت رضاعت وغیرہ کی حدود کی پوری رعایت رکھنا تاکہ خاندانی نظام اور معاشرتی حیات سلامت رہے اور اس کی وحدت منتشر نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے دو قصے اس کلمہ 'الحیی القیوم' سے پہلے ذکر کیے اور تین واقعات اس مدعا کے اثبات کے لیے آیت الکرسی کے بعد ذکر فرمائے۔

پہلا واقعہ حیاتِ بنی اسرائیل کے اس گروہ کا ذکر فرمایا جو وبا سے ڈر کر بھاگا اور پھر ایک اولوالعزم نبی کی دعا سے زندہ ہوا۔

دوسرا واقعہ طالوت اور جالوت اور تابوتِ سکینہ کا ذکر کیا۔

تیسرے واقعے میں آیت الکرسی کا ذکر کیا۔ اس سورۃ کو ایمانیات، اعتقادیات اور دعا و استغفار کے مضمون پر مکمل فرمایا۔ یہ حقیقت ہے کہ ایمان، توبہ اور استغفار ہی سے بنجر و ویران اور مردہ دلوں کو حیاتِ جاودانی نصیب ہوتی ہے۔ آیت الکرسی سورۃ بقرہ کے لیے دل کی مانند ہے اور یہ اسمِ 'الحیی القیوم' بمنزلہ جان ہے اور باقی تمام آیات اعضا و جوارح کی طرح ہیں۔

آیت الکرسی کے عارفانہ نکات

اسمِ جلالت 'اللہ' اسمِ اعظم ہے اور دلوں کا چین ہے۔ 'الحیی القیوم' کو بھی اسمِ اعظم کہا گیا ہے۔ تمام مخلوقات کا قیام ذاتی نہیں ہے۔ جملہ مخلوقات کا وجود وہمی اور اعتباری ہے۔ جب بندہ

صرف 'الحیی القیوم' کو ہی دیکھتا ہے تو پھر 'الحیی' کے جلوہ سے جمیع اسما کا حصول اور 'القیوم' سے تمام مخلوقات کی نفی نصیب ہوتی ہے تو دوئی اٹھ جاتی ہے اور کثرت اور دوئی کے اٹھنے سے وحدت نصیب ہوتی ہے۔ اس طرح 'یا حیی یا قیوم' کا ورد کرنے سے بندہ مستجاب الدعوات بن جاتا ہے۔ حالتِ حضوری میں ہر اسم جس کا بھی ورد کیا جائے گا وہی اس کے لیے اسمِ اعظم بن جائے گا۔

قلب پاک ہو تو ہر اسم، اسمِ اعظم ہے

دراصل حقیقتِ محمدیہ ہی اسمِ اعظم ہے، جسے حقیقتِ محمدیہ کی معرفت نصیب ہوگی اسے علمِ اسمِ اعظم حاصل ہو گیا اور یہی اسم جامع الٰہی کی صورت ہے۔ کیونکہ اسی سے ہی تمام مخلوق کو فیض نصیب ہوتا ہے۔ 'سنة ولا نوم' کا حاصل یہ ہے کہ سالک پر لازم ہے کہ وہ کثرتِ نیند کی عادت ترک کرے، اگرچہ اللہ رب العزت نے بندوں کو نیند کی اجازت بخشی ہے لیکن کثرت سے غفلت پیدا ہوتی ہے اور غافل کو اللہ تعالیٰ محبوب نہیں بناتا۔

اللہ رب العزت کا علم کلی ہے جس قدر وہ عطا کرنا چاہے اسی قدر ہی حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے جہاں بھی تکبر، غرور اور بڑائی کا دعویٰ ہوگا علم نافع نہیں ہوگا۔ علم نافع کی علامت یہ ہے کہ وہ علمِ الٰہی کے تابع ہو اور الٰہی نظام کے تابع علم وہی ہوتا ہے جو اپنی بھی حفاظت کرے اور دوسروں کی بھی حفاظت و نگرانی کرے، کیونکہ علم کی حقیقت حفاظت ہے، بندگی کے دائرے میں حفاظت کا حق ادا کرنے کی ایک صورت ہے کہ 'العلیی العظیم' کی معیت حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے عالمین میں جو کچھ پیدا فرمایا ہے اس کی مثال اور نمونہ انسان میں ضرور بنایا ہے، لہٰذا عرش کی مثال عالمِ انسان میں اس کا قلب ہے، کیونکہ یہ محلِ استوا الروح ہے اور کرسی کی مثال سر الانسان ہے، لہٰذا 'قلب المومن عرش اللہ' کہ مومن کا قلب عرشِ الٰہی ہے۔ ظاہر و باطن کی حفاظت کے لیے آیت الکرسی کی تلاوت اکسیر ہے، وساوس، اوہام اور دل سے کدورتوں، نفرتوں اور بغض و کینہ کو نکالنے کے لیے اور باطل افکار کے سدباب کے لیے آیت الکرسی کی تلاوت نسخہ شفاء ہے۔

لفظ اللہ کے تفسیری معارف

لفظ اللہ اسم ذات کے لیے بولا جاتا ہے۔اسمِ ذات ستائیس سوایک(2701) مرتبہ آیا ہے۔اگراس لفظ سے کوئی حرف حذف بھی کردیا جائے تب بھی بقیہ حروف ذاتِ باری تعالی کی نشاندہی کے لیے اپنا معنی برقرار رکھتے ہیں۔مثلا اللہ کا پہلا حرف الف حذف کرلیں تو للہ باقی رہ جائے گا جس کا معنی ہے'اللہ' کے لیے۔اگر دوسرا حرف'لام' حذف کرلیں اور پہلا'الف' بحال رکھیں تو'الہ' باقی رہ جائے گا جس کا معنی ہے معبود۔اگر پہلے دونوں حروف'الف'اور'لا' محذف کر لیں تو لہ باقی رہ جائے گا جس کا معنی ہے اس کے لیے اور اگر پہلے تینوں حروف حذف کر لیے جائیں تو'ہ' باقی رہ جائے گا جو پھراس کی ذات کی نشاندہی کرتا ہے۔'ہ' وہ کے معانی میں بطور ضمیر استعمال ہوتا ہے۔

نفی واثبات کی حکمت

اسلام صرف حق کے اثبات کا ہی نہیں بلکہ ہر باطل کی نفی کا بھی نام ہے اور یہی تصور دراصل اسلام کے انقلابی فلسفے کی بنیاد ہے۔امام راغب اصفہانی ؒ لکھتے ہیں: اس کی اصل الہ ہے۔جس کے ہمراہ'ء' کو حذف کر دیا گیا اوراس پر ال داخل کر کے اسے ذاتِ باری کے لیے خاص کردیا گیا ہے۔

اشتقاقی مادہ کے لحاظ سے لفظ اللہ کے معانی

لفظ اللہ کا مادہ الہ ہے یعنی الہ لہذا اس مادہ کے بنیادی معنی درج ذیل ہیں:

1- گھبرا کراور پریشان ہوکرکسی کی پناہ ڈھونڈنا یا پناہ دینا 2- متحیر ہونا اور ہر حوالے سے حیرت میں پڑجانا 3- بلند مرتبہ ہونا 4- نگاہوں سے پوشیدہ ہونا 5- کسی کی غلامی اور محکومیت اختیار کرنا۔ عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں اللہ کا اسم موجود نہیں ہے۔اللہ تعالی سے ہمارا تعلق اس کی کتاب

قرآن حکیم اور اس کے رسول ﷺ کے ذریعے سے ہے۔اس اللہ ہی کے حوالے سے الہ بھی ہے اور یہ لا الہ الا اللہ میں یہی معنی دیتا ہے کہ دنیا میں اس کے رسول کے بغیر کوئی ہستی ایسی نہیں جس کے احکام وقوانین کی اطاعت کی جائے، جس کی محکومیت اختیار کی جائے، یہ اختیار اور حق صرف اللہ تعالی کو حاصل ہے۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالی نے اپنی صفات بابرکات کو بڑی وضاحت کے ساتھ اور کئی حوالوں کے ساتھ بیان فرمایا ہے، اللہ تعالی کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ: 'لیس کَمِثْلِه شَیءٌ' اس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے۔

اَلحَیُّ کا معنی

آیت الکرسی میں اللہ تعالی کیلیے دوسری صفت 'حیات' بیان کی گئی ہے۔حیات سے 'حی' ہے۔اللہ تعالی کا نام 'الحی' اس لیے ہے کہ وہ لوازمِ حیات، علم، قدرت، سمع وبصر اور ارادہ وکلام والا ہے۔وہ حیاتِ ذاتیہ کا مالک ہے، اسی نے ان کمالات کا مظاہرہ عالمِ ظہور میں دکھلایا ہے۔اللہ تعالی وہ معبود حقیقی اور بندگی و پرستش کے لائق ہے جو زندہ اور حی ہے۔اس کا مطلب ہے زندہ، سدا رہنے والا، مدام زندگی والا، سب کو سنبھالنے والا، باعث حیات، موجب زیست۔اسی سے انسانی زندگی ہے۔قرآن حکیم کی رو سے انسان کی موجودہ زندگی سلسلہ ارتقا کی پہلی کڑی ہے۔اس سطح پر اگر اس نے اپنے اندر آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کرلی تو پھر یہ سلسلہ مرنے کے بعد بھی اگلی کڑی پر فائز ہونے کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

حیات کیا ہے؟

حقیقی حیات محض روح کے پائے جانے سے وجود میں نہیں آتی بلکہ ایسی صفت کے پائے جانے سے وجود میں آتی ہے جو احساس، علم، قدرت اور ارادہ کا باعث بنے۔

-1 علامہ سید محمود احمد آلوسیؒ فرماتے ہیں۔ جس صفت کے پائے جانے سے احساس کا وجود علم وقدرت کے وجود پر زائد ہو اور وہ اپنے موصوف کے لیے صحت علم وقدرت کے ایسے حال کو واجب کر دے جو اس سے پہلے نہ ہو۔

-2 قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں: وہ ایسی صفت ہے جس کے ساتھ علم، قدرت ارادہ وغیرہ تمام صفاتِ کمالیہ وابستہ ہیں۔

-3 علامہ نفسیؒ فرماتے ہیں: حیات وہ صفت ہے جس کے پائے جانے سے احساس کا وجود صحیح قرار پائے اور موت اس کی ضد ہے۔

-4 امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں: حیات کا استعمال کئی طرح سے ہے۔اول قوت نامیہ (بڑھنے کی قوت) کے لیے، دوم قوت حاسہ کے لیے ہے۔

-5 امام جلال الدین محلیؒ فرماتے ہیں: حیات صفت ہے جس کے ساتھ احساس ہو موت اس کی ضد ہے یا اس کا عدم۔

-6 علامہ خازنؒ فرماتے ہیں: حیات ایسی حاسہ کو کہتے ہیں جو بدن میں روح کے پائے جانے کے ساتھ پائی جائے۔اسی وجہ سے حیوان کو حیوان کہتے ہیں۔

-7 علامہ سید شریف جرجانیؒ فرماتے ہیں: حیات وہ صفت ہے جو موصوف کے لیے یہ لازم کرتی ہے کہ وہ علم اور قدرت رکھے۔

ان تمام تعریفات کو پیش نظر رکھتے ہوئے معلوم ہوا کہ حیات ایسی صفت کا نام ہے جو احساس، علم، قدرت، ارادہ وغیرہ کا سبب ہو اور موت وہ حالت ہے جس میں یہ چیزیں نہ پائی جائیں۔ ہر موجود کو وجود عطا کرنے والا خدا ہی ہے جو خود زندہ اور حی ہے اور ہر زندہ کو زندگی بخشنے

والا ہے۔

آیت الکرسی خوابیدہ عقول کو بیدار کرنے والی ہے۔

اولین کلمہ جو عقل کے لیے غور کرنے کی بنیاد ہے، انہیں تفکر و تعقل پر مجبور کر دیتا ہے اور انہیں بت پرستی کی ذلت آمیز بندگی سے نجات بخشتا ہے وہ کلمہ حی ہے۔آیت الکرسی اس کلمہ حی کے ذریعے لوگوں کو یہ بات سمجھاتی ہے کہ وہ معبود حقیقی جو عبادت و پرستش کے لائق ہے۔

عقلا کے لیے دعوتِ فکر

آیت الکرسی نے اپنے کلمہ (حی) کے ساتھ کہ جو معبود برحق کی ان صفات میں اولین صفت ہے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہیں۔

زندگی کی طرح موت بھی ایک حیرت انگیز حقیقت ہے

ارشادِ ربانی ہے:

يُخرِجُ الحَیُّ مِنَ المَیِتِ وَيُخرِ جُ المَیّتَ مِن الحَی و یحیِ الا رضَ بعد مَوتِهَا ؕ وَكَذٰ لِكَ تخرجُونَ ۔

وہی مردہ سے زندہ کو نکالتا ہیاور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے اور زمین کو اس کی مردنی کے بعد زندہ و شاداب فرماتا ہے اور تم (بھی) اسی طرح (قبروں سے) نکالے جاؤ گے۔

اَلَّذِی خَلَقَ المَوتَ وَالحَیٰوۃَ لِيَبلُوَ كُم اَیُّكُم اَحسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ العَزِيزُالغَفُور۔

جس نے موت اور زندگی کو (اس لئے) پیدا فرمایا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے اور وہ غالب ہے بڑا بخشنے والا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ حیات کی طرح موت بھی ایک مخلوق ہے اور اس نے بھی ایک دن مرنا ہے۔

عذابِ قبر

كَيفَ تَكفُرُونَ بِاللّٰهِ وَ كُنتُم اَموَاتاً فَاَحيَاكُم ثُم يُمِيتكُم ثُمَّ يُحيِيكُم ثُم اِلَيهِ تُرجَعُون۔

تم کس طرح اللہ کا انکار کرتے ہو حالاں کہ تم بے جان تھے اس نے تمہیں زندگی بخشی، پھر تمہیں موت سے ہمکنار کرے گا اور پھر تمہیں زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔
اس آیت میں دو موتوں اور زندگیوں کا اور پھر خدا کی بارگاہ میں پیش کیے جانے کا، یعنی کل پانچ مرحلوں کا ذکر ہے۔ جن سے انسان یکے بعد دیگرے گزرتا ہے۔ ایمان بالآخرت سے جس آخر کی زندگی پر ایمان مراد لیا جاتا ہے اس کی حقیقت سب سے آخر میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔
ثُم اِلَيهِ تُرجَعُون ۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

دو موتیں

قرآنِ کریم نے دو موتوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک تو انسان کے سفرِ زندگی شروع کرنے سے پہلے کی حالت، حالتِ عدم ہے جبکہ دوسری موت سے مراد وہ حقیقی موت ہے جس کا نظارہ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں کرتے ہیں۔ جس طرح یکے بعد دیگرے انسان پر دو موتیں وارد ہوتی ہیں۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے انسان کو دو زندگیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ان میں پہلی زندگی تو واضح ہے کہ اس سے مراد عالمِ شہادت میں رنگ و کیف کی موجودہ زندگی ہے یہ نور و ظلمت اور ہست و بود کی زندگی ہے۔ مگر دوسری زندگی سے مراد قیامت کی زندگی نہیں بلکہ عالم برزخ یعنی مرنے سے لے کر قیامت تک کی زندگی ہے۔
اس زندگی کا اصطلاحی نام حیاتِ برزخ ہے جبکہ اخروی زندگی (آخرت) کا آغاز اس وقت سے ہوگا اس زندگی اور اس مادی کائنات کو کلیتاً فنا کر دیا جائے گا۔ 'حی و قیوم' میں 'حی' کے معنی زندہ کے ہیں اور قیوم کے معنی ہیں وہ ذات جو خود اپنے بل پر قائم اور سب کو قائم رکھنے والی اور سب کو سنبھالنے

والی ہو۔

اللہ تعالیٰ ایک زندہ حقیقت ہے

اہلِ کتاب اللہ تعالیٰ کے زندہ خدا کی تعبیر سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَعَنتِ الوُجوهُ لِلحَيِّ القَيو مِ ۚ وَقَد خَابَ مَن حَمَلَ ظُلمًا۔

اور (سب) چہرے اس ہمیشہ زندہ (اور) قائم رہنے والے (رب) کے حضور جھک جائیں گے، اور بیشک وہ شخص نامراد ہوگا جس نے ظلم کا بوجھ اٹھالیا۔

وَتَوَكَّل عَلَى الحَيِ الَّذى لَا يَمُوتُ وَسبِح بِحمدِ ه ۚ وَكَفٰى بِه بِذُنُو بِ عِبَادِه خَبِيرًا۔

اور آپ اس (ہمیشہ) زندہ رہنے والے (رب) پر بھروسہ کیجئے جو کبھی نہیں مرے گا اور اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے رہئے اور اس کا اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر ہونا کافی ہے۔

حمد و تسبیح الٰہی حصولِ صبر و توکل کا وسیلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ 'الحی' ہے اور اس کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ صرف وہی زندہ ہے اسی حوالے سے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

هُوَ الحَىُّ لَآ اِله اِلَّا هُوَ فَادعُوهُ مُخلِصِينَ لَهُ الدِين ۚ اَلحَمدُ لِلّٰه ِ رَبِ العلمِين۔

وہی زندہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پس تم اس کی عبادت اس کے لیے طاعت و بندگی کو خالص رکھتے ہوئے کیا کرو، تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو سب جہانوں کا پروردگار ہے۔

حقیقی زندگی کا سرچشمہ ذاتِ واجب الوجود ہے

اللہ تعالیٰ ہی درحقیقت 'الحی القیوم' ہے۔ وہ زندہ ہے اور زندگی عطا کرنے والا ہے۔

اس کے سوا معبودانِ باطلہ کو ہرگز موت و حیات پر اختیار نہیں ہے۔

قُل یَآ یُّھَا النَّاسُ اِنِی رَسُو لُ اللّٰہِ اِلیکم جمِیعَا نِ الَّذِی لَہ‘ مُلکُ السَّمٰوٰتِ وَالاَ رضِ ° لَآ اِ لہ اِلَّا ھُوَ یُحی وَیُمِیتُ۔

آپ فرمادیں اے لوگو ! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول (بن کر آیا) ہوں جس کے لیے تمام آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی جلاتا اور مارتا ہے۔

رَبِ السَّمٰوٰتِ وَالا رضِ وَمَا بَینھُمَا اِن کُنتُم مُوقِنِین ° لَااِ لہ اِلَّا ھُوَ یُحی وَیُمِیتُ ° رَبُّکُم وَ رَبُّ ا' بَآ ئِکُم 'الا وَّ لِین۔

آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے (اس کا) پروردگار ہے، بشرطیکہ تم یقین رکھنے والے ہو اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی زندگی دیتا اور موت دیتا ہے (وہ) تمہارا (بھی) رب ہے اور تمہارے اگلے آباد واجداد کا (بھی) رب ہے۔ 'اللہ الحی' مردوں کو اپنے قانون کے مطابق زندگی عطا کرتا ہے انسان کہتا ہے کہ جب میں مرجاؤں گا تو زندہ کیسے قبر سے نکالا جاؤں گا۔ اس کے جواب میں ارشاد باری تعالی اس طرح سے ہوتا ہے:

اَوَلا یَذکُرَالاِنسَانُ اَنَّا خَلَقنٰہُ مِن قَبلُ وَلَم یَکُ شَیئًا ° ۔

کیا انسان یہ بات یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس سے پہلے (بھی) اسے پیدا کیا تھا جبکہ وہ کوئی چیز ہی نہ تھا۔ اس طرح سے بھی اس الحی القیوم کا ارشاد ہے:

ذٰلِکَ بِاَن اللّٰہَ ھُوَ الحَقُّ وَاَنَّہ‘ عَلٰی کُلِ شَی ءِ قَدِیرْ ۔

یہ (سب کچھ) اس لیے (ہوتا رہتا) ہے کہ اللہ ہی سچا (خالق اور رب) ہے اور بیشک وہی مردوں (بے جان) کو زندہ (جاندار) کرتا ہے اور یقیناً وہی ہر چیز پر بڑا قادر ہے۔ اس دنیا میں زندگی ملنے سے پہلے کا عرصہ پہلی موت، پھر زندگی پھر دنیا کی زندگی کا خاتمہ یعنی موت اور اس کے بعد دوسری زندگی، اسی حوالے سے ارشادِ الہی ہے کہ تم قانون خداوندی سے کیسے انکار کر سکتے ہو ! تم مردہ تھے اس نے زندگی عطا کی، پھر مرجا گے اور اس کے بعد پھر زندگی ملے

گی۔ارشادِ باری ہے:

قَالُوا رَبَّنَآ امتنَا اثنَتَينِ وَاَحيَيتَنا اثنَتَينِ فَاعتَرفنَابِذُنُوبِنَا فَهَل اِلٰی خُرُوجٍ مِن سَبِيلٍ

وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو بار موت دی اور تو نے ہمیں دو بار (ہی) زندگی بخشی، سو (اب) ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں، پس کیا (عذاب سے بچ) نکلنے کی طرف کوئی راستہ ہے؟ ہر طرح کی زندگی کا اظہار الحیی کی صفت کا مرہونِ منت ہے۔

طبیعی موت انسان کے محض جسم پر وارد ہوتی ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے طبیعی موت انسان کے جسم پر وارد ہوتی ہے لیکن انسانی ذات جو نہ قوانین طبیعی کی پیدا کردہ ہوتی ہے اور نہ ہی ان قوانین کے تابع ہوتی ہے۔اس پر موت وارد نہیں ہوسکتی۔لہذا انسان کی طبیعی موت کے بعد نفس انسانی آگے جاتا ہے۔جس طرح اللہ تعالی المحی اور الحیی ہے، اسی طرح وہ المميت بھی ہے۔قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لِنَفسٍ اَن تَمُوتَ اِلا بِاِذنِ اللّٰهِ كِتبًامؤ جلا وَمَن يُّرِدثَوَابَ الدُّنيا نُؤ تِه مِنحا وَمَن يُّرِدثَوَابَ الآخِرةِ تُؤ تِه مِنحا وَسَنَزِى الشّٰكِرِين

اور کوئی شخص اللہ کے حکم کے بغیر نہیں مر سکتا (اس کا) وقت لکھا ہوا ہے اور جو شخص دنیا کا انعام چاہتا ہے ہم اسے اس میں سے دے دیتے ہیں، اور جو آخرت کا انعام چاہتا ہے ہم اسے اس میں سے دے دیتے ہیں، اور ہم عنقریب شکر گزاروں کو (خوب) صلہ دیں گے۔ ہر طرح کی زندگی اور موت وہی اللہ تعالی دیتا ہے اس سلسلے میں یوں ارشاد ہے:

هُوَ يُحى وَ يُمِيتُ وَاِلَيهِ تُرجَعُون وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اور تم اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔

سورۃ الحجر میں یوں فرمایا گیا ہے:

وَاِنا لَنَحنُ نُحی وَیُمِتَا وَ نَحنُ الوارِ ثو ن اور بیشک ہم ہی جلاتے ہیں اور مارتے ہیں اور ہم ہی (سب کے) وارث (و مالک) ہیں۔

سلسلۂ کائنات ہمیشہ رہنے والا نہیں

اَلَم تَرَ اِن اللّٰہَ یُولِجُ الَّیلَ فِی النَّھَارِ وَ یُولِجُ النَّھَارَ فِی الَّیلِ وَ سَخَّرَ الشَّمسَ وَالقَمَرَ کُلٌّ یَجرِیۤ اِلَٰی اَجلٍ مُّسَمًّی وَّ اَنَّ اللّٰہَ بمَا تَعمَلُونَ خَبِیرٌ ؕ

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ رات کو دن میں داخل فرماتا ہے اور دن کو رات میں داخل فرماتا ہے اور (اسی نے) سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے، ہر کوئی ایک مقرر معیار تک چل رہا ہے اور یہ کہ اللہ ان (تمام) کاموں سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔

اور بڑے ہی واشگاف الفاظ میں فرمایا گیا ہے کہ ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔

اَینَ مَا تَکُو نُوا یُد رِککُّمُ المَوتَ وَلوَ کُنتُم فِی بُرُوجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ؕ۔

(اے موت کے ڈر سے جہاد سے گریز کرنے والو) تم جہاں کہیں (بھی) ہوگے موت تمہیں (وہیں) آ پکڑے گی خواہ تم مضبوط قلعوں میں (ہی) ہو۔ اور اس طرح سے بھی موجود ہے:

کُلُّ نَفسٍ ذَآئِقَۃُ المَو تِ ؕ۔ وَنَبلُوکُم بِالشَّرِ وَالخَیرِ فِتنۃً ؕ۔ وَاِلَینَا تُرجَعُونَ ؕ۔

ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے، اور ہم تمہیں برائی اور بھلائی میں آزمائش کے لیے مبتلا کرتے ہیں، اور تم ہماری ہی طرف پلٹائے جاؤ گے۔ اور پھر سورۃ العنکبوت میں اس طرح سے ارشادِ باری ہے:

کُلُّ نَفسٍ ذَآئِقَۃُ المَو تِ ؕ۔ ثُمَّ اِلَینَا تُر جَعُونَ ؕ۔ ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے، پھر تم ہماری ہی طرف کوٹائے جاؤ گے۔

اَلقَیُّومُ کے معانی و مطالب

قیوم کا اصل مادہ ق وم ہے۔ قیوم مبالغہ کا وزن ہے۔ اس کے معانی ہیں وہ ذات جو خود اپنے بل پر قائم ہو اور دوسروں کے قیام و بقا کا واسطہ اور ذریعہ ہو۔ اس کے معنی ہیں اعتدال اور توازن قائم ہونا۔ اسی نہج پر قام اور قیام کے معنی کھڑے ہونے کے ہیں۔ کھڑا وہی رہ سکتا ہے جس کا توازن قائم رہے۔

اَلـقَیُّـوم کا پہلا معنٰی القیوم کا پہلا معنی یہ ہوا کہ وہ خود قائم اور ہر چیز کا محافظ اور اس کو وہ اسباب عطا فرمانے والا جن کے ساتھ اس کا قیام ممکن ہے لہذا اس کے معنی میں دونوں باتیں شامل ہیں یعنی اپنی ذات میں قائم اور دوسروں کو قائم رکھنا۔ پھر قیوم کے دیگر معانی میں ہمیشہ قائم رہنے والا، ہر طرح کے حوادث اور خطرات سے محفوظ اور سدا قائم۔ قیوم کی صفت سابقہ انبیا کے صحیفوں میں بار بار پہلے بھی مذکور ہوئی ہے۔ اللہ تعالی کے قیوم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے دومیان ہے سب اللہ تعالی ہی کے حکم سے اور اس کی قدرت سے قائم ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالی کی یہ صفت تین بار استعمال ہوئی ہے اور الحی القیوم کی صورت میں آئی ہے۔

اَللّٰـهُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُـوَ الحَیُّ القَیُّوم ۔ اللہ، اس کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں (وہ) ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے (سارے عالم کو اپنی تدبیر سے) قائم رکھنے والا ہے۔ اللہ تعالی سب کچھ جاننے والا ہے اور پوری مخلوقات اور کائنات اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَعنتِ الوُجوهُ لِلحَیِّ القَیُّومِ ۚ وَقَد خَابَ مَن حَمَلَ ظُلمًا ۚ

اور (ب) چہرے اس ہمیشہ زندہ (اور) قائم رہنے والے (رب) کے حضور جھک جائیں گے، اور بیشک وہ شخص نامراد ہوگا جس نے ظلم کا بوجھ اٹھالیا۔

خدا خاموش علت العلل نہیں ہے

'قیوم' یعنی اس کائنات کے سارے نظم کو سنبھالے ہوئے ہے اور اس کو خود اپنی نگرانی اور اہتمام میں چلا رہا ہے۔ گویا اللہ تعالی کی زندگی ازلی وابدی ہے اس کی کوئی ابتدا اور انتہا نہیں ہے۔ اس کی زندگی میں زمانہ نہیں ہے۔ مخلوقات کی زندگی زمانے کی حدود میں محدود ہے اور اس کی زندگی حیات مطلقہ ہے۔

حضرت موسی کلیم اللہ اور ان کے بھائی حضرت ہارون فرعون کے پاس آئے اور اسے دعوتِ توحید دی تو فرعون نے حضرت موسی سے کہا: **قَالَ فَمَن رَّبُّكُمَا يٰمُوسٰى قَالَ رَبُّنَا الَّذِيٓ اَعۡطٰى كُلَّ شَيۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰى**۔

(فرعون نے) کہا تو اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟ (موسی نے) فرمایا: ہمارا رب وہی ہے جس نے ہر چیز کو (اس کے لائق) وجود بخشا پھر (اس کے حسبِ حال) اس کی رہنمائی کی۔

ہر شے لوازم حیات سے آراستہ ہے

پانی میں رہنے والا ایک معمولی سا کیڑا ہو یا خشکی پر زندگی بسر کرنے والا ایک ضعیف سا مچھر انسان یا حیوان کے خون سے غذا پاتا ہے وہ بھی اپنی زندگی گزارنے کے لیے تمام لوازِم حیات سے آراستہ دکھائی دیتا ہے۔ غرض اللہ قیوم نے تمام حشرات اور سارے حیوانات چرند، پرند کو کچھ اس طرح پیدا فرمایا اور ان کو ایسے اعضائے بدن اور ایسے قوی سے مسلح کر دیا ہے جو اس ماحول کے عین مطابق اور سازگار ہوتی ہے۔

امام راغب اصفہانیؒ نے لفظ قیوم کا یہ معنی کہ **المعطى له ما به قوله** یعنی وہ ہر شے کو وہ سب کچھ عطا کرنے والا ہے جس سے اس کا قوام اور اس کی بقا ہے۔

'اَلحَیُّ القیومُ' کے بلا عطف استعمال ہونے کی حکمت

''حی'' سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ یہ کائنات حی یعنی زندہ خدا کے حکم سے زندہ ہوئی ہے۔اللہ قیوم نے جہاں موجوداتِ کائنات کو نعمت زندگی سے مالا مال کیا، وہاں ان کی زندگی گزارنے اور باقی رہنے کے لیے بڑے حکیمانہ انداز میں ضروری منصوبہ بندی بھی فرمادی ہے۔ پس ان زندہ اشیائے کائنات کا ضروری اعضاو جوارح وقوی سے آراستہ و پیراستہ ہونا بیک وقت اللہ تعالی کی دوصفات حی اور قیوم سے متصف ہونے کا مظہر بن رہا ہے۔

اَلقَیُّوم کا دوسرا معنی

ازلی وجود کا مالک قیوم کا دوسرا معنی **' الذی لا بد ء له'** وہ کہ جس کا کوئی آغاز اور ابتدا نہ ہو۔اس معنی کے لحاظ سے قیوم اس ہستی کو کہیں گے کہ جو ازلی وجود کی مالک ہو۔یعنی اس کے وجود کے لیے نقط آغاز اور ابتدا کسی معین وقت یا زمانے کی ضرورت نہ ہو۔گویا وہ ہمیشہ سے ہو۔

وجودِ باری تعالی کے بارے میں جدید ذہنوں کے شکوک وشبہات کا ازالہ وجود بھی واجب الوجود کی ذات کا لازمہ ہے۔اس لیے نہ تو وجود ذات اللہ تعالی سے جدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی ذاتِ خدا وجود سے جدا ہو سکتی ہے۔اس کے برعکس وہ ممکن الوجود ہے کہ جو از خود نہیں رکھتا اور اس کے لیے ضروری ہے کہ خدا اس کو وجود بخشے تو وہ معرضِ وجود میں آئے لہذا ثابت ہوا کہ وجود تو پس ذاتِ واجب کا لازمہ ہے۔اس لیے یہ سوال کرنا ہی غلط ہے کہ وہ ہستی کہاں سے آئی؟ اس کا جواب یہ ہوگا کہ نور کسی دوسری چیز سے روشن نہیں ہوتا بلکہ نور کی روشنی نور کی ذاتی ہے اور یہ ذات نور کا لازمہ ہے۔ پس یہ جہان تو اللہ تعالی سے وجود میں آیا اور اس کے نور نے آسمان وزمین کو وجود بخشا ہے۔لیکن خود اللہ تعالی کا وجود کہیں اور سے نہیں آیا۔کیونکہ وجود تو اس ذاتِ واجب الوجود کا عین ذات ہے اور ذاتِ حق عین وجود ہے۔اگر کوئی بھی وجود ہوگا تو اس کی ایک حد ہوگی، اگر حد ہو گی تو ایک خاص حد کے بعد کمزور ہوگا اور وہ محدود ہوگا۔

اَلْقَیُّوْم کا تیسرا معنی

قیوم وہ ذات واجب الوجود ہے کہ اپنے تمام صفاتِ کمال کے ساتھ خود بخود قائم ہے، وہ کسی غیر کی طرف معمولی سا احتیاج بھی نہیں رکھتی اور تمام موجودت کائنات اور پورا جہانِ ہستی اس ذاتِ الٰہی کے سہارے قائم ہے۔ یہ جہانِ ہستی نہ صرف اپنے موجود ہونے میں اللہ قیوم کا محتاج تھا، بلکہ اس جہان کا قیام اور اس کائنات کا نظام بھی اس کی ذاتِ اقدس سے وابستہ ہے۔

حضرت سیدنا علی المرتضیٰؓ فرماتے ہیں: **کل شیءٍ خاضع له وکل شیءٍ قائم به**

تمام کائنات اپنے خدائے مالک کی بارگاہ میں سر تعظیم جھکائے ہوئے ہے اور اس جہان ہستی کی ہر چیز اس کے دائمی فیضان اور مسلسل نظر کرم کے صدقے قائم اور زندہ ہے۔

یا حی یا قیوم کا ورد ہر درد کی دوا ہے

حضرت سیدنا علی المرتضیٰؓ بیان فرماتے ہیں۔ غزوہ بدر کے دن میں یہ دیکھنے کے لیے آیا کہ حضور نبی اکرم ﷺ اس سنگین اور وحشت انگیز کیفیت اور طاقتور دشمنوں کے مقابلے میں کیا تدبیر کر رہے ہیں تب میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ نے سر سجدے میں رکھا ہوا ہے اور مسلسل ’یا حیی یا قیوم‘ پکار رہے ہیں۔ میں کئی بار گیا اور واپس آیا لیکن آپ ﷺ نے اسی طرح سر سجدے میں رکھا ہوا تھا اور یا حیی یا قیوم کے علاوہ اور کچھ نہ کہتے تھے۔ آپ ﷺ اس ذکر مبارک کو بار بار دہراتے رہے اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو غزوہ بدر میں فتح و نصرت عطا فرمادی۔

اہلِ اللہ کا کہنا ہے کہ جو شخص کثرت سے الحی القیوم کا ورد رکھے گا وہ انشااللہ کبھی بیمار نہ ہوگا نیز جو آدمی اس اسم الحی القیوم کو چینی کے برتن پر کستوری اور گلاب سے لکھ کر شیریں پانی سے دھو کر پیے گا یا کسی دوسرے بیمار کو پلائے گا اسے شفائے کاملہ نصیب ہوگی۔ اس کا کثرت سے ورد رکھنے والا لوگوں میں عزت و نیک نام پائے گا اور جو آدمی صبح کی نماز کے بعد سورج نکلنے تک یا حی یا قیوم کا ورد

پکا کرے گا اس کی سستی و کاہلی اور غفلت و لاپرواہی دور ہو جائے گی۔

صفتِ قیوم اور مسئلہ جبر و قدر

انسان نہ تو اپنے اعمال وافعال میں مجبور و بے اختیار ہے اور نہ ہی مکمل طور پر مختار ہے، بلکہ اپنے تمام امور میں وہ بین بین یعنی بعض میں مجبور اور بعض میں مختار ہے۔ وہ اللہ ہی ایسی ذات ہے کہ جو کچھ چاہے اُسے پوری آزادی اور اختیار کے ساتھ عمل میں لاسکتا ہے اور جس شے کے بارے میں جو ارادہ کرے عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔ اس جہانِ ہستی میں کوئی بھی اس طرح کی آزادی اور اختیار کا مالک نہیں ہے اور قیوم کہتے ہی اسے ہیں جو اپنے تمام صفاتِ کمال میں بذاتِ خود قائم ہو اور کسی غیر کی طرف معمولی سی احتیاج بھی نہ رکھے۔ اس جہانِ ہستی میں بیشتر موجودات ایسی ہیں جو اپنے سپرد کیئے گئے کاموں میں مجبور ہیں اور از خود معمولی سا ارادہ و اختیار بھی نہیں رکھتیں۔ تمام تکوینی قوانین وضوابط بالجبری جاری ہورہے ہیں اور کوئی موجودان تکوینی فرائض کی بجا آوری سے انحراف اور سرکشی کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ کی صفت قیوم کے پیشِ نظر یہ سارا جہانِ ہستی اللہ تعالیٰ سے موجود اور قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان آزاد پیدا فرمایا اور وہ اپنے اچھے یا برے افعال واعمال میں مجبور نہیں ہے بلکہ اپنے ارادہ واختیار سے انجام دیتا ہے لیکن انسان اپنے اصل وجود اور اس کی ساری طاقتیں اس ذات قیوم کے ساتھ قائم ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انسان اپنے عمل میں آزادی مطلق کا مالک نہیں۔ ایک ایسی آزادی رکھتا ہے جو جبر مطلق کے بین بین ہے۔

قرآنِ کریم یہ واضح کرتا ہے کہ انسان اپنے افعال کا خالق نہیں، بلکہ کاسب، مکتسب اور مرتکب ہے۔ ارشاد فرمایا گیا:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ اگر اس نے نیک کام کیئے تو اسی کو فائدہ پہنچے گا اور اگر برے کام کیئے تو اسی کو اس کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ انسان جو بھی عمل کرتا ہے مثلاً اس کا

گفتگو کرنا، اس کا آرام کرنا، اس کا کھیلنا کودنا، اس کا اٹھنا بیٹھنا، اس کا چلنا پھرنا، اس کا ہر کام اپنے وجود میں ایک فعل اور عمل ہے اور ہر فعل ایک وجود ہونے کے اعتبار سے خدائی مخلوق ہے۔ کیونکہ فعل بھی انسان ہی کی طرح نفس و آفاق پر مشتمل اسی کائنات کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ لیکن اکتساب کی ذمہ داری کے اعتبار سے اس فعل کو انسان کا فعل کہیں گے خدا کا نہیں۔ چنانچہ اس کی نسبت بہر حال انسان کی طرف ہی ہوگی، فعل کے انجام دینے کی ذمہ داری انسان پر عائد کی گئی ہے۔ گویا عمل ایک ہے، مگر اس کے پہلو دو ہیں۔ ایک پہلو کے اعتبار سے وہ خدا تعالی کی مخلوق ہے اور دوسرے کے اعتبار سے انسان کا مکسوب۔ گویا کسبا تو بچے کو وجود والدین کے دم قدم سے ملا لیکن خلقا یہ خدا تعالی کی عطا کا مرہونِ منت ہے۔

ہر انسانی عمل اپنے کسب میں انسانی ہاتھوں کا محتاج ہے۔ مگر اپنے وجود اور اپنی ہستی میں خدا تعالی کے حکم کن کا دستِ نگر ہے۔

کیا مخلوق ہونے کے لیے دیکھا جانا ضروری ہے؟ خود انسان حسی اور کثیف وجود رکھتا ہے اس لیے اس کا موجود ہونا آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے، مگر اس کا عمل بذاتِ خود ایک لطیف وجود ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہے کہ رحم اور محبت حقیقت میں اپنا اپنا وجود تو رکھتے ہیں، لیکن جب تک انہیں آپ ماں کی مامتا، باپ کی شفقت اور دوست کے اخلاص کے روپ میں نہ دیکھیں، ان کا وجود از خود دکھائی نہیں دے سکتا، یعنی انہیں دیکھنے کے لیے کسی رحم دل شخص کے عمل اور کسی محبت کرنے والے کے التفات کا سامنے ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ انسانی یا حیوانی ظرف نہ ہوں تو رحم، غصہ، محبت، نفرت، بخل، حرص اور تکبر وغیرہ جیسے اوصاف دکھائی نہیں دے سکتے۔ لہذا عامل کو، عمل کا خالق نہیں بلکہ اس کا کاسب تصور کیا جائے گا۔ کیونکہ اس نے عمل کو فی نفسہ پیدا نہیں کیا بلکہ اسے کر کے دکھایا ہے۔

موت و حیات بھی اپنی تخلیق کے اعتبار سے، خدا تعالی کی مخلوق ہیں مگر اپنے واقع ہونے کی

مناسبت سے ان کا وجود کسی نہ کسی سبب کا رہینِ منت ہے۔ زندگی، اعمال کے ارتکاب کا سبب بنتی ہے اور موت عالمِ آخرت میں ان کے نتائج کے مشاہدے کا۔

اس دنیا میں نیکی یا بدی کا خلقی وجود گو من جانب اللہ ہے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ان کے کسب کی ذمہ داری ان کے خالق پر عائد نہیں ہوتی اس لیے کہ اللہ کا فعل مطلقاً خلق ہے نہ کہ کسب وارتکاب۔ خلق کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو اچھائی اور برائی میں تمیز کا شعور اور اختیار بخشا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ انسان عمل کے کس پہلو کو اختیار کرتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ اس پوری کائنات میں ذمہ داریوں کا نظام بھی کسب پر ہی چل رہا ہے نہ کہ خلق پر۔ اللہ تعالی نے ہر چیز کی ضد پیدا کی ہے، دن کے ساتھ رات، آرام کے ساتھ بے آرامی، راحت کے ساتھ تکلیف، نیکی کے ساتھ بدی اور جنت کے ساتھ دوزخ وغیرہ۔

قرآن وسنت کی روشنی میں جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ بین القدر والجبر ہے۔ انسان کی حقیقی حیثیت بین القدر والجبر ہے جو ایک معتدل کیفیت سے عبارت ہے۔ فی الواقع اسے اختیار و ارادے کی مکمل آزادی ہے لیکن اس کی آزادی میں نہ افراط ہے نہ تفریط۔

فرض اور خواہش میں کش مکش کا مرحلہ

انسان کے دل میں کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے سے متعلق ایک کش مکش پیدا ہوتی ہے پھر وہ اس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ یہ کام کرے یا نہ کرے۔ حرکت ایک ہی ہے مگر ارادے اور نیت نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا۔ مثلاً کسی کا مال دیکھ کر اسے ناجائز طور پر ہتھیانے کی خواہش پیدا ہوئی اور دوسری طرف خدا کے حکم نہی کا بھی خیال آ گیا۔ نتیجتاً دونوں خیالات ابھرے اور ذہن میں ایک کشمکش سی شروع ہو گئی۔ اسی لیے اس ابتدائی سوچ کے مرحلے کو کشمکش کا مرحلہ کہا گیا ہے۔ تعمیل ہمیشہ ارادے کے تابع ہوتی ہے۔ عمل کے چھ مرحلے دو حصوں میں منقسم ہیں۔ پہلا حصہ ذہنی کشمکش سے شروع ہو کر انتخابِ نیت کا تھا، جبکہ دوسرا ارادے سے شروع ہو کر نتیجہ عمل تک محیط

تھا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا الأعمَالُ بِالنِّیات۔ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

خدا کی ذات یہ نہیں دیکھتی کہ اس کا یہ عمل اپنے انجام تک پہنچا یا نہیں؟ بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ اکتساب عمل میں اس کی نیت کیا تھی۔ نیت سے ہی ایک شخص مخلص مسلمان اور نیت سے ہی ایک شخص منافق سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ زبان اور ظاہر کی حد تک قول دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔ رہا خارجی مجبوریوں اور حالات کی پریشانیوں کا دباتو اس کا اثر نیت کے مرحلے پر نہیں بلکہ عزم وارادے کے مرحلے) چوتھے مرحلے (پر ہوتا ہے۔ کیونکہ عزم وارادہ اصولی طور پر تو انتخابِ نیت کے تابع ہوتا ہے۔ یعنی دل تو کچھ اور چاہتا ہو لیکن کسی مجبوری کے تحت ارادہ کسی اور کام کا کرنا پڑے۔ گویا ذہن کسی کام کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ارادہ کرنے پر مجبور ہو۔ اگر ایسی صورت حال ہو تو یہ فعل جبرواکراہ کہلاتا ہے اور جبرواکراہ حالت اضطرار تک پہنچ جائے تو انسان سے اخلاقی وقانونی ذمہ داری اور جوابدہی مرتفع ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالی کی ذات صحیح معنوں میں مجبور شخص کو سزا نہیں دیتی۔ بلاشبہ اللہ تعالی خالق ہیں اور بندہ اعمال کا کاسب ہے اور تحقیق اس کی اس طرح ہے کہ بندہ اس کام میں اپنی قدرت اور صلاحیت صرف کرتا ہے، لہذا یہ کسب ہے اور اللہ تعالی اس کی کوشش کے بعد اس فعل کو موجود کر دیتا ہے یہ خلق ہے۔ جس طرح زمین تخلیق کے اعتبار سے اللہ تعالی کی ملکیت ہے اور ثبوتِ تصرف کے اعتبار سے بندے اس کے مالک ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان اپنے افعال کا کاسب ہے۔

اللہ تعالی کا تصورِ عدل

اللہ تعالی کسی معاملے میں بھی اپنی کسی مخلوق پر ظلم نہیں کرتا اس کا ہر فعل عدل وانصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ عدل کی تعریف علماء لغت نے ان الفاظ میں کی ہے: **وضع الشیی ء علی محله** ۔کسی چیز کو اس کے صحیح ٹھکانے پر رکھنا۔ دوسرے لفظوں میں حقدار کو حق دینا، مستحق کو اس کا

جائز مقام دینا، عدل ہے۔ عدل کے ساتھ ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ احسان کا مقام عدل کے مقام سے بھی بلند ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان خدا تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے۔ یہ مقامِ احسان ہے اس لیے فرمایا اگر ہو سکے تو عدل کے اونچے درجے پر جائز رہو۔ حق دار کو اس کے حق سے بھی زیادہ دو اور دوسروں کی خاطر اپنا حق لینا چھوڑ دو تا کہ اگر کبھی مقامِ احسان سے اترنا بھی چاہو تو مقامِ عدل پر تو فائز رہ سکو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

مَن جآ بِالحَسَنۃِ فلہ عَشرُ اَمثا لِھَا وَمَن جآ ء بِالسیئۃِ فلا یجزٰ ی اِلَّا مِثلَھَا وَھُم لَا یُظلَمُونْ ۔

جو کوئی ایک نیکی لائے گا تو اس کے لیے (بطورِ اجر) اس جیسی دس نیکیاں ہیں اور جو کوئی ایک گناہ لائے گا تو اس کو اس جیسے ایک (گناہ) کے سوا سزا نہیں دی جائے گی اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

مَن جآ ءَ بِالحَسنۃ فلہ خَیرٌ مِنھَا وَمَن جآ ء بِالسیئۃِ فَلا یَجزی الَّذِینَ عمِلُو االسَّیاٰتِ اِلا مَا کَانُوا یَعمَلُونْ۔

جو شخص نیکی لے کر آئے گا اس کے لیے اس سے بہتر (صلہ) ہے اور جو شخص برائی لے کر آئیگا تو برے کام کرنے والوں کو کوئی بدلہ نہیں دیا جائے گا مگر اسی قدر جو وہ کرتے رہے تھے۔

قرآن کریم اس حقیقت کو خوب اچھی طرح واضح کرتا ہے کہ اگر خداوند تعالیٰ انسان کو مجبور کرنا چاہے تو کوئی اس کو روک نہیں سکتا اور اگر ایسا کیا جاتا تو اس مجبور دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

ارشاد فرمایا:

وَلَوشَآ ءَ اللّٰہُ لجعلکُم اُمَّۃً وَّاحِدۃً ۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم (سب) کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ نیز فرمایا:

فَلَو شَآ ءَ لَھَدٰ کُم اَجمَعِین پس اگر وہ (تمہیں مجبور کرنا) چاہتا تو یقیناً تم سب کو

(پابندِ) ہدایت فرما دیتا۔ خداوند تعالی نے انسان کو عملی آزادی مرحمت فرمائی اور فرمایا:

اِعمَلوُا مَا شِئتُم ۔ جو چاہو، عمل کرو۔

جزا و سزا اور تمام حجت

جزا و سزا کے لیے اللہ رب العزت کا ایک اٹل اصول ہے کہ وہ اس وقت تک کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کرتا جب تک اتمام حجت نہ کر لے۔ چنانچہ سورۃ عبس میں ارشاد فرمایا:

یَومَ یَفِرُّ المَرءُ مِن اَخِیهِ وَاُمِه وَاَبِیهِ وَصَاحِبتِه وَبَنِیهِ لِکُلِ امّرِیءٍ مّنهُم یَومَئِذٍ شَانٌ یُغنِیهِ۔

اس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے (بھی) اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے (بھی) اس دن ہر شخص کو ایسی (پریشان کن) حالت لاحق ہوگی جو اسے (ہر دوسرے سے) بے پروا کر دے گی۔ سورۃ المعارج میں ارشاد ہے: یَوَدُّ المُجرِمُ لَو یَفتَدِی مِن عَذَابِ یَومِئِذٍ بِبَنِیهِ۔ وَصَاحِبَتِهِ وَاَخِیهِ۔ وَفَصِیلَتِهِ الَّتِی تُؤیِهِ۔ وَمَن فِی الاَرضِ جَمِیعًا ثُمَّ یُنجِیهِ ۔ مجرم آرزو کرے گا کہ کاش! اس دن کے عذاب (سے رہائی) کے بدلے میں اپنے بیٹے دے دیا اور اپنی بیوی اور اپنا بھائی (دے ڈالے) اور اپنا (تمام) خاندان جو اسے پناہ دیتا تھا اور جتنے لوگ بھی زمین میں ہیں، سب کے سب (اپنی ذات کے لیے بدلہ کر دے)، پھر یہ (فدیہ) اسے (اللہ کے عذاب سے) بچا لے۔ البتہ نیکوکار اور پرہیزگار لوگ اس کلیے سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اسی لئے فرمایا:

اَلا خِلاَّءُ یَومئِذٍ بَعضُهُم لِبَعضٍ عَدُوٌّاِلّا المُتَّقِین سارے دوست واحباب اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے پرہیزگاروں کے (انہی کی دوستی اور ولایت کام آئیگی)۔

وَلَنُذِیقنهُم مِنَ العَذَابِ الاَدنیٰ دُونَ الاَکبَرِ لَعَلَّهُم یَرجِعُون اور ہم

ان کو یقیناً (آخرت کے) بڑے عذاب سے پہلے قریب تر (دنیوی) عذاب (کا مزہ) چکھائیں گے تاکہ وہ (کفر سے) باز آجائیں۔

اس ذات کے متعلق بھلا یہ کیسے باور کرلیا جائے کہ اس نے انسان کو پیدا ہوتے ہی اپنی ازلی تقدیر کے شکنجے میں جکڑ کر مجبور اور بے بس بنا دیا ہے۔

ان رحمتیی سبقت غضبیی۔ میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفسًا اِلَّا وُسعَھَا۔ اللہ کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔ اور حضور سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا

بعثت بالحنیفیۃ السمحۃ۔ مجھے آسان دین دے کر بھیجا گیا ہے۔

یہ 'اغلال' اور 'اصر' کیا ہے؟ یہ غلط عقائد اور تصورات کی زنجیریں اور توہمات کی بیڑیاں تھیں۔

لَا تَاخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوم کا معنی

اللہ تعالیٰ کی ذات پر تھکن، اونگھ یا گہری نیند کا غلبہ نہیں ہوسکتا، نیند کی ابتدائی حالت یا انتہائی گہری حالت اِس کی مقدس ذات پر غالب نہیں آسکتی۔ قیوم خالق کائنات کی صفتِ دائمی وابدی ہے اس کا معنی ہے دوسروں کی حفاظت کرنا یعنی قیوم وہ ہوتا ہے جو ایک طرف سے بذاتِ خود قائم ہوتا ہے اور دوسری طرف سے تمام موجوداتِ عالم اس کی ذات سے قائم ہوتے ہیں۔ اونگھنا اور سونا یہ سب کچھ اس عالم طبیعت کے زندہ موجودات کے لیے لازمی ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ نے فرمایا: چار چیزیں ایسی ہیں کہ ان کی معمولی مقدار بھی کثیر ہوتی ہے۔ آگ، نیند، بیماری اور دشمنی ان چاروں میں سے ہر ایک کی تھوڑی مقدار کو بھی کم نہ سمجھو، (بلکہ ان کی تھوڑی سی مقدار بھی زیادہ ہے اور اس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ بہت زیادہ اثرات کی بنیاد بن جائے)۔

اونگھ اور نیند ہر دو عادی عوارض میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ ایسی دو حالتیں ہیں جو بالجبر حیوان اور انسان

پر مسلط ہو جاتی ہیں۔ غرض آیت الکرسی انسانوں کو یہ سمجھا رہی ہے کہ اللہ تعالی کی حیات و قیومیت، رفعت و کمال کے اعلی ترین درجہ پر جائز ہے کہ نہ تو اس پر اونگھ غلبہ کرسکتی ہے اور نہ اسے قیومیت باز رکھ سکتی ہے۔

لَه، مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الاَ رضِ کا معنی

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین ہے سب اسی کا ہے۔

قرآن حکیم میں دو قسم کی آیات ہیں: ایک قسم کی آیات میں آسمان وزمین میں جو کچھ موجود ہے اس کا مالک اللہ تعالی کو بتایا گیا ہے اور آہت الکرسی میں اللہ تعالی کی حاکمیت اور اس کی حکیمانہ تدبیر کا بیان صفت قیوم کے ذریعے کیا گیا ہے، جبکہ دیگر آیات میں اللہ تعالی کی حکومت و قیومیت کو کلمہُ ملک، کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَلِلّٰهِ مُلكُ السَّمٰوٰتِ وَالاَ رضِط وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِ شَی ءٍقَدِیرٌ۔ اور سب آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے (سوتم اپنا دھیان اور توکل اسی پر رکھو)۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

وَلِلّٰهِ مُلكُ السَّمٰوٰتِ وَالاَ رضِ وَمَا بَینَهُمَا۔ یَخلُقُ مَا یَشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِ شَی ءٍقَدِیرٌ۔ اور آسمانوں اور زمین اور جو (کائنات) ان دونوں کے درمیان ہے (سب) کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے اور اللہ ہر چیز پر بڑا قادر ہے۔ پھر ارشاد فرمایا:

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمَاوَاتِ وَمَا فِی الاَ رضِ لِیَجزِی الَّذِینَ اَسَآءُ وا بِمَا عَمِلُوا وَیَجزِیَ الَّذِینَ اَحسَنُوا بِالحُسنٰی۔ اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے تاکہ جن لوگوں نے برائیاں کیں انہیں ان کے اعمال کا بدلہ دے اور جن لوگوں نے نیکیاں کیں انہیں اچھا اجر عطا فرمائے۔

انسان اشیاء کا حقیقی مالک نہیں اور اس کی ملکیت ایک اعتباری امر ہے، پرانے زمانے میں انسان کی اجتماعی اور اقتصادی ضروریات کے پیش نظر اس جہان میں انسان کی مالکیت کی بنیاد قائم ہوئی اور انبیاء کرام نے بھی اس مالکیت کی تصدیق فرمائی۔ تمام ذراتِ عالم اللہ تعالی کے پیدا کردہ اور اس کے فیضانِ کرم کے طفیل موجود ہوئے ہیں۔ انسان زمین میں گندم کا بیج ڈالتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد اس کی پیداوار سے اپنا سالانہ خرچہ اٹھا لیتا ہے۔ یاد رہے کہ انسان اپنے اس کام میں بھی ملک خدا اور ملک الٰہی ہر دو سے استفادہ کرتا ہے۔

قرآن حکیم کی جس قدر آیات میں ملک خدا اور حکومت الٰہی کو بیان کیا گیا ہے ان سب کے آخر میں اللہ تعالی کی لامحدود قدرت، مخلوقات کی آفرینش، زندگی بخشنا یا موت دینا، بیٹیاں عطا کرنا یا بیٹے دینا اور ایسے امور کو لایا گیا ہے جن کا تعلق محض رب العزت سے ہے اور اس میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ انسان حامل امانت الٰہی، صاحب عقل و ہوش اور ایک معتدل اور متوازن بدن کا مالک ہے۔ یہ اللہ کی اس قدر اہم مخلوق ہے کہ اس کو پیدا کرنے والے خالق نے اس کی تخلیق پر خود اپنی تعریف کی اور اپنے بارے میں یوں ارشاد فرمایا:

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحسَنُ الخٰلِقِين ۔ پھر ہم نے اسے بڑھا (کر محکم وجود بنا) دیا جو سب بہتر پیدا فرمانے والا ہے۔ مختصر یہ کہ اللہ تعالی نے تمام اجرام فلکی اور آسمانی وسعتوں میں پائی جانے والی اشیا کو نوع انسانی کے فائدے کے لیے کچھ اس طرح مسخر کر دیا ہے کہ انسان جانے انجانے میں ان کے منافع سے مستفید ہو رہا ہے۔

تصورِ ملکیت

آپ ﷺ کی ذات ستودہ صفات حتمی ع ختمی مرتبت ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کے عطا کردہ نظامِ فکر و عمل کا ہر پہلو بھی نقطہ تمامیت اور رتبہ خاتمیت کا حامل ہے۔ ان اعلی تصورات میں سے ایک بنیادی تصور، تصورِ ملکیت ہے۔ اس تصورِ ملکیت نے اسلام کے نظام معیشت کو ان

تمام خود غرضیانہ اور مفاد پرستانہ رجحانات سے پاک کر دیا، جو اقتصادی اور معاشرتی زندگی کو تباہ کن نتائج سے دوچار کر رہے تھے۔

1- مالکیت کی لغوی تحقیق: 'مالکیت' عربی اور اردو زبان میں عام مستعمل ہے اس کا مادہ (ملک) ہے۔ جس کے معانی یوں بیان کیے گئے ہیں: ایسی حالت جو کسی چیز کو ایسے سبب کے ذریعے پیش آئے جو اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ الملک ایک شرعی اتصال ہے جو کسی انسان اور ایسی چیز کے درمیان ہو جس میں وہ (انسان) تو تصرف کر سکے لیکن کوئی اور دوسرا اس میں تصرف نہ کر سکے۔

2- مفہومِ ملکیت: تمام حقوق کے ساتھ ساتھ اپنی ملک اشیا کے استعمال، تحفظ، مزید نفع کمانے کے لیے کاروبار میں لگانے اور انتقالِ ملکیت کے حقوق بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔

3- ملکیت کی تعریف: جب کسی شخص کو کسی مال / شے پر اپنا قبضہ قائم رکھنے اور حسبِ منشا تصرف کرنے کا حق حاصل ہو جائے تو اس حق کو ملکیت کہتے ہیں۔

4- مالک اور ملکیت: میں افادیت کا پہلو اللہ تعالی نے زمین میں جس چیز کو بھی بقا عطا کی ہے اور اسے محل ملکیت (یعنی ملکیت میں آنے کے قابل) بنایا ہے اس کے اندر بنی نوع انسان کیلیے یقیناً کوئی نہ کوئی نفع بخشی، سود مندی اور افادیت مضمر ہوئی ہے۔ سورۃ النسا میں ارشاد ہے:

بَعضُکُم لِبَعضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَکُم فِی الاَ رضِ مُستَقَرٌّ وَ مَتَاعٌ اِلٰی حِین۔

تم نیچے اتر جا، تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ اب تمہارے لیے زمین میں ہی معینہ مدت تک جائے قرار ہے اور نفع اٹھانا مقدر کر دیا گیا ہے۔ کائناتِ انسانی کے اموال میں مضمر عمومی نفع بخشی اور فیض رسانی کی وہ خوبی جس کی بنا پر اسے متاع قرار دیا گیا ہے۔ لفظ متاع کا معنی نفع اور فائدہ ہے۔

5-علتِ ملکیت : (ملکیت کی وجہ) مختلف ذرائع سے کسی شے پر کسی شخص کا حقِ ملکیت اس لئے متحقق ہوتا ہے کہ اس طرح اس شے میں اس کی دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور اس دلچسپی کی بنا پر وہ اسے واقعتاً خلقِ خدا کیلیے نفع بخش اور سود مند بنانے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ گویا ملکیت کسی شے کو انتفاع (فائدہ اٹھانے) کے قابل بنانے کا ذریعہ ہے، اصل مقصود ہرگز نہیں ہے۔ اس لیے شریعت نے مردہ اور غیر آباد زمینوں کو آباد کرنے والے کا حق ملکیت تسلیم کیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اسی کی ملکیت ہوگی۔ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: جس نے کسی زمین کو آباد کیا اور کسی کی نہ تھی تو آباد کرنے والا اس زمین کا مستحق ہوگا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَموَالَكُمُ الَّتِی جَعَلَ اللّٰهُ لَكُم قِيٰمًا وَّارزُقُوهُم فِيهَا وَاكسُوهُم وَقُولُوا لَهُم قَولًا مَّعرُوفًا۔

اور تم بے سمجھوں کو اپنے (یا ان کے) مال سپرد نہ کرو جنہیں اللہ نے تمہاری معیشت کی استواری کا سبب بنایا ہے۔ ہاں انہیں اس میں سے کھلاتے رہو اور پہناتے رہو اور ان سے بھلائی کی بات کیا کرو۔

حقِ انتفاع کی حقیقت

ارشادِ ربانی ہے: **وَفِیٓ اَموَالِهِم حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ المَحرُومِ** اور ان کے اموال میں سائل اور محروم (سب حاجتمندوں) کا حق مقرر تھا۔

وَالَّذِينَ فِیٓ اَموَالِهِم حَقٌّ مَّعلُومٌ۔ لِلسَّآئِلِ وَالمَحرُومِ۔ اور وہ (ایثار کیش) لوگ جن کے اموال میں حصہ مقرر ہے۔ مانگنے والے اور نہ مانگنے والے محتاج کا۔

فَاٰتِ ذَاالقُربٰى حَقَّهٗ وَالمِسكِينَ وَابنَ السَّبِيلِ۔ ذٰلِكَ خَيرٌ لِّلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجهَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ المُفلِحُونَ۔ پس آپ قرابت دار کو اس کا حق

ادا کرتے رہیں اور محتاج اور مسافر کو (ان کا حق)، یہ ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللہ کی رضا مندی کے طالب ہیں، اور وہی لوگ مراد پانے والے ہیں۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّه‘ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ۔

اور قرابتداروں کو ان کا حق ادا کرو اور محتاجوں اور مسافروں کو بھی (دو) اور (اپنا مال) فضول خرچی سے مت اڑا۔

یہاں دیگر مستحقین کا حقِ انتفاع اصلاً مالک کے حقِ انتفاع کے برابر قرار دیا گیا ہے اور کسی کے حق کو دوسرے کے حق پر بھی ترجیح نہیں دی گئی۔

کُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّکُمْ وَاشْکُرُوْا لَه‘ ۔ تم اپنے رب کے رزق سے کھایا کرو اور اس کا شکر بجالایا کرو۔

وَاٰتُوْھُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اٰتٰکُمْ ۔ اور تم (خود بھی) انہیں اللہ کے مال میں سے (آزاد ہونے کے لیے) دے دو جو اس نے تمہیں عطا فرمایا ہے۔

ارشادِ نبوی ﷺ ہے: **من أحيا أرضاً ميتةً فهي له** ۔ جو شخص کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اسی کی ملکیت ہوگی۔

وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۔ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۔ اور وہ (ایثار کیش) لوگ جن کے اموال میں حصہ مقرر ہے مانگنے والے اور نہ مانگنے والے محتاج کا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **ان في المال حقاً سوى الزكاة** ۔ بیشک مال میں زکوۃ کے علاوہ بھی حقوق ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: ہم عہدِ رسالت مآب ﷺ میں ڈول اور ہنڈیا تک کا عاریتاً ضرورت مندوں کو دینا ماعون تصور کرتے تھے۔ یعنی ایسی اشیائے استعمال سے بھی دوسروں کو فائدہ اٹھانے دینا شرعاً لازمی تصور کرتے تھے اور ان کا منع کرنا اس قرآنی حکم

'وَيَمنَعُونَ المَاعُون' کے تحت ناجائز اور دین کی تکذیب تصور کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں: زمین پر آدمی کے حقِ ملکیت کا مطلب صرف یہ ہے کہ انتفاع کا حق، قابض کو دوسرے کی نسبت زیادہ ہے۔

مَن ذَا الَّذِی یَشفَعُ عِندَہ' اِلَّا بِاِذنِہ کا معنی

کون ایسا شخص ہے جو اس کے حضور اس کے اذن کے بغیر سفارش کر سکے۔

مشرکین بت پرستی کے لئے قابل قبول منطقی توجیہہ کرنے کی کوشش کیا کرتے اور اس سلسلے میں وہ موہوم شفاعت کا سہارا لیا کرتے اور کہتے کہ ہم ان بتوں کو بارگاہِ الٰہی میں اپنا شفیع بناتے ہیں۔ اسے یوں سمجھا جائے کہ مشرکین کا غیر خدا کی عبادت کرنا ایک نکتہ ہے اور غیر خدا کی عبادت کا محرک ایک دوسرا نکتہ ہے۔ کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی مخلوق کو کسی دوسری مخلوق کے لئے بارگاہِ الٰہی میں شفیع قرار دے اور کوئی بھی اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کا حق نہیں رکھتا۔ حضرت سیدنا علی المرتضیٰ سے روایت ہے: **مَن کذ بَ بَالشَّفَاعَۃِ لَم یَنلھَا یَومَ القِیامَۃِ ۔**

جس نے شفاعت کو جھٹلایا قیامت کے دن وہ اسے حاصل نہیں ہو گی۔

دعا اور استغفار سے مراد بارگاہِ الٰہی میں بندے کا اقرارِ ذلت و نکبت اور اللہ تعالیٰ سے عفو و درگزر کی درخواست کرنا ہے۔ بلکہ گنہگار کی حالت و کیفیت میں انقلاب پیدا کرتا ہے اور اسے رحمتِ خداوندی کے لائق بنا دیتا ہے۔ ایک گنہگار شخص دعا و استغفار کے بغیر اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت و کرم کا مورد اور سزاوار نہیں ہوتا، لیکن جب دعا و استغفار اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں تو علمِ الٰہی کا متعلق بدل جاتا ہے۔ اس کے بدلے میں اب وہ شخص سزاوارِ عنایتِ ربانی ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور جود و عطا اس کے شاملِ حال ہو جاتا ہے۔ کسی بھی انسان کو کسی ارضی یا سماوی شے کی عبادت کی طرف مائل اور تحریک کرنے والے عوامل متعدد ہو سکتے ہیں مثلاً تعصب، قومیت، خوف، طمع، شفاعت، تقرب اور اس کی مثل دیگر کئی امور ہیں۔

قرآنِ حکیم میں مشرکین کے عمل اور ان کی بے راہ روی اور کج روی کو دو مادوں اور دو کلمات یعنی عبادت اور دعوت سے تعبیر کیا ہے۔ وہی مومن مسلمان موحدِ حقیقی ہے جو کبھی بھی غیر خدا کی عبادت نہ کرے اور عبادت میں کسی شخص یا کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہ بنائے۔ قرآنِ حکیم میں متعدد مقامات پر دعوت یعنی پکار کے مادے کو مختلف صورتوں اور شکلوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض دعوتیں یعنی پکاریں مشرکانہ ہیں اور دعا مانگنے والے کے شرک کا پتہ دیتی ہیں۔ اگر کوئی شخص غیر خدا کو الٰہ مانے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی الوہیت میں شریک اور معبود تسلیم کرتے ہوئے پکارے تو یہ ندا و دعا مشرکانہ ہے اور دعا کرنے والا شرک در عبادت کے حکم میں آ جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں لفظ دعا تین مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔

1- دعا بمعنی دعوت　　2- دعا بمعنی التجا　　3- دعا بمعنی عبادت

آپ ﷺ کی شانِ رحمت کی عظمت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی گنہگار امتی بخشش کا پروانہ حاصل کرنا چاہے تو قرآن کریم کے مطابق اسے درِ مصطفیٰ ﷺ پر آ کر اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگنی ہوگی۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا۔ اور اے حبیب اگر وہ لوگ جنہوں نے خود اپنے آپ پر آپ ﷺ کی نافرمانی کر کے ظلم کیا تھا آپ کے پاس نادم ہو کر آتے پھر اللہ سے معافی مانگتے اور رسول یعنی آپ بھی ان کے لئے معافی طلب فرماتے تو یہ لوگ اللہ کو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان پاتے۔

شفاعت دراصل دعا ہی کا دوسرا نام ہے ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ اللہ کی بارگاہ سے اپنی ذات کے لئے اور اپنے اعزا و اقارب اور عام الناس کے لئے دعا کرے۔ اللہ رب العزت کی بارگاہ عالیہ میں دعا قبول ہوتی ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

لا یرد القضاء الا الدعاء ۔ قضا کو صرف دعا ٹال سکتی ہے۔اللہ تعالی خود کسی کی شفاعت فرمانے والا نہیں بلکہ وہ مغفرت فرمانے والا اور مالک شفاعت ہے۔شفیع کی شفاعت کے قبول اور رد کا اختیار صرف اسے حاصل ہے۔قرآن وحدیث میں کوئی نص ایسی وارد نہیں ہے جو حضور نبی اکرم ﷺ سے دنیا میں طلب شفاعت پر ممانعت کرتی ہو۔لفظ شفاعت شفع سے مشتق ہے۔کسی ایک چیز کو اس جیسی دوسری چیز کے ساتھ ملانے کو شفع کہتے ہیں۔کسی ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ اس طرح ملا لینا کہ دوسری چیز اس کی مدد کرے اور پہلی اس سے سوال کرے یہی شفاعت ہے۔ان کو آپس میں اس طرح ملا دینا کہ کم حیثیت والا زیادہ حیثیت والے سے التجا وسوال کرنے والا بن جائے اور زیادہ حیثیت والا کم کی مدد کرنے والا ہو جائے۔حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں: آپ ﷺ کے رب کا آپ کو مقامِ محمود پر کھڑا کرنا مقامِ شفاعت ہے جس جگہ اولین وآخرین آپ کے لئے محوِ ثنا ہوں گے۔

امام خازن فرماتے ہیں: اور مقام محمود ہی مقامِ شفاعت ہے کیونکہ اس مقام پر اولین وآخرین آپ ﷺ کی تعریف کریں گے۔اللہ تعالی نے فرمایا: **یَومٌ لَا بَیعٌ فِیهِ** اس دن کوئی خرید وفروخت نہ ہوگی۔کوئی شخص بھی روز قیامت بیع (خرید وفروخت) نہیں کر سکے گا۔

ارشادِ ربانی ہے: **اَلَا خِلَّآءُ یومئذٍ بَعضُهم لِبعضٍ عَدوٌّ اِلَّا المُتَّقِین ۔**

قیامت کے روز گہرے دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے متقین کے (کہ وہ ایک دوسرے کی دوستی کا پاس رکھیں گے)۔قیامت کے روز کوئی دوستی کام نہ آئے گی۔کفار ومشرکین اپنے کفر کی وجہ سے شفاعت سے محرومی کا اعتراف کر رہے ہوں گیکہ آج ہمارا کوئی سفارشی نہیں جس طرح مومنین کے لئے ملائکہ،انبیا اور مومنین) سفارشی (ہیں۔حضرت جابر سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میری شفاعت میری امت کے کبیر گناہ کرنے والوں کے لئے ہے۔

یَعلَمُ مَا بَینَ اَیدِیھِم وَمَا خلفھُم کا معنی

”جو کچھ مخلوقات کے سامنے (ہو رہا ہے یا ہو چکا) ہے اور جو کچھ ان کے بعد (ہونے والا) ہے (وہ) سب جانتا ہے“۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تمام صفاتِ کمال کی جامع ہے۔ ان صفات میں سے ایک صفت علم ہے۔ قرآن حکیم میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے۔ علم خداوندی کی بنیاد اس کے معلوم کا وجود میں آنا نہیں، بلکہ علم تو اس کی عین ذات ہے اور پہلے اس کے کہ اس جہان کو خلق فرمائے، وہ ہر اس چیز سے عالم اور آگاہ تھا جو علم سے تعلق پذیر ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمیشہ سے ہے اور اس کا علم اس کے لئے لازم ذات ہے۔ اس کا علم تھا جب کہ ابھی معلوم خلق نہ ہوا تھا۔ سماعت بھی اس کی عین ذات تھی جب کہ مسموع موجود نہ ہوا تھا۔ بصارت بھی اس کی لازم ذات تھی جب کہ کوئی قابل ریت شیء پیدا نہ ہوئی تھی۔ قدرت بھی اس کی عین ذات تھی جب کہ اس کی قدرت کا متعلق و موضوع نہیں بنا تھا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو خلق فرمایا تو معلوم تحقق پذیر ہوا اور اللہ تعالیٰ کا علم ازلی اس معلوم نو موجود پر منطبق ہوا۔ اس طرح سماعت مسموع پر، بصارت مبصور پر اور قدرت مقدور پر منطبق ہوئی۔ اللہ تعالیٰ تمام نیک و بد اعمال اور جائز و ناجائز حرکات سے مکمل طور پر آگاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں کے بھیدوں کو جانتا ہے اور ان کی نیتوں، ارادوں اور افکار کو بھی جانتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

یَعلَمُ خَآءِ نَۃَالاَ عینِ وَمِا تَخفِی الصُّدُورْ ۔ وہ خیانت کرنے والی نگاہوں کو جانتا ہے اور (ان باتوں کو بھی) جو سینے (اپنے اندر) چھپائے رکھتے ہیں۔

وَلاَ یُحِیطُونَ بِشَیءٍ مِّن عِلمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ کا معنی

اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جس قدر وہ چاہے۔

عقیدِ توحید میں کسی مقام پر التباس اور خلط ملط نہیں ہے۔ مقام الوہیت بالکل الگ ہے اور مقامِ

عبدیت جدا ہے۔ان دونوں مقامات میں التباس و اشتباہ کا کوئی امکان نہیں ہے۔اللہ تعالی کا صفاتی نام العلیم ہے اس کا مادہ ع ل م ہے بنیادی طور پر علم کا مطلب ہوتا ہے جاننا، واقف کونا، آ گاہ ہونا وغیرہ۔علم بطور اسم مذکر دانائی، ہنر، جوہر، آ گاہی، واقفیت، ادراک، خبر، معرفت ہوتا ہے۔اللہ العلیم کا علم اس قدر زیادہ اور بے پایاں ہے کہ کوئی چیز، کوئی شے، کہیں بھی ہے وہ العلیم کے علم سے باہر نہیں ہے۔اللہ العلیم کے سوا کوئی اور علم کا منبع نہیں ہے۔اس کے سوا کسی اور سے کوئی روشنی میسر نہیں آ سکتی۔ ہر ایک کو صرف اور صرف اللہ تعالی ہی علم دیتا ہے۔اللہ العلیم کو تمام انسانی اعمال کا علم ہوتا ہے اور وہ تو نگاہوں کی خیانت اور دل کے ارادوں تک کا علم رکھتا ہے۔علیم حکیم صفت کو متعدد مقامات پر اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ انسان اپنی ناقص انسانی عقل کے حوالے سے خدائی قوانین کو اس معیار اور سطح پر سمجھنے سے قاصر ہے۔اللہ تعالی اشیا کو خلق کرنے سے پہلے ازل سے ان کا اس طرح علم تھا جس طرح ان کو خلق کرنے کے بعد ان کا علم ہے۔

علمی ترقی اور علم الہی: اس کرہ زمین کو جس ہوا نے گھیر رکھا ہے، اس کا قطر ۸۰۰ کلومیٹر ہے اور وہ زمین کی حرکت کے ساتھ ایک لاکھ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کر رہی ہے۔یہ ہوا ان اسباب میں سے ایک بہت بڑا سبب ہے جو کئی ایک جہات سے اس کرز مین کے زندہ موجودات کی زندگی کی حفاظت کی ضامن ہے۔ان میں سے حفاظت کی ایک جہت یہ ہے کہ یہ ہوا ان پتھروں کو جلا دیتی ہے اور ذرہ ذرہ کر دیتی ہے جو دور دور سے ٹوٹ کر مسلسل زمین کے اس ماحول میں وارد ہوتے رہتے ہیں۔اس کرارض کے اردگرد زندگی کی محافظت کے لئے گیسوں سے بھری ہوئی جو فضا موجود ہے۔وہ 800 کلومیٹر کی حدود میں پھیلی ہوئی ہے اور اتنی موٹی سخت ہے کہ اس کو زمین کے ذرہ سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے۔وہ اس کو آسمان سے ہر روز برسنے والے ان دو کروڑ بھاری پتھروں کی مار سے بچاتی ہے جو تقریباً 50 کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین کی اس قریبی ہوا میں داخل ہوتے ہیں۔

علم الہی اور انسانی ساخت: اللہ تعالی انسانوں کے ابدان کی طبیعی ساخت اور ان کے درمیان پائے

جانے والے گوناگوں اختلافات سے مکمل طور پر آ گاہ ہے۔ مثلاً انسان، عقل، ہوش، حفظہ، جسمانیت، سرشت اور روش وغیرہ میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں اور ان اختلافات کی بنیاد رحم مادر ہی میں پڑ جاتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: **وَاِن تَجهَر بِالقَولِ فَاِنَّه' يَعلَمُ السِّرَّ وَاخفَى** ۔ اور اگر آپ ذکر و دعا میں جہر (یعنی آواز بلند) کریں (تو بھی کوئی حرج نہیں) وہ تو سِر (یعنی دلوں کے رازوں) اور اخفی (یعنی سب سے زیادہ مخفی بھیدوں) کو بھی جانتا ہے (تو بلند التجاؤں کو کیوں نہیں سنے گا)۔

علمِ الٰہی اور جدید علم نفسیات: ایک انسان کے ضمیر سے مراد اس کے ذہنی خیالات اور نفسیاتی صورتوں وہ مجموعہ ہے جو انسان کے باطن میں موروثی طور پر پوری زندگی کے اکتساب کے باعث مجتمع اور مرتکز ہو جاتا ہے۔ انسان کے ذہن کے خزانے میں ذخیرہ شدہ یہی خیالات اور تصورات وغیرہ ہی اس امر کا باعث بنتے ہیں کہ وہ ارادہ کرتا ہے۔ پھر یہی ارادہ انسان کے کسی صحیح یا غلط، مطلوب یا نا مطلوب عمل کے انجام دینے کا سبب قرار پاتا ہے۔ ہر انسان جو اپنی ماں کے بطن سے پیدا ہوتا ہے، وہ اپنے خلق و روش کے لحاظ سے بالفعل حیوان اور بالقوہ انسان ہوتا ہے۔ آج سے چودہ صدیاں قبل جب قرآن حکیم علمی دائرے کی وضاحت کے درپے ہوا تو اس نے سر اور اخفی کے دو کلمات استعمال کیے اور ان سے اس دقیق فرق کی طرف اشارہ فرمایا۔ مختصر یہ کہ اس عالم ہستی کے سارے کلیات و جزئیات علم الٰہی کے دائرے میں موجود ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے مکمل طور پر آگاہ اور ان کا عالم ہے۔

اسلام اور قرآن اپنے ماننے والوں سے یہی خواہش کرتا ہے کہ وہ سب پورے خلوص کے ساتھ اپنے پروردگار کی عبادت کریں۔ وہ اپنے خالق و مالک کی عبادت اسے معبودِ حقیقی سمجھ کر کریں اور اس مولیٰ کی درگاہ میں وہی عبادت قابل قبول قرار پاتی ہے جو پر خلوص عبادت ہوتی ہے۔ عبادت کا دارومدار خلوص نیت پر ہے۔ تیرا کوئی بھی عمل بارگاہ الٰہی میں قابل قبول نہیں مگر یہ کہ تو نے اسے

خلوص کے ساتھ انجام دیا ہو۔ اللہ تعالی اپنے بندوں پر انتہائی مہربان ہے۔ اس کی رحمت و رافت اور مغفرت و بخشش کی چادر گنہگاروں پر سایہ فگن ہے۔ اس کی عطا اور بخشش کے دروازے ہر ایک کے لئے ہر وقت کھلے ہیں لیکن سب کچھ محبوبِ خدا ﷺ کے واسطے، وسیلے اور صدقے سے ملتا ہے۔

اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: **كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝** ۔ ہم ہر ایک کی مدد کرتے ہیں، ان (طالبانِ دنیا) کی بھی اور ان (طالبانِ آخرت) کی بھی (اے حبیب مکرم! یہ سب کچھ) آپ کے رب کی عطا سے ہے اور آپ کے رب کی عطا (کسی کے لئے) ممنوع اور بند نہیں۔

کارساز ذات کی بندہ نوازیاں

اللہ تعالی اپنے برگزیدہ اور مقرب بندوں کو مقام موذونیت پر سرفراز فرماتا ہے۔ اس مقام پر جو کچھ بندے سے صادر ہوتا ہے اس میں اذنِ الٰہی اور عطائے الٰہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

مقامِ موذونیت کی تائید صحیح بخاری میں موجود ایک حدیث قدسی سے ہوتی ہے جس میں حضور نبی اکرم ﷺ نے اس ارشاد کو اللہ تبارک وتعالی سے منسوب فرمایا ہے: میرا بندہ مسلسل نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، پھر اس کے کان بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ پکڑتا ہے، اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں ضرور اسے عطا فرماتا ہوں۔ اللہ تعالی اپنے محبوب اور مقرب بندوں کو ان کے حسبِ حال خارق العادت صفات اور کمالات سے نوازتا ہے۔ حتی کہ اس کے بعض برگزیدہ بندے قدرت و تصرف کی محیّر العقول صفات سے بھی بہرہ مند کر دیئے

جاتے ہیں۔ اگر ان صفات وکمالات کے بارے میں یہ عقیدہ رکھا جائے کہ یہ ان کی ذاتی نہیں بلکہ عطائی ہیں تو یہ شرک نہیں اور عقیدہ توحید کو اس سے کوئی ضعف نہیں پہنچتا کیونکہ نکتہ توحید کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالی وحدہ لاشریک کی تمام صفات ذاتی ہیں اور بندے کی تمام صفات عطائی ہیں۔

اس سے مطلقاً علم مخلوق کی نفی نہیں بلکہ احاطہ علم کی نفی ہے۔ من علمہ میں 'ہ' ضمیر کا مرجع 'اللہ' ہے اور من تبعیض کے لئے ہے اور 'شیءٍ' پر 'ب' تبعیض ہے جبکہ شے کے آخر میں آنے والی تنوین تنکیر کا فائدہ دے رہی ہے۔ اب معنی یہ ہوگا کہ وہ اللہ کے علم میں سے کسی معمولی شئے کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالی اپنی مخلوق میں سے جسے چاہے شانِ علم سے تو نوازتا ہے مگر احاطہ علم فقط اس کی اپنی شان ہے جس میں کوئی اس کا شریک وسہیم نہیں اور یہ شان مخلوق میں سے کسی فرد کو بھی حاصل نہیں۔

علمِ محیط خالق کی اور علمِ محاط بندے کی صفت ہے

جس علم میں احاطہ علم کی صفت موجود ہو اسے علم محیط کہتے ہیں۔ یہ اللہ تعالی کے ساتھ خاص ہے مگر جو علم کل نہ تھا آج آ گیا یا آج نہیں کل آ جائیگا یعنی اس کی حدود وقت کے ساتھ پھیلتی جاتی ہوں وہ علم محاط ہے، یہ مخلوق کی شان ہے۔ اس کی مثال دائرہ سے دی جا سکتی ہے۔ دائرے کے اندر کا کل رقبہ اور چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی محاط ہے جبکہ دائرہ تشکیل دینے والی پرکار سے کھینچی ہوئی لکیر اس کا محیط ہے۔ محاط نسبت کے اعتبار سے کل تو ہو سکتا ہے محیط نہیں ہو سکتا۔ محیط وہ ہے جو محاط کے اوپر ہے اس لئے کل اور جز دونوں محاط کے اندر آ سکتے ہیں۔ علم محیط اور علم محاط میں یہ فرق ہے کہ علم محیط اللہ کی شان اور صفت ہے جبکہ علم محاط بندے کی صفت ہے۔ اب علم محاط خواہ پوری ارضی مخلوق کے علم پر حاوی ہو وہ مخلوق کے لئے جائز ہوگا کیونکہ اس کا دائرہ محیط جو کہ علم الٰہی ہے سے متجاوز نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالی کے علم محیط کو یوں بیان فرمایا گیا: **اِنَّ اللّٰہَ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ مُحِیۡطٌ۠**۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں بیشک اللہ اس پر احاطہ فرمائے ہوئے ہے۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا: **وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ۝** اور اللہ جو کچھ وہ کرتے ہیں اسے احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اللہ تعالی کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔ چونکہ مخلوق کا علم اللہ تعالی کے علم محیط کے دائرے میں شامل ہے اس لئے مخلوق کا علم علم محاطہ ہوگا۔ مخلوق کے علم کے بارے میں قرآن فرماتا ہے: **وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيلًا ۝** اور تمہیں بہت ہی تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَفَوْقَ كُلِّ ذِى عِلْمٍ عَلِيمٌ ۝ اور ہر صاحب علم سے اوپر بھی ایک علم والا ہوتا ہے۔ اس آیہ کریمہ میں علم کا مطلب ہے کہ جو اشیاء امتحان کے لئے پیش کی جارہی ہیں ان کے بارے میں جتنا علم تو نے ہمیں دیا ہے، ہم وہی جانتے ہیں اور جو نہیں دیا وہ نہیں جانتے یہ جزئی علم محاط کی صفت مخلوق کو ارزانی کی گئی۔ 'الا بما شاء' میں کلمہ 'ما عام' ہے اللہ ایک دانے سے لے کر کروڑوں، عربوں، کھربوں دانوں پر بھی ما کا اطلاق ہوتا ہے۔ علم محیط کسی کو عطا نہیں کیا جاتا جبکہ علم محاط عطا تو ہوتا ہے مگر اللہ تعالی بے نیاز ہے وہ اپنی معلومات کے سمندر میں سے جتنا چاہے عطا کر دے، دست قدرت سے کسی کو چلو بھر عطا کر دے کسی کو چاہے تو سمندر عطا کر دے یہ اس کی شانِ کریمی ہے۔

علمه کا مفہوم

وَلَا يُحِيطُونَ بِشَىْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ ۔

وہ اللہ کے علم میں سے کسی شئے کا احاطہ نہیں کرتے۔

ولا يحيطون بشىءٍ مِّن عِلمِه ۝ میں **علمه** سے وہ معلومات الٰہیہ مراد ہیں جن کی نوعیت اور جامعیت کا کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔ علم اللہ تعالی کی صفت قائمہ ہے اور اسے صرف اللہ رب العزت کے ساتھ ہی خاص کیا گیا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اللہ تعالی کی صفت کی تبعیض ممکن نہیں یعنی اس کے علم کا کوئی جز نہیں ہو سکتا اس لئے کہ جز صرف معلومات کا ہوتا ہے اور آگے **الا بماشاء** مگر جس قدر اللہ چاہے کی صورت میں جو حرفِ استثنا آیا ہے وہ اس بات پر دلالت

کرتا ہے کہ علم اللہ تعالیٰ کی صفت قائمہ ہے، اس میں مخلوق میں سے کسی کے لئے استثنا نہیں ہوسکتا۔

ذاتِ الٰہی معلوم نہیں علیم ہے

معلوم وہ ہوسکتا ہے جو علم کے احاطہ میں ہو۔ پوری کائنات اللہ تعالیٰ کے علم کے احاطہ میں ہے اس لئے وہ معلوم کا درجہ رکھتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کسی کے علم کے احاطہ میں نہیں لہٰذا اس کے لئے معلوم نہیں کہا جائے گا۔ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَلَا يُحِيطُونَ بِهٖ عِلْمًا ۔ اور وہ (اپنے) علم سے اس (کے علم) کا احاطہ نہیں کرسکتے۔

یہاں ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات معلوم نہیں تو پھر وہ کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے اور یہی عقیدہ رکھنا چاہیے کہ وہ ذات علیم ہے۔

قرآن حکیم فرماتا ہے:

وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيمٌ ۔ اور اللہ ہر چیز سے بہت واقف ہے۔ دوسری جگہ پر فرمایا:

اِن ربک ھو الخلق العلیم بیشک آپ کا رب ہی سب کو پیدا فرمانے والا، خوب جاننے والا ہے۔

جب بھی ذاتِ باری تعالیٰ کی بات ہوگی اس کے لیے لفظ معرفت بولا جائے گا کیونکہ مخلوق کو ذاتِ خدا کا علم نہیں بلکہ معرفت نصیب ہوتی ہے۔

علم اور معرفت میں فرق

علم جاننا اور معرفت پہچاننا ہے۔ معرفت اور عرفان کے معنی ہیں کسی چیز کی علامات و آثار پر غور وفکر کر کے اس کا ادراک کر لینا۔ یہ علم سے اخص ہے یعنی کم درجہ رکھتا ہے اور یہ الانکار کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ چونکہ ذاتِ باری تعالیٰ وہ ہستی ہے جس کا علم نہیں بلکہ معرفت حاصل ہوتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کا بن دیکھے مان لیا جانا ہی عقیدہ توحید کی اساس ہے اور یہی ایمان بالغیب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کی نسبت سوچنے اور غور وفکر کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے اس لئے

یہ تلقین کی گئی ہے۔ **تفکر وافی آلا اللّٰہ ولاتفکروافیی ذات اللّٰہ**۔ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور وفکر کیا کرو اور اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور وفکر نہ کیا کرو۔ اللہ کا علم نہیں بلکہ معرفت حاصل ہوتی ہے اور معرفت کا حصول علامتوں اور نشانیوں سے ممکن ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

سَنُرِیھِم اٰیٰتِنَافِیۤ اَنفُسِھِم حَتّٰۤی یَتَبَیَّنَ لَھُم اَنَّہُ الحَقُّ۔ ہم عنقریب انہیں اپنی نشانیاں اطرافِ عالم میں اور خود ان کی ذاتوں میں دکھا دیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہی حق ہے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَفِیۤ اَنفُسِکُم اَفَلَا تُبصِرُون۔ اور خود تمہارے نفوس میں (بھی ہیں)، سو کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔ اس سے معلوم کہ حق تعالیٰ کی معرفت کسی کو براہِ راست نہیں ہو سکتی بلکہ وہ اسے اس کے اندر سے ملے گی یا خارج سے ملے گی۔ اب جو شخص درمیانی واسطے اور ذریعے کا انکار کر کے خدا کی معرفت حاصل کرنا چاہے تو اس کا حال یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کا علم تو اس کے لئے پہلے ہی ناممکن تھا۔ اب معرفت کے دروازے بھی اس پر بند ہو گئے۔ معرفت کے لئے واسطہ شرط ہے اور یہ بات ذہن میں رہے کہ واسطہ مخلوق کا ہوتا ہے خالق کا نہیں کیونکہ خالق تو مقصود ہے۔ یاد رہے کہ واسطہ ہمیشہ درمیان میں ہوتا ہے اور مقصود تک پہنچنے کے لئے واسطے سے کما حقہ آگاہی حاصل کرنا لازمی ولابدی امر ہے۔ جو کوئی اللہ کی معرفت حاصل کرنا چاہے اسے چاہیے کہ وہ اللہ کے بتلائے واسطوں میں سے کوئی واسطہ اپنائے اور سب سے بہتر واسطہ وہ ہوتا ہے جو اللہ سے زیادہ قریب ہو۔ ان سے بھی بہتر واسطے اولیا واصفیا ہیں اور ان سے بھی زیادہ بہتر واسطے خالق تک رسائی کے لئے انبیا کرام ہیں اور حضرات انبیا کرام میں حضور ﷺ کی ذات ستودہ صفات بہترین واسطہ ہیں کہ جہاں جا کر سارے واسطے ختم ہو جاتے ہیں۔ کسی اور واسطے کی ضرورت نہیں رہتی۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے جتنا زیادہ گہرا اور دائمی تعلق استوار ہوگا اتنی زیادہ اللہ کی معرفت نصیب ہوگی۔

مظہرِ عزت: عزت صرف اللہ کے لئے ہے، قرآن حکیم فرماتا ہے: **اَیَبتَغُونَ عِندَھُمُ العِزَّۃَ فَاِنَ العِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیعًا۔** کیا یہ ان کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں؟ پس عزت تو ساری اللہ تعالی کے لئے ہے۔

مظہرِ قوت: **اَنَّ القُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیعًا** ۔ساری قوتوں کا مالک اللہ ہے۔

مظہرِ خیر: **بِیَدِكَ الخَیر** ۔ساری بھلائی تیرے ہی دستِ قدرت میں ہے۔دوسرے مقام پر فرمایا:

وَمَن یُّؤتَ الحِکمَۃَ فَقَد اُوتِیَ خَیرًا کَثِیرًا۔ اور جسے (حکمت و) دانائی عطا کی گئی اسے بہت بڑی بھلائی نصیب ہوگئی۔

مظہرِ سمع و بصارت: **اِنَّہ' ھُوَ السَّمِیعُ البَصِیر۔** بیشک وہی خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: **فَجَعَلنٰہ' سَمِیعًا بَصِیرًا۔** پس ہم نے اسے (ترتیب سے) سننے والا (پھر) دیکھنے والا بنایا ہے۔

مظہرِ شہادت: **اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیءٍ شَھِیدًا۔** بیشک اللہ ہر چیز کا مشاہدہ فرمانے والا ہے۔قرآن حکیم میں حضور نبی اکرم ﷺ کے لئے بھی شہید کا لقب وارد ہوا۔ ارشادِ ربانی ہے:

ھُوَ سَمّٰکُمُ المُسلِمِینَ مِن قَبلُ وَفِی ھٰذَا لِیَکُونَ الرَّسُولُ شَھِیدًا عَلَیکُم وَ تَکُونُوا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ۔

اس (اللہ) نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے، اس سے پہلے (کی کتابوں میں) بھی اور اس (قرآن) میں بھی تاکہ یہ رسول (آخر الزماں ﷺ) تم پر گواہ ہو جائیں اور تم بنی نوع انسان پر گواہ ہو جا۔حضور نبی اکرم ﷺ کا شہید ہونا بھی اللہ تعالی کی شانِ شہادت کا مظہر ہے۔

مظہرِ رافت ورحمت

اللہ تعالی کی ایک صفت روف ورحیم بھی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا: **اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَحِیم۔** بیشک اللہ تمام انسانوں کے ساتھ نہایت شفقت فرمانے والا بڑا مہربان ہے۔اور حضور نبی اکرم ﷺ کیلیئے بھی قرآن مجید میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: **لَقَد جَآءَکُم رَسُولٌ مِّن اَنفُسِکُم عَزِیزٌ عَلَیہِ مَا عَنِتُّم حَرِیصٌ عَلَیکُم بِالمُؤمِنِینَ رَءُوفٌ رَحِیم۔** بیشک تمہارے پاس تم میں سے (ایک عظمت (رسول ﷺ) تشریف لائے۔تمہارا تکلیف ومشقت میں پڑنا ان پر سخت گراں (گزرتا) ہے۔ (اے لوگو) وہ تمہارے لئے (بھلائی اور ہدایت کے) بڑے طالب و آرزومند رہتے ہیں۔(اور) مومنوں کے لئے نہایت (ہی) شفیق بے حد رحم فرمانے والے ہیں۔

ہر گل میں ہر شجر میں اسی کا ظہور ہے جہانوں کے اندر شانیں بھی لاتعداد ہیں صرف حضرتِ انسان کو ہی اللہ تعالی نے اتنی شانیں عطا کی ہیں کہ وہ حد شمار سے باہر ہیں۔ہم ان کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب شانیں مخلوقات اور تعریفیں اللہ کی ہیں چہ معنی دارد؟ اس سوال کا کافی وشافی جواب یہ ہے کہ جو شانیں عالمین میں پائی جاتی ہیں وہ سب الحمد للہ میں سمودی گئی ہیں۔الحمد للہ ایک حقیقت ہے جبکہ العالمین میں شانوں کا ظہور ایک واقعہ ہے۔

فَاَینَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجہُ اللّٰہِ۔ پس تم جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی اللہ کی توجہ ہے) یعنی ہر سمت ہی اللہ کی ذات جلوہ گر ہے(۔الغرض ساری کائناتِ زیریں وبالا اللہ تعالی کی شانِ ربوبیت کا پرتو اور مظہر ہے۔

شانِ ربوبیت کا مظہر اتم۔۔۔۔ذاتِ مصطفیٰ ﷺ

اللہ تعالی نے اپنے سرمدی حسن کی تمام شانوں اور جلوں کو بکھیرا تو کائنات وجود میں

آ گئی اور کائنات کی متنوع شانوں، رنگینیوں اور عنائیوں کو سمیٹا تو وجاہتوں کا پیکر انسان بن گیا جس کے لئے ارشاد ربانی ہے:

لَقَد خَلَقنَا الاِنسَانَ فِیٓ اَحسَنِ تقوِیم ۔ بیشک ہم نے انسان کو بہترین (اعتدال اور توازن والی) ساخت میں پیدا فرمایا۔ کائنات انسانی کے تمام کمالات کو یکجا کیا تو کائنات نبوت وجود میں آ گئی۔کائناتِ نبوت ورسالت کا ہر فرد حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسی تک آپ کے نور ابدتاب سے متیز ہوا اسی لئے قرآن پاک آپ کی شان میں مدح سرائی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔

اُولٰٓئکَ الَّذِینَ ھدَی اللّٰہُ فَبِھدٰھُمُ اقتَدِہ۔ (یہی) وہ لوگ (یعنی پیغمبرانِ خدا) ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت فرمائی ہے پس (اے رسولِ آخرالزمان)! آپ ان کے (فضیلت والے سب) طریقوں (کو اپنی سیرت میں جمع کر کے ان) کی پیروی کریں (تاکہ آپ ﷺ کی ذات میں ان تمام انبیا ورسل کے فضائل وکمالات یکجا ہو جائیں)۔ حالق ارض وسماوات نے حضرت محمد ﷺ کو اپنی تمام شانوں کا مظہر اتم بنا دیا ہے۔اسی مظہریت میں الوہیت اور ربوبیت کے تمام جلوہ ہائے حسن کی کارفرمائی بہ درجہ کمال ضوفگن ہے پھر نہ صرف یہ کہ آپ ﷺ کو تمام شانوں کا جامع پیدا کیا بلکہ صحیح بخاری کی درج ذیل روایت کے مطابق آپ ان شانوں اور رب ذوالجلال کی عطا کردہ نعمتوں کے قاسم بھی ہیں جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِنّماأ نا قاسم واللہ یعطیی۔ میں تو صرف تقسیم کرتا ہوں اور اللہ رب العزت عطا فرماتا ہے۔حقیقتاً علیم اللہ تعالی ہے اور بندہ اس کی صفتِ علمیت کا مظہر ہے۔علمِ الٰہی کے بہترین مظہر انبیا کرام کے نفوس قدسیہ ہیں اور گروہ انبیا کرام میں بہترین مظہر سیدالانبیا حضور تاجدارِ کائنات ﷺ ہیں۔آیت الکرسی کے مذکورہ حصے کی تفسیر سے واضح ہوتا ہے کہ علم غیب ذاتی طور پر صرف اللہ تعالی کی ملک ہے۔اس کے علاوہ کسی کو اس طرح کا علم غیب حاصل نہیں۔مخلوق کا علم محض

عطائی ہے۔ وہ اللہ تعالی کی عطا سے ہوتا ہے اور اللہ تعالی کی عطا کوئی روک نہیں سکتا۔ اللہ تعالی کی یہ شان ہے کہ وہ انبیا کو غیب پر مطلع فرماتا ہے۔ حضور ﷺ بھی بلاشبہ مطلع الغیب ہیں۔ اس بات کا انکار آیت مذکورہ کے انکار کے مترادف ہوگا۔

وَسِعَ كُرسِيُهُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرض کا معنی

اس کی بادشاہی اور علم آسمانوں اور زمین سب پر حاوی ہے۔

قرآن حکیم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ معنوی امور کی تعبیر محسوس انداز میں کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس سے روایت ہے کہ اگر سات آسمان اور سات زمینوں کو بچھا دیا جائے تب بھی وہ اللہ تعالی کی کرسی کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے ایک انگوٹھی کسی لق و دق صحرا میں پڑی ہو۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: سات آسمان اور سات زمینیں کرسی کے مقابلہ میں اس طرح ہیں جیسے کسی جنگل میں انگوٹھی کا چھلہ پڑا ہوا اور عرش کی فضیلت کرسی پر اس طرح ہے جیسے صحرا کی فضیلت اس انگوٹھی کے چھلے پر ہے۔ مفسرین نے کرسی کی ظرفیت کا یہی تعارف کروایا ہے کہ وہ ان آسمانوں اور زمین کے مجموعی حجم سے کہیں زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ اس کرسی سے بزرگ تر اور وسیع تر ایک دوسری مخلوق بھی موجود ہے اور وہ بھی پروردِگارِ عالم کی قلمرو میں داخل ہے۔ روایات کے مطابق کرسی ایک ایسے بڑے افلا کی جرم کا نام ہے کہ جس میں تمام آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر سما لینے کی گنجائش موجود ہے۔ اللہ تعالی نے اس کے بارے میں فرمایا:

وَسِعَ كُرسِيُهُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرض ۔ حضرت امام جعفر صادقؓ سے آیت الکرسی کے اس جملے کے بارے میں سوال کیا کہ آیا آسمانوں اور زمین نے کرسی کو گھیرا ہوا ہے یا کرسی نے آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لیا ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا: تمام اشیاء کرسی کے اندر ہیں یعنی کرسی میں تمام آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر سما لینے کی گنجائش موجود ہے۔

مخفی نہ رہے کہ باری تعالی کی سلطنت و قدرت بھی اس ذات مقدس کی دیگر تمام صفات کی طرح

ازلی، ابدی اور لامحدود ہے۔ اس کی قدرت کا کسی مخلوق کی قدرت و توانائی پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ مخلوق کے پاس جو کمال ہے وہ اکتسابی اور محدود ہے جب کہ اس ذات اقدس کا کمال عین ذات اور لامحدود ہے۔ وہ فقط اللہ تعالیٰ ہے جو قوی، مطلق، کائنات کا واقعی مالک، عالم بدون تعلم اور قادر بدون عجز ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو لامحدود سلطنت وحکومت کا مالک ہے اور اس کی ازلی وابدی قدرت نے تمام آسمانوں، زمین اور ہر شے کا احاطہ کیا ہوا ہے۔

وَلَا یَؤُوْدُہٗ حِفۡظُهُمَا وَ هُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ کا معنیٰ

اور اس پر ان دونوں یعنی زمین و آسمان کی حفاظت ہرگز دشوار نہیں، وہی سب سے بلند رتبہ بڑی عظمت والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حیات کو بھی اس طرح تصور کرنے لگیں کہ اللہ 'حی' کے لئے ممکن نہیں کہ وہ ہمیشہ کے لئے 'قیوم' ہے، کیونکہ ہر زندہ قطعی طور پر خواب و استراحت کی احتیاج رکھتا ہے۔ جب کسی کو نیند آ جاتی ہے تو وہ غافل ہو جاتا ہے اور اپنی حفاظت کے قابل نہیں رہتا۔ چہ جائیکہ وہ دیگر افراد کی حفاظت کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت آسمانوں، زمین اور ان میں پائی جانے والی تمام اشیا پر حاوی ہے۔ تھکاوٹ، کمزوری وغیرہ مادی قوت کے عوارض ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ تمام مادی نقائص سے منزہ و مبرا ہے۔ انسانی وجود میں پائی جانے والی محنت و کوشش کی توانائی مادے سے قائم ہے، چونکہ مادہ محدود ہے اس لئے اس میں پوشیدہ توانائی بھی لازماً محدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ دیر محنت و کوشش کرنے کے بعد انسان کی توانائی کمزور پڑنے لگتی ہے اور اس کے بدن میں تھکاوٹ اور خستگی کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مادہ و مادیات سے منزہ ہے۔ مادی نقائص اور جسمانی عوارض سے بھی مبرا ہے۔ اس کی قدرت اس کے لئے عین یعنی لازم ذات ہے اور اس کی ذات لازم قدرت ہے۔ کمزوری، سستی، فرسودگی، خستگی، تھکاوٹ وغیرہ سب مادی موجودات کے عوارض ہیں۔ خستگی اور تھکن ایک طبعی عمل ہے اور یہ ہر زندہ مادے کی خاصیت ہے۔ تھکاوٹ کے دور کرنے

کے لئے اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ اس عضو میں سے نکلے ہوئے زائد مواد اور بدن پر موجود زائد مواد کو دھو دیا جائے اور وہ ختم ہو جائے۔ تھکے ہوئے آدمی کی سانس اور پسینہ زہریلے مواد سے بھرے ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے بدن سے ایک ناپسندیدہ بو آنے لگتی ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: لوگوں میں ہر عبادت کے لئے ایک نشاط اور شدید رغبت کا مرحلہ ہوتا ہے تو ایک سستی اور تنگی کا مرحلہ بھی ہوتا ہے، جس نے عبادت کی طرف اپنے شدید میلان کو میری سنت کے مطابق کر لیا تو وہ ہدایت پا گیا اور جس نے میری سنت کی مخالفت کی وہ گمراہ ہو گیا اور اس کا عمل تباہی میں پڑ گیا میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور آرام کی نیند بھی سوتا ہوں، ہنستا بھی ہوں اور روتا بھی ہوں، جو بھی میری سنت سے اعراض کرے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میں اور میری امت کے متقی لوگ تکلف سے بری ہیں یعنی ہم سب ایسے کاموں سے منزہ اور مبرا ہیں جن میں تصنع ریا اور مشقت ہو اور انہیں بے دلی کے ساتھ اپنے اوپر بوجھ سمجھ کر انجام دینا پڑے۔ اس کے پیش نظر کہ تھکاوٹ اس زہریلے مواد کا نام ہے جو عضلاتی یا دماغی کام میں حد سے زیادہ مصروف رہنے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ ذات باری تعالی کے حریم قدس میں تھکاوٹ اور بوریت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ کسی شے سے ہرگز مغلوب نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے قرآن حکیم میں خداوند تعالی کی صفتِ قدرت عزیز کے ساتھ آتی ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزْ۔ بیشک آپ کا رب ہی طاقتور غالب ہے۔ عزیز وہ ہوتا ہے جو غالب رہے مغلوب نہ ہو۔ ایک ایمان دار شخص جو اپنی حفاظت کے قصد سے آیت الکرسی پڑھتا ہے وہ خود کو خدا کے سپرد کرتا ہے۔ جب وہ 'لَا يؤده حفظهما' تک پہنچتا ہے تو وہ اللہ تعالی کی لامحدود قدرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ جس سے اپنے پورے وجود میں آرام و امید کی ایک موج محسوس کرتا ہے۔ وہ خود کو ایک قابلِ اطمینان نظام کے اندر محسوس کرتا ہے، کیونکہ اس نے اپنے آپ کو اس خداوند قدیر کی حفاظت و نگہبانی میں دے دیا ہے جو اس بزرگ ترین جہان

ہستی کی بغیر کسی مشقت وزحمت کے حفاظت کرر ہا ہے، تو پھر یہ ضعیف سے انسان کی حفاظت اس کے لئے کیا مشکل ہے؟ **وهو العلیی العظیم** ۔ **’علیی‘** کا معنی ہے رفیع القدر اور عالی منزلت، جب اس سے اللہ تعالی کا وصف بیان کیا جاتا ہے تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ خداوند کریم اس سے بلند تر و بالا تر ہے کہ توصیف کرنے والوں کی توصیف اور معرفت حاصل کرنے والوں کا علم اس بلند ترین ذات کا احاطہ کر سکے اور اس مقدس حقیقت تک پہنچ سکے۔

تَبٰرَكَ الَّذِی بِیَدِهِ المُلكُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیءٍ قَدِیر۔ وہ ذات نہایت بابرکت ہے جس کے دستِ (قدرت) میں (تمام جہانوں کی) سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔

اَلَّذِی لَه' مُلكُ السَّمٰوٰتِ وَالاَ رضِ وَاللهُ عَلٰی كُلِّ شَیءٍ شَهِیدٌ۔
جس کے لئے آسمانوں اور زمین کی (ساری) بادشاہت ہے اور اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

وَمَا النَّصرُ اِلَّا مِن عِندِاللهِ العَزِیزِ الحَكِیمِ۔ اور مدد تو صرف اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے جو بڑا غالب حکمت والا ہے۔

وَمَن یَتَوَكَّل عَلَی اللهِ فَاِنَّ اللهَ عَزِیزٌ حَكِیمٌ ۔ جو کوئی اللہ پر توکل کرتا ہے تو (اللہ اس کے جملہ امور کا کفیل ہو جاتا ہے) بیشک اللہ بہت غالب بڑی حکمت والا ہے۔ آیت الکرسی کا بنیادی ہدف انسانی افکار کو بیدار کرنا اور بشر کو خود ساختہ معبودوں کی غلامی اور بندگی سے نجات دلانا ہے۔ یہ آیت بھی ’العلیی‘ اور ’العظیم‘ کی دو صفات پر ختم ہوئی ہے۔ العلیی، العظیم وہ ہے جو انتہائی عظمتوں والا ہے۔ قرآن حکیم کی سورۃ الواقعہ میں اللہ تعالی کی یہ صفتِ عظیم بطور ’ربِ عظیم‘ آئی ہے۔ آیت الکرسی خوابیدہ عقول کو بیدار کرتی ہے اور معاشرے کے اندر ایک فکری حرکت کو جنم دیتی ہے۔ وہ لوگوں کو شرک و بت پرستی کے تاریک ماحول سے باہر نکالتی ہے اور انہیں توحید و آزادی کی نورانی فضاں کی سیر کراتی ہے۔ مختصر یہ کہ آیت الکرسی انسانوں کی آزادی کا نعرہ اور ان

کی سعادت ابدی کا اعلان ہے۔ انسان خواہ کتنا ہی بلند مرتبہ ہو جائے اور کتنی ہی عظمتیں حاصل کر لے مگر مقام عبودیت تک ہر گز نہیں پہنچ سکتا اور یہی حقیقت اگر نفسِ انسانی میں پوری طرح جاں گزیں اور قلب انسان میں پوری طرح مرتسم ہو جائے تو انسان کبھی بھی تکبر، غرور، انحراف اور سرکشی اختیار نہ کرے۔

نظامِ کائنات اور معرفتِ ربانی: یہ وسیع جہانِ ہستی نظامِ کائنات جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے جیسا کہ ہم جانتے ہیں اس کا ہر ایک جز و اور ذرہ کلی طور پر ہمیشہ تغیر و تبدل کا شکار ہے اور ہر لحظہ اس کی شکل و صورت دگرگوں ہو کر ایک نیا روپ دھار لیتی ہے جو پہلے سے بالکل مختلف ہوتی ہے اور پھر قوانین کے زیر اثر جس میں استثنا موجود نہیں ہے، حقیقت اور اثبات کا لباس پہن لیتی ہے اور اس طرح بہت بلند اور دور کہکشاں سے لے کر چھوٹے چھوٹے ذرے تک جن سے اس جہان کی تشکیل و تکمیل ہوئی ہے، ہر چیز ایک خاص اور واضح نظام میں حرکت کرتی ہے۔ بڑے حیرت انگیز طریقے سے یہ ساری چیزیں اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہیں لہذا سب اشیا اپنے دائرہ عمل کو بہت ہی پست اور نچلی سطح سے مکمل ترین حالت کی طرف بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ تکمیل کے مرحلے تک پہنچ جاتی ہیں۔ دنیا کے تمام مظاہر جن میں انسان زندگی گزارتا ہے آپس میں مربوط ہیں۔ یعنی ہر چیز اپنے کمال کی طرف گامزن ہے۔ دنیا کے ماہرین اور دانشور اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں رکھتے کہ وہ بے شمار تجربے جو انہوں نے اپنی چھ ہزار سالہ علمی کاوشوں کے ذریعے حاصل کئے ہیں وہ فطرت اور کائنات کے اسرار میں سے ایک بہت ہی معمولی جلوہ ہیں جس کے پیچھے ایک بہت ہی طویل اور بے انتہا سلسلہ موجود ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وسیع جہان ہستی کائنات جس کے تمام اجزا الگ الگ ہوتے ہوئے بھی آپس میں ایک مضبوط اتحاد اور وحدت واتصال اور حیرت انگیز اتفاق رکھتے ہیں اور یہ سب ایک لامتناہی طاقت اور علم کو بیان کرتے ہیں۔ ان کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے اور یہ سب کچھ اپنے آپ عبث

اور فضول پیدا ہو گیا ہے۔

آیت الکرسی اور عقیدہ توحید: آیت الکرسی میں بنی نوع انسان کو دنیا کی تخلیق کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ وہ انہیں دعوت دیتی ہے کہ وہ موجوداتِ دنیا اور 'اپنے نفسوں' کے بارے میں غور وفکر کریں کیونکہ اپنی چندروزہ دنیاوی زندگی میں انسان خواہ کوئی راستہ اختیار کرے یا کسی حالت میں بھی ہو عالمِ ہستی سے باہر نہیں جا سکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ جس قسم کا خدا کا تصور ہمارے سامنے ہو گا اسی قسم کی

ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی ہو گی۔ حدیث شریف ہے:

اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَم عَلٰی صورتہ۔ اللہ تعالی نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

حسن الخلق خلق اللّٰہ الاعظم۔ حسن خلق اللہ تعالی کا خلق عظیم ہے۔

اَبٰی وَاستَکبَرَ وَکَانَ مِنَ الکٰفِرِین۔ اس نے انکار اور تکبر کیا اور (نتیجۃً) کافروں میں سے ہو گیا۔

وَلَہُ الکِبرِیَآءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالاَ رضِ وَھُوَ العَزِیزُ الحَکِیم۔ اور آسمانوں اور زمین میں ساری کبریائی (یعنی بڑائی) اسی کے لئے ہے اور وہی بڑا غالب بڑی حکمت والا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی فرماتا ہے: عزت میرا لباس اور کبریائی میری چادر ہے جو کوئی عزت و کبریائی میں سے کسی ایک میں بھی میرا حریف بنے گا میں اسے دوزخ میں ڈال دوں گا۔

دوسری جگہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے نزدیک سب سے براوہ ہے جو اپنا نام بادشاہوں کا بادشاہ اور شہنشاہ رکھتا ہے اللہ کے سوا کوئی بادشاہ اور مالک حقیقی نہیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

وَلِلّٰہِ العِزَّ ۃُ وَلِرَسُولِہ وَلِلمُؤمِنِینَ۔ حالانکہ عزت تو صرف اللہ کے لئے اور اس کے رسول ﷺ کیلئے اور مومنوں کے لئے ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ رحم کی جڑ رحمان سے ہے، اللہ فرماتا ہے کہ اے رحم! جو تجھ کو قطع رحم کرے گا میں ان کو قطع کروں گا، جو تجھ کو ملائے گا اس کو میں بھی ملاں گا۔

وَاَنَّ اللّٰهَ لَیسَ بِظَلَّامٍ لِّلعَبِیدِ۔ اور بیشک اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

خدائی تعلیمات کے درمیان سے ہٹتے ہی اخلاقی اقدار واضح و متعین نہیں رہتیں نہ وہ تفصیلی ضوابط باقی رہ جاتے ہیں جن کے ذریعہ اخلاقی اصولوں پر انطباق ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگر اخلاقی اقدار کو مجبوراً باندھے کسی طرح مان بھی لیا جائے تو مسائل زندگی کی بھی کوئی عملی افادیت نہیں رہ جاتی اور اخلاقی مسئلہ جوں کا توں رہتا ہے۔

یہ آیت الکرسی کی اجمالی دعوت تھی جس کو قدرے تفصیل کے ساتھ ہم نے بیان کیا ہے اور بے بنیاد اور من گھڑت اور خود تراشیدہ فاسد و باطل عقائد کی بھی بیخ کنی کی ہے۔ اللہ تعالی اسے شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین۔

مآخذ و مراجع

۱- القرآن الحکیم۔

۲- آلوسی، ابوالفضل شہاب الدین السید محمود (۱۲۷۰ھ)۔ روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم و السبع المثانی۔ بیروت، لبنان: دار الاحیاء التراث۔

۳- ابن ابی شیبہ، ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابراہیم بن عثمان کوفی (۱۵۹-۲۳۵ھ/۷۷۶-۸۴۹ء)۔ المصنف۔ ریاض، سعودی عرب: مکتبۃ الرشد، ۱۴۰۹ھ۔

۴ - ابن جوزی، ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی بن محمد بن عبیداللہ (۵۰۹-۵۷۹ھ/۱۱۱۶-۱۲۰۱ء)۔ زاد المسیر فی علم التفسیر۔ بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی، ۱۴۰۴ھ۔

۵- ابن حبان، ابوحاتم محمد بن حبان بن احمد بن حبان (۲۷۰-۳۵۴ھ/۸۸۴-۹۶۵ء)۔ الصحیح۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء۔

٦- ابن حزم، علی بن احمد بن سعید اندلسی (۳۸۴-۴۵٦ھ/ ۹۹۴- ۱۰٦۴ء)۔ المحلی۔ بیروت، لبنان: دارالآفاق الجدیدہ۔

۷- ابن خزیمہ، ابو بکر محمد بن اسحاق (۲۲۳- ۳۱۱ھ/ ۸۳۸- ۹۲۴ء)۔ الصحیح۔ بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی، ۱۳۹۰ھ/ ۱۹۷۰ء۔

۸- ابن عباس، صحابئ رسول حضرت عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلبؓ (٦۸ھ)۔ تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس۔ بیروت، لبنان: دارالکتب العلمیہ۔

۹- ابن کثیر، ابوالفدا اسماعیل بن عمر (۷۰۱- ۷۷۴ھ/ ۳۰۱- ۱۳۷۳ء)۔ تفسیر القرآن العظیم۔ بیروت، لبنان: دارالمعرفہ، ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء۔

۱۰- ابن ماجہ، ابو عبداللہ محمد بن یزید قزوینی (۲۰۹- ۲۷۳ھ/ ۸۲۴- ۸۸۷ء)۔ السنن۔ بیروت، لبنان: دارالکتب العلیمہ، ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸ء۔

۱۱- ابن منظور افریقی، امام العلامۃ ابوالفضل جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور المصری (۷۱۱ھ)۔ لسان العرب۔ بیروت، لبنان: دارصادر۔

۱۲- ابو حیان، محمد بن یوسف اندلسی غرناطی (٦۵۴- ۷۵۴ھ)۔ البحر المحیط۔ بیروت، لبنان: دارالفکر، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء۔

۱۳- ابو داؤد، سلیمان بن اشعث سجستانی (۲۰۲-۲۷۵ھ/ ۸۱۷-۸۸۹ء)۔ السنن۔ بیروت، لبنان: دارالفکر، ۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۴ء۔

۱۴- ابوسعود، محمد بن محمد العمادی (۹۵۱ھ)۔ تفسیر ارشاد العقل السلیم الی مذایا القرآن الکریم۔ بیروت، لبنان: داراحیاالتراث العربی۔

۱۵- ابونعیم، احمد بن عبداللہ بن احمد بن اسحاق بن موسی بن مہران اصبہانی (۳۳٦-۴۳۰ھ/ ۹۴۸-۱۰۳۸)۔ دلائل النبوہ۔ حیدرآباد، بھارت: مجلس دائرہ معارف عثمانیہ، ۱۳٦۹ھ/ ۱۹۵۰ء۔

۱۶- ابویعلی، احمد بن علی بن مثنی بن یحیی بن عیسی بن ہلال موصلی تمیمی (۲۱۰-۳۰۷ھ/۸۲۵-۹۱۹ء۔ المسند۔ دمشق، شام: دار المامون للتراث، ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۷ء۔

۱۷۔ ابویوسف، یعقوب بن ابراہیم (م۱۸۲ھ)۔ کتاب الخراج۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ۔

۱۸- احمد بن حنبل، ابوعبداللہ بن محمد (۱۶۴-۲۴۱ھ/۷۸۰-۸۵۵ء)۔ المسند۔ بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی، ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء۔

۱۹- اقبال، علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸ء)۔ کلیات اقبال (فارسی)۔ لاہور، پاکستان: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۴ء۔

۲۰- اسماعیل حقی، علامہ اسماعیل حقی حنفی (۱۱۳۷ھ)۔ تفسیر روح البیان۔ کوئٹہ، پاکستان: مکتبہ اسلامیہ کوئٹہ۔

۲۱- بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ (۱۹۴-۲۵۶ھ/۸۱۰-۸۷۰ء)۔ الصحیح۔ بیرات، لبنان + دمشق، شام: دار القلم، ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء۔

۲۲ -بغوی، ابو محمد حسین بن مسعود بن محمد (۴۳۶ -۵۱۶ھ / ۱۰۴۴ -۱۱۲۲ء)۔ معالم التنزیل۔ بیروت، لبنان: دار المعرفۃ، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء۔

۲۳ -بغوی، ابومحمد بن فرا حسین بن مسعود بن محمد (۴۳۶-۵۱۶ھ/۱۰۴۴-۱۱۲۲ء)۔ شرح السنہ۔ بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی، ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء۔

۲۴ -بیضاوی، ناصرالدین ابی سعید عبداللہ بن عمر بن محمد شیرازی بیضاوی (۷۹۱ھ)۔ اُنوار التنزیل۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۶ء۔

۲۵- بیہقی، ابوبکر احمد بن حسین بن علی بن عبداللہ بن موسی (۳۸۴-۴۵۸ھ/۹۹۴-۱۰۶۶)۔ السماءُ والصفات۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ۔

۲۶- بیہقی، ابوبکر احمد بن حسین بن علی بن عبداللہ بن موسی (۳۸۴-۴۵۸ھ/۹۹۴-۱۰۶۶)۔

دلائل النبوۃ۔ بیروت، لبنان: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء۔

۲۷۔ بیہقی، ابوبکر احمد بن حسین بن علی بن عبداللہ بن موسی (۳۸۴-۴۵۸ھ/ ۹۹۴-۱۰۶۶)۔ السنن الکبری۔ مکہ مکرمہ، سعودی عرب: مکتبہ دارالباز، ۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۴ء۔

۲۸۔ بیہقی، ابوبکر احمد بن حسین بن علی بن عبداللہ بن موسی (۳۸۴-۴۵۸ھ/ ۹۹۴-۱۰۶۶)۔ شعب الیمان۔ بیروت، لبنان: دارالکتب العلیمہ، ۱۴۱۰ھ/۱۹۹۰ء۔

۲۹ - ترمذی، ابوعیسی محمد بن عیسی بن سورہ بن موسی بن ضحاک سلمی (۲۱۰ -۲۷۹ھ /۸۲۵-۸۹۲ء)۔ السنن۔ بیروت، لبنان: دارالغرب الاسلامی، ۱۹۹۸ء۔

۳۰ - تفتازانی، سعدالدین مسعود بن عمر بن عبداللہ (۷۱۲ -۷۹۱ھ /۱۳۱۲ -۱۳۸۹)۔ شرح العقائد النسفیۃ۔ کراچی، پاکستان: مکتبہ خیر کثیر۔

۳۱۔ جرجانی، علی بن محمد بن علی، سید شریف (۷۴۰-۸۱۶ھ)۔ التعریفات۔ بیروت، لبنان: عالم الکتب، ۱۴۱۶ھ/۱۹۹٦۔

۳۲۔ عجیلی، سلیمان بن عمر الشافعی (م۱۲۰۴ھ)۔ الفتوحات الالھی بتوضیع تفسیر الجلالین للدقائق الحنفیۃ (المعروف: تفسیر الجمل)۔ بیروت، لبنان: دارالفکر۔

۳۳۔ حاکم، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن محمد (۳۲۱-۴۰۵ھ/ ۹۳۳- ۱۰۱۴ء)۔ المستدرک علی الصحیحین۔ بیروت، لبنان: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۱۱ھ/۱۹۹۰ء۔

۳۴۔ خازن، علی بن محمد بن ابراہیم بن عمر بن خلیل (۶۷۸-۷۴۱ھ/۱۲۷۹-۱۳۴۰)۔ لباب التاویل فی معانی التنزیل۔ بیروت، لبنان: دارالمعرفہ۔

۳۵۔ دارقطنی، ابوالحسن علی بن عمر بن احمد بن مہدی بن مسعود بن نعمان (۳۰۶-۳۸۵ھ/۹۱۸-۹۹۵ء)۔ السنن۔ بیروت، لبنان: دارالمعرفہ، ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء۔

۳۶۔ دارمی، ابو محمد عبداللہ بن عبد الرحمٰن (۱۸۱۔۲۵۵ھ/۷۹۷۔۸۶۹ء)۔ السنن۔ بیروت، لبنان: دارالکتاب العربی، ۱۴۰۷ھ۔

۳۷۔ ذھبی، شمس الدین محمد بن احمد (۶۷۳۔۷۴۸ھ)۔ میزان الاعتدال فی نقد الرجال۔ بیروت، لبنان: دارالکتب العلمیہ، ۱۹۹۵ء۔

۳۸۔ راغب اصفہانی، ابو قاسم حسین بن محمد (م ۵۰۲ھ/۱۱۰۸ء)۔ المفردات۔ دمشق، شام: دارالقلم۔

۳۹۔ رازی، محمد بن عمر بن حسن بن حسین بن علی تیمی (۵۴۳۔۶۰۶ھ/۱۱۴۹۔۱۲۱۰ء)۔ التفسیر الکبیر۔ تہران، ایران: دارالکتب العلمیہ۔

۴۰۔ رشید رضا، علامہ محمد رشید رضا، (۳۵۴ھ)۔ تفسیر المنار۔ بیروت، دارالمعرفۃ

۴۱۔ زمخشری، امام جاراللہ محمد بن عمر بن محمد خوارزمی (۴۶۷۔۵۳۸ھ)۔ الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل۔ قاہرہ، مصر: ۱۳۷۳ھ/۱۹۳۵ء۔

۴۲۔ سعید بن منصور، ابو عثمان الخراسانی (م ۲۲۷ھ)۔ السنن۔ ریاض، سعودی عرب: دارالعصیمی، ۱۴۱۴ھ۔

۴۳۔ سیوطی، جلال الدین ابو الفضل عبدالرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹۔۹۱۱ھ/۱۴۴۵۔۱۵۰۵ء(۔ آیت الکرسی: معانیھا وفضائلھا۔ بغداد، عراق: دارالتربیۃ۔

۴۴۔ سیوطی، جلال الدین ابو الفضل عبدالرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹۔۹۱۱ھ/۱۴۴۵۔۱۵۰۵ء)۔ الجامع الصغیر فی حادیث البشیر ۵ النذیر۔ بیروت، لبنان: دارالکتب العلمیہ۔

۴۵۔ سیوطی، جلال الدین ابو الفضل عبدالرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹۔۹۱۱ھ/۱۴۴۵۔۱۵۰۵ء)۔ الدرالمنثور فی التفسیر بالماثور۔ بیروت، لبنان: دارالمعرفۃ۔

۴۶۔ سیوطی، جلال الدین ابو الفضل عبدالرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹۔۹۱۱ھ / ۱۴۴۵۔۱۵۰۵ء) + محلی، جلال الدین محمد بن احمد بن محمد بن ابراہیم بن احمد بن ہاشم (۷۹۱۔۸۶۴ھ / ۱۳۸۹۔۱۴۵۹ء)۔ تفسیر الجلالین۔ بیروت، لبنان: دارابن کثیر، ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء۔

۴۷۔ شاہ ولی اللہ، محدث دہلوی (م:۱۱۷۴ھ/۱۷۶۲ء)۔ التفہیمات الالھیہ۔ حیدر آباد / پاکستان: مطبع حیدری، ۱۹۶۷ء۔

۴۸۔ شاہ ولی اللہ، محدث دہلوی (م:۱۱۷۴ھ/۱۷۶۲ء)۔ حجۃ اللہ البالغۃ۔ لاہور، پاکستان: المکتبۃ السّلفیہ۔

۴۹۔ شعرانی، ابوالعمران عبدالوہاب بن احمد بن علی ال الشافعی المصری المعروف بالشعرانی، (۸۹۸۔۹۷۳ھ (۔ الیواقیت والجواہر فی بیان عقائد الاکابر۔ بیروت، لبنان: داراحیا التراث العربی۔

۵۰۔ طبرانی، سلیمان بن احمد (۲۶۰۔۳۶۰ھ / ۸۷۳۔۹۷۱ء)۔ المعجم الاوسط۔ ریاض، سعودی عرب: مکتب المعارف، ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء۔

۵۱۔ طبرانی، سلیمان بن احمد (۲۶۰۔۳۶۰ھ / ۸۷۳۔۹۷۱ء)۔ المعجم الکبیر۔ موصل، عراق: مکتب العلوم والحکم، ۱۴۰۴ھ/ ۱۹۸۳ء۔

۵۲۔ طبری، ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید (۲۲۴۔۳۱۰ھ /۸۳۹۔۹۲۳ء)۔ جامع البیان فی تفسیر القرآن۔ بیروت، لبنان: دارالمعرفہ، ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء۔

۵۳۔ عبد بن حمید، ابومحمد بن نصر الکسی (م ۲۴۹ھ /۸۶۶ء)۔ المسند۔ قاہرہ، مصر: مکتبۃ السنہ، ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ء۔

۵۴۔ عسقلانی، احمد بن علی بن محمد بن علی بن احمد کنانی (۷۷۳۔۸۵۲ھ / ۱۳۷۲۔۱۴۴۹ء)۔

فتح الباری بشرح صحیح البخاری۔ لاہور، پاکستان: دار نشر الکتب الاسلامیہ، ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء۔

۵۵۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی (۱۲۲۵ھ)۔ التفسیر المظھری۔ کوئٹہ، پاکستان: بلوچستان بک ڈپو۔

۵۶۔ قاضی عیاض، ابو الفضل عیاض بن موسی بن عیاض بن عمرو بن موسی بن عیاض بن محمد بن موسی بن عیاض یحصبی (۴۷۶-۵۴۴ھ/۱۰۸۳-۱۱۴۹ء)۔ الشفاء بتعریف حقوق المصطفی۔ بیروت، لبنان: دار الکتاب العربی۔

۵۷۔ قرطبی، ابو عبداللہ محمد بن احمد بن محمد بن یحیی بن مفرج اموی (۲۸۴-۳۸۰ھ/ ۸۹۷-۹۹۰ء)۔ الجامع لاحکام القرآن۔ بیروت، لبنان: دار احیا التراث العربی۔

۵۸۔ قضاعی، ابو عبداللہ محمد بن سلامہ بن جعفر بن علی بن حکمون بن ابراہیم بن محمد بن مسلم قضاعی (م ۴۵۴ھ/۱۰۶۲ء)۔ مسند الشھاب۔ بیروت، لبنان: مسستہ الرسالہ، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۶ء۔

۵۹۔ مالک، ابن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمرو بن حارث اصبحی (۹۳-۱۷۹ھ /۷۱۲-۷۹۵ء)۔ الموطا۔ بیروت، لبنان: دار احیا التراث العربی، ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۵ء۔

۶۰۔ محمد عبدہ، الشیخ۔ نھج البلاغ۔ بغداد، عراق: دار الکتب العلیمہ۔

۶۱۔ مسلم، ابن الحجاج قشیری (۲۰۶-۲۶۱ھ/۸۲۱-۸۷۵ء)۔ الصحیح۔ بیروت، لبنان: دار احیا التراث العربی۔

۶۲۔ مقدسی، شیخ ضیا الدین ابو عبداللہ محمد بن عبداواحد بن عبدالرحمان حنبلی مقدسی (۵۶۷-۶۴۳ھ)۔ الاحایث المختار۔ مکۃ المکرّمۃ، مکتبۃ النھضۃ، ۱۴۱۰ھ/۱۹۹۰ء۔

۶۳۔ ملا علی قاری، نور الدین بن سلطان محمد ہروی حنفی (م ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۶ء)۔ مرقا المفاتیح شرح مشکوا المصابیح۔ بمبئی، بھارت، اصح المطابع۔

۶۴۔ منذری، ابو محمد عبدالعظیم بن عبدالقوی بن عبداللہ بن سلامہ بن سعد (۵۸۱-۶۵۶ھ

/۱۱۸۵۔ ۱۲۵۸ء)۔ الترغیب و الترھیب من الحدیث الشریف۔ بیروت، لبنان: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۱۷ھ۔

۶۵۔ نسائی، احمد بن شعیب (۲۱۵۔۳۰۳ھ /۸۳۰۔۹۱۵ء)۔ السنن۔ بیروت، لبنان: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۵ء۔

۶۶۔ نسائی، احمد بن شعیب (۲۱۵۔۳۰۳ھ/۸۳۰۔۹۱۵ء)۔السنن الکبری۔ بیروت، لبنان: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۱۱ھ/۱۹۹۱ء۔

۶۷۔ نسفی، عمر بن محمد نسفی (۵۳۷ھ)۔ العقیدۃ النسفیۃ۔ بیروت، لبنان، مرکز الخدمات والابحاث الثقافیہ، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء۔

۶۸۔ نسفی، عبداللہ بن محمود بن احمد نسفی (۷۱۰ھ)۔ مدارک التنزیل وحقائق التاویل۔ بیروت، لبنان، داراحیاالتراث العربی۔

۶۹۔ ہیثمی، نورالدین ابوالحسن علی بن ابی بکر بن سلیمان (۷۳۵۔۸۰۷ھ/۱۳۳۵۔۱۴۰۵ء)۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوئد۔ قاہرہ، مصر: دارالریان للتراث + بیروت، لبنان: دارالکتاب العربی، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء۔

۷۰۔ ہندی، حسام الدین، علا الدین علی متقی (م۹۷۵ھ)۔ کنزالعمال۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۳۹۹/۱۹۷۹ء۔

تفسیر القرآن

سورۃ النبا

اس سورۃ مبارکہ کا نام النبا ہے نبا کے معنی ہے خبر۔ یہ دو رکوع اور چالیس آیتوں پر مشتمل ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

سورۃ النبا کا موضوع تفسیرِ مَعالم العِرفان سے (صفحہ نمبر ۳۱)

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کا ذکر ایک خاص انداز سے کیا ہے۔ قیامت کا عقیدہ اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے لہذا اللہ تعالیٰ نے قیامت کو پیش آنے والے محاسبہ اور جزائے عمل کو ان سورتوں میں مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔

سورۃ النبا تفسیرِ معالم العِرفان سے (صفحہ نمبر ۳۰)

معالم العرفان میں سورۃ النبا کی یوں تفسیر کی گئی ہے کہ قیامت کا ذکر نفسِ انسانی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کیا گیا یعنی جب قیامت برپا ہوگی تو تمام نفوس، نفوسِ لوامہ بن جائیں گے اور اپنے آپ کو ملامت کریں گے۔ یہ مسلمہ اصول ہے کہ کسی چیز میں جس قدر مادیت اور ظلمت ہوگی وہ کمزور ہوگی۔اور دوسری چیز جسقدر لطیف ہوگی اسی قدر طاقتور ہوگی۔ دنیا مادی جہاں ہے یعنی (Physical World) یہ اینٹ اور پتھر والا جہاں کمزور ہے اس سے زیادہ لطیف جہان عالمِ مثال ہے۔ زمین میں جو چیز بھی نظر آتی ہے پہلے عالمِ مثال میں آ کر قائم ہوتی ہے پھر

یہاں آتی ہے۔عالمِ مثال، اس مادی اور ناسوتی جہاں سے بہت قوی ہے۔اس سے زیادہ طاقتور جہان عالمِ ملکوت ہے۔ جو ملائکہ اور ارواح کا جہاں ہے۔ اس سے زیادہ طاقتور عالمِ جبروت ہے جس کا تعلق اللہ تعالی کے اسما اور اس کی صفات سے ہے اور آخر میں عالمِ لاہوت ہے۔اس عالم تک کسی کی رسائی ممکن نہیں۔

مادہ اور توانائی

الغرض حکمائے الٰہی اس طریق پر سوچتے ہیں۔وہ بلندی سے نیچے کی طرف آتے ہیں۔سب سے بلند تر ایک ذات ہے جو وجود کی مالک ہے۔وجود سب چیزوں پر حاوی ہے۔اس کے بعد اس کے اسماء اور صفات کا درجہ ہے۔ان میں بڑی قوت ہے، پھر ملکوت کا درجہ ہے۔اس میں بڑی طاقت ہے۔پھر عالمِ مثال کا جہان ہے، یہ بھی بڑا طاقتور ہے۔اس کے بعد یہ مادیت کا جہان ہے۔یہاں پر وہ اور سائنسدان یعنی مادی حکما آ کر مل جاتے ہیں سائنسدان مادیت سے شروع کرتے ہیں، مادیت کو تلاش کرتے ہیں، عناصر وغیرہ کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر مختلف قسم کے انکشافات کرتے ہیں۔انہیں آہستہ آہستہ معلوم ہوتا ہے کہ مادے سے طاقتور کوئی چیز بھی موجود ہے۔اس طرح سائنس دان مختلف تجربات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مادہ کوئی چیز نہیں اصل چیز توانائی ہے۔یہ ایٹم بم توانائی پر ہی مبنی ہے۔ یہ کوئی بہت بڑا بم نہیں۔اس کے پھٹنے سے اس قدر توانائی خارج ہوتی ہے کہ دس بارہ میل تک کے علاقہ میں اس کے سامنے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔سب کو فنا کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ یہ صرف مادی توانائی کا ذکر ہے۔سائنسدان تو عالمِ مثال تک بھی نہیں پہنچ سکے۔حالانکہ حکمائے رَبّٰنِیین اوپر کے تمام جہانوں کے بارے میں مطالعہ رکھتے ہیں۔

بہر حال آسمانوں کو 'شِدَ اذً' اس لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ بہت طاقتور ہیں زمین کی نسبت وہ لطیف ہیں۔ جتنا کوئی جہان لطیف ہوگا، اتنا ہی طاقتور ہوگا۔جبرائیل امین علیہ السلام ایک لطیف

مخلوق ہے۔اس کی توانائی کا اندازہ مادی مخلوق نہیں کر سکتی۔اس میں اللہ تعالی میں اتنی قوت رکھی ہے کہ چاہے تو ایک پر کے ساتھ ساری دنیا کو ملیا میٹ کر دے۔یہ لطیف چیز ہے اس طرح آسمان بھی لطیف ہیں۔اس لیے انہیں 'شِدَادًا' یعنی طاقتور کہا گیا ہے۔

قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا۔پہلی پھونک پر تمام جانداروں پر موت طاری ہو جائے گی۔یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔یہ فنا کا صور ہوگا۔جب دوسری دفعہ صور پھونکا جائیگا تو تمام مردے زندہ ہو جائیں گے اور پھر ان کا محاسبہ ہوگا۔اس کی تفصیلات موجود ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ پہلے اور دوسرے صور کے درمیان چالیس کی مسافت ہوگی۔صحابہ نے پوچھا کہ چالیس سال؟ حضرت ابو ہریرہ نے کہا میں نہیں کہہ سکتا۔صحابہ نے پھر پوچھا کہ چالیس دن؟ انہوں نے کہا میں نہیں کہہ سکتا۔بہر حال دو صوروں کے درمیان چالیس دن یا چالیس سال کی مسافت ہوگی۔

امام ابنِ عربیؒ صاحبِ کشف بزرگوں میں سے ہیں ان کا بیان ہے کہ وہ صور اتنا بڑا ہے کہ ساتوں زمین اور ساتوں آسمان صور کے دہانے میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا: **اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا** بے شک دوزخ تاک میں ہے۔یعنی گنہگاروں، نافرمانوں اور خدا کی توحید اور قیامت کے منکرین کے انتظار میں ہے کہ وہ کب اس کا شکار بنتے ہیں **لِّلطّٰغِينَ مَاٰبًا** وہی سرکش لوگ جنہوں نے اطاعت کی بجائے معصیت کا راستہ اختیار کیا۔ظلم اور زیادتی کرتے رہے ان کا ٹھکانا یقیناً جہنم ہے۔جہنم اور اس کے فرشتے ایسے لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔

فرمایا اس قسم کے بد کردار لوگ '**لّٰبِثِينَ فِيهَآ**' ٹھہریں گے۔اس دوزخ میں احقابا قرن ہا قرن تک۔ '**اَحْقَابًا**'، حقب کی جمع ہے۔بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ایک حقب اسی (۸۰)

سال کے برابر ہے۔ حضرت علی سے حقب کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ حقب اسی (۸۰) سال کا ہوتا ہے۔ ایک سال بارہ مہینہ کا اور ایک مہینہ تیس دن کا۔ اور ایک دن موجودہ دنیا کے حساب سے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ اس لحاظ سے قیامت کا ایک حقب اس دنیا کے دو کروڑ چھیاسی لاکھ سال کے برابر ہے۔

وَکُل شَیءٍ اَحصَینہ، کِتبًا ہم نے ہر چیز کو کتاب میں شمار کر رکھا ہے۔ ازل سے لے کر ابد تک کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور لوحِ محفوظ، فرشتوں کے رجسٹروں اور انسانوں کے اعمال ناموں میں محفوظ ہے۔

لفظ تقوی کے متعلق حضرت عمرؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ کا مکالمہ موجود ہے۔ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا کہ تقوی کس کو کہتے ہیں تو حضرت ابی بن کعبؓ نے جواب میں کہا **اَمَّا سَلَکتَ طَرِیقًا ذَا شَوکٍ** کیا آپ کو کبھی ایسے راستے پر چلنے کا اتفاق نہیں ہوا جو خار دار ہو۔ جس پر کانٹے بچھے ہوئے ہوں۔ حضرت عمرؓ نے کہا بارہا ایسا ہوا ہے میں ایسے راستوں سے گزرا ہوں۔ حضرت ابی نے پھر پوچھا تو ایسے راستے پر آپ نے کیا کِیا۔ انہوں نے کہا **شَمَّرتُ وَاجتَهَدتُ** میں نے اپنے دامن کو سمیٹ لیا اور بڑی احتیاط کے ساتھ وہاں سے گزرا کہ کہیں میرے کپڑے کانٹوں میں الجھ نہ جائیں۔ تو ابی بن کعب کہنے لگے **فَذٰلِكَ التَّقوٰی** یعنی تقوی اسی کیفیت کا نام ہے۔ اس دنیا میں فسق و فجور اور طرح طرح کی برائیوں کے کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ ان برائیوں سے بچ کر نکل جانا ہی تقوی ہے۔ حضورﷺ کا ارشاد مبارک ہے **حُفَّتِ الجَنَّةُ بِالمَکَارِہِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهوٰتِ** یعنی جنت کو مشکلات کی باڑ کے ساتھ گھیر لیا گیا ہے اور دوزخ کو شہوات کی باڑ سے جو شخص ان شہوات سے بچ کر نکل گیا، وہی متقی ہے اور جو ان شہوات کی باڑ میں الجھ گیا وہ پھنس گیا۔

ترمذی شریف کی روایت میں حضورﷺ کا فرمان ہے کہ جنت کی عورت کے دوپٹہ کی قیمت ساری

دنیا اور مافیہا ادا نہیں کر سکتے۔ حضور ﷺ نے فرمایا جنت میں سو درجے ہیں اور ہر درجے کا دوسرے سے فاصلہ اس قدر ہے، جتنا زمین سے آسمان کا۔ تو گویا **جَزَآءً مِّن رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا** جنتیوں کو اپنے رب کی طرف سے انعامات ملیں گے، درجات حاصل ہوں گے جو ان کے اعمال کے مطابق ہوں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی حکمت اور فلسفے میں روح سے مراد روحِ انسانی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ روحِ انسانی بھی حاضر ہوگی۔ اس کو روحِ اعظم بھی کہا جاتا ہے۔ بعض احادیث میں اس روح کے بارے میں آتا ہے کہ اس کی ہزار زبانیں ہیں۔ شاہ صاحب کی حکمت میں بتلایا جاتا ہے کہ یہ روح اعظم عرشِ الٰہی کے نیچے موجود ہے۔ روحِ اعظم اور اس کا معنی یہ ہے کہ انسانوں کی جتنی روحیں ہیں وہ اس روحِ اعظم کا عکس ہیں۔ ہر روحِ انسانی کا تعلق روحِ اعظم کے واسطہ سے تجلی اعظم کے ساتھ ہوتا ہے۔ عرشِ عظیم پر جو تجلی اعظم پڑتی ہے۔ اس سے سارا عرش رنگین ہو جاتا ہے۔ اس کا اثر کائنات پر پڑتا ہے تو اس طرح ہر انسان کا تعلق تجلی اعظم کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ جانوروں کو بھی انصاف دلائیں گے۔ جس جانور نے دنیا میں کسی دوسرے جانور پر زیادتی کی ہوگی اسے اس کا بدلہ دلایا جائے گا اور پھر ان کو فنا کر دیا جائے گا۔ جانوروں کی پیدائش کا مقصد دنیا میں انسانوں کی خدمت گزاری ہے قیامت کے بعد ان کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

سورۃ النبا تفسیرِ مظہری سے صفحہ نمبر (۱۷۵)

تفسیرِ مظہری میں سورۃ النبا کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ تمام عالمِ انسان صور پھونکتے ہی تم قبروں سے نکل کر جماعت در جماعت ہو کر حساب کے مقام پر آئیں گے۔ حضرت ابوذر نے فرمایا ہم سے سچے نبی ﷺ نے سچ فرمایا کہ قیامت کے دن حشر کے موقعہ پر لوگوں کے تین گروہ ہوں گے ایک گروہ ان لوگوں کا ہوگا جو کھانے سے سیر لباس پوش اور سواریوں پر سوار ہوں گے دوسرا گروہ

پیادہ دوڑتا ہوگا۔ تیسرے گروہ کو منہ کے بل گھسیٹ کر لایا جائے گا۔ نسائی۔ حاکم۔ بیہقی۔

خطیب نے (السراج المنیر میں) ان الفاظ کے ساتھ حدیث کو نقل کیا ہے میری امت کی دس اضاف کا حشر دس گروہوں کی صورت میں ہوگا بعض کی صورت بندروں کی ہوں گی یہ چغل خور ہوں گے بعض سوروں کی شکل پر ہوں گے یہ حرام خور ہوں گے بعص سرنگوں ہوں گے ٹانگیں اوپر چہرے اور آنکھیں نیچے ان کو اسی طرح گھسیٹا جائے گا یہ سود خور ہوں گے کچھ لوگ نابینا ہوں گے ادھر ادھر سرگرداں ہوں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جو فیصلہ میں ظلم کرتے تھے بعض گونگے بہرے اور بے عقل ہوں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنے اعمال پر مغرور تھے بعض لوگوں کی زبانیں سینہ پر لٹکی ہوں گی اور ان کے منہ سے لہو پیپ بہتا ہوگا جس سے مجمع میں تعفن پیدا ہوگا۔ یہ وہ علما اور واعظ ہوں گے جن کا کردار گفتار کے خلاف تھا بعض لوگوں کے ہاتھ پاں کٹے ہوں گے یہ پڑوسیوں کو دکھ دینے والے لوگ ہوں گے بعض لوگوں کو آتشی تختوں پر صلیب دی گئی ہوگی یہ وہ لوگ ہوں گے جو حاکم سے جاکر لوگوں کی چغلیاں کھاتے تھے۔ بعض لوگوں کی بدبو مردار سے زیادہ سڑی ہوئی ہو گی یہ وہ لوگ ہوں گے جو نفسانی خواہشات اور لذات میں مزے اڑاتے تھے اور اللہ کے مالی حق کو اپنے مالوں کے ساتھ روکے رکھتے تھے (زکو عشر و غیرہ ادا نہیں کرتے تھے) بعض لوگوں کو تارکول کی لمبی چادریں پہنائی جائیں گی یہ رعونت فخر اور غرور کرنے والے ہوں گے۔

قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے (صرف ایک) ایک آنکڑے سے قبائل مضر و ربیعہ سے بھی زیادہ لوگ پکڑ لئے جائیں گے اور ملائکہ اس کے کنارہ پر کھڑے کہتے ہوں گے الٰہی بچا، الٰہی بچا۔ بیہقیؒ نے عبید بن عمیر کی روایت سے بیان کیا کہ صراط تلوار کی دھار کی طرح (باریک اور تیز) ہوگی اور پھسلواں لغزش گاہ ہوگی ملائکہ اور انبیا کھڑے کہہ رہے ہوں گے الٰہی بچا، الٰہی بچا اور کچھ فرشتے کافروں کو آنکڑوں سے پکڑ رہے ہوں گے۔ بیہقی نے بروایت مقسم حضرت ابنِ عباس کا قول نقل کیا ہے کہ جہنم کے پل پر سات جگہ لوگوں کو روکا جائے گا پہلی جگہ بندہ سے

لاالہ الااللہ کی شہادت پوچھی جائے گی اگر اس نے شہادت پوری دی ہوگی تو دوسرے مقام تک گزر جائے گا وہاں اس سے نماز کی باز پرس ہوگی اگر اس نے نماز بھی ٹھیک ادا کی ہوگی تو تیسرے مقام تک گزر جائے گا وہاں زکوۃ کی پرسش ہوگی اگر زکوۃ بھی پوری دی ہوگی تو چوتھے مقام تک گزر جائے گا وہاں روزہ کے متعلق پوچھ گچھ ہوگی اگر روزے ٹھیک ادا کئے ہوں گے تو پانچویں مقام تک چلا جائے گا وہاں حج کے متعلق سوال کیا جائے گا اور اگر ٹھیک طور پر حج ادا کیا ہوگا تو چھٹے مقام تک چلا جائے گا وہاں عمرہ پوچھا جائے گا اگر یہ بھی کر چکا ہوگا تو ساتویں مقام تک پہنچ جائے گا۔ وہاں بندوں کے حقوق کے متعلق دریافت کیا جائے اگر اس مقام سے بھی نکل گیا تو خیر ورنہ کہا جائے گا دیکھو اس کے پاس کچھ نوافل ہیں۔ نوافل سے اس کے فرض اعمال کو پورا کر دیا جائے گا اور سب امور سے فارغ ہو جائے گا تو اس کو جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔

سورۃ النّٰزِعٰت

اس سورۃ کا نام سورۃ نازعات ہے۔ یہ دو رکوع اور چھیالیس آیتوں پر مشتمل ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

سورۃ النزِعت کا موضوع: اس سورۃ کی ابتدا میں خدا نے نازعات کی قسم کھائی ہے اسی مناسبت سے اس کا نام نازعات رکھا گیا ہے۔ نازعات سے مراد جان لینے والے فرشتے ہیں۔ سورۃ نازعات میں قیامت اور اس کے ہولناک مناظر نیز اس دن نیکوکاروں اور بدکاروں کے انجام سے متعلق گفتگو ہوئی ہے۔ سورۃ نازعات میں دحوالارض (زمین کے پھیلاؤ) کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ جس جگہ سے زمین کا پھیلا شروع ہوا وہ مکہ یا کعبہ تھا۔

سورۃ النزِعت تفسیرِ معالمِ العِرفان سے (صفحہ نمبر ۶۴)

معالمِ العِرفان میں سورۃ النزِعت کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین میں قائم کر کے فیصلے کا ایک دن مقرر کیا ہے اور یہ بات بڑے ہی آسان طریقے سے سمجھائی گئی

ہے۔امام شاہ ولی اللہؒ کی تفسیر کے مطابق تخلیقِ کائنات اللہ تعالیٰ کی چار صفات پر مبنی ہے۔ پہلی صفت ابداع ہے جو سب سے مقدم ہوتی ہے۔اس سے مراد کسی چیز کو بغیر کسی مادے کے پیدا کرنا ہے۔جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی صفت 'بدیع السّمٰوٰتِ والارضِ' یعنی زمین وآسمان کا پیدا کرنے والا بھی ہے۔اس کا ہم معنی دوسرا لفظ 'فاطِر' بھی استعمال کیا گیا ہے۔خدا تعالیٰ اس لحاظ سے بھی بدیع ہے کہ وہ کسی بھی چیز کو بغیر کسی مادے یا آلے کے پیدا فرما دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی صفات اور تجلیات میں کشش پیدا ہوئی اور کائنات کو باہر نکال لیا۔یہاں بھی کشش کا قانون کام کر رہا ہے۔ابداع کو سمجھنا آسان نہیں کیونکہ اس کی مثال اس عالمِ شہادت میں موجود نہیں۔ایسے معاملات کو سمجھنے میں سخت دشواری پیش آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت خلق ہے۔اس سے مراد کسی چیز کو کسی مادے سے پیدا کرنا ہے جیسے 'کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَه مِن تُرَابٍ' آدم کو مٹی کے مادے سے پیدا فرمایا۔پہلے فرمایا تھا کہ زمین وآسمان کو بغیر کسی مادے کے پیدا فرمایا۔اب جب کہ مادہ پیدا ہو گیا تو اس سے آدم پیدا کیا۔اسی طرح جنات کو آگ سے پیدا فرمایا۔اور بعض دوسری چیزوں کو دوسرے مواد سے پیدا کیا۔یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق کا ظہور ہے جیسے فرمایا 'خَلَقَ کُلَّ شَیءٍ' ہر چیز کو پیدا کیا۔کسی چیز کی تخلیق کیلیے پہلے صفت ابداع آتی ہے اور اس کے بعد صفت خلق کا نمبر ہے۔

تخلیق کے سلسلے میں تیسری صفت، صفت تدبیر ہے۔اس کا معنی آگے پیچھے کرنا، موت وحیات طاری کرنا، عروج وزوال لانا ہے۔اسی کو تدبیر کہتے ہیں یہ صفت خلق کے بعد آئے گی، پہلے نہیں آئے گی۔

شاہؒ صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی چوتھی صفت تدلی ہے۔نوعِ انسانی کے ہر فرد کے قلب پر تجلی الٰہی پڑتی ہے۔خواہ وہ خضیف ہی کیوں نہ ہو اس کو تدلی کہا جاتا ہے جیسے فرمایا 'ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی' قیامت کے روز جب یہ راز کھلیں گے، تو تجلی سخت کام کرے گی۔اس کی کشش ادھر عالم بالا کی

طرف ہوگی۔ اور انسان کی برائی نے چونکہ اسے مادیت میں ڈبو دیا ہے لہذا وہ نیچے جانے کی کوشش کریگی، اور اس تگ ودو میں انسان کو سخت تکلیف پہنچے گی۔

ان تمام صفات کو بروئے کار لانے میں اسی ترتیب کے لحاظ سے قوت صرف ہوگی۔ پہلی صفت ابداع میں سب سے زیادہ قوت صرف ہوگی اور دوسری صفت خلق میں اس سے کم اسی طرح صفت تدبیر اس سے کم اور تدلی میں اس سے کم طاقت لگے گی۔ یہاں بھی قانون، جذب وکشش کام کر رہا ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے۔ **يَوۡمَ لَا يَنۡفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوۡنَ اِلَّا مَنۡ اَتَى اللّٰهَ بِقَلۡبٍ سَلِيۡمٍ ؕ** ۔ قیامت کے دن کسی کا مال واولاد کام نہیں آئے گا البتہ فائدہ اس کو حاصل ہوگا جو قلبِ سلیم لے کر اللہ کی بارگاہ میں پہنچا۔ بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ قلبِ سلیم کا حامل وہ شخص ہے جو کفر وشرک اور بدعات سے پاک ہوگا جس کا دل ہر قسم کی برائیوں اور بداخلاقیوں سے مبرا ہوگا۔

اللہ تعالی نے حضور ﷺ کے متعلق بھی ارشاد فرمایا **اِنَّكَ لَتَهۡدِىۡۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ؕ** ۔ بلاشبہ آپ صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کر رہے ہیں وہی صراطِ مستقیم جس پر چل کر آدمی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

انسان مضبوط ترین مخلوق ہے

ترمذی کی حدیث شریف میں آتا ہے کہ زمین میں اضطراب کی کیفیت پیدا ہوئی تو اللہ تعالی نے اس پر پہاڑ قائم کر دیے۔ فرشتوں نے متعجب ہو کر عرض کیا اے مولا کریم ! تیری مخلوق میں پہاڑوں سے سخت چیز بھی کوئی ہے۔ عربوں کے نزدیک پہاڑ مضبوط ترین چیز تصور کیے جاتے تھے۔ اسی لیے وہ کہا کرتے تھے کہ انسان کو اپنے عقیدے میں پہاڑ جیسا مضبوط ہونا چاہیے، اسی طرح انسان کا عہد وپیمان بھی مضبوط ہونا چاہئے۔ فرستوں کے سوال کے جواب میں اللہ تعالی نے فرمایا کہ پہاڑوں سے مضبوط چیز لوہا ہے جو پہاڑ کو بھی کاٹ دیتا ہے۔ فرشتوں نے پھر عرض کیا

یا اللہ! کیا لوہے سے مضبوط بھی کوئی مخلوق موجود ہے۔ تو اللہ تعالی نے جواب دیا لوہے سے سخت چیز آگ ہے جو لوہے کو بھی پگھلا دیتی ہے۔ فرشتوں نے پھر سوال کیا کہ آگ سے سخت چیز بھی تیری مخلوق میں ہے تو اللہ نے جواب دیا ہاں آگ سے سخت چیز پانی ہے جو آگ کو بجھا دیتا ہے۔ فرشتوں نے پھر پوچھا کہ کیا پانی سے سخت چیز بھی کوئی ہے تو اللہ تعالی نے فرمایا پانی سے سخت ہوا ہے۔ جب ہوا کے طوفان چلتے ہیں تو پانی کو بھی اڑا کر لے جاتے ہیں۔ فرشتوں نے پھر عرض کیا کہ اے مالک الملک ! کیا ہوا سے سخت مخلوق بھی ہے تو اللہ تعالی نے فرمایا انسان ہے اور پھر انسان میں مومن ہے جو دائیں ہاتھ سے صدقہ کرتا ہے مگر بائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی۔ یہ اس کی مضبوطی کی نشانی ہے۔ یہ انسان کے ایمان کا کمال ہے کہ اللہ کی راہ میں اس طرح پوشیدہ طور پر خرچ کرتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالی نے عقل کو پیدا کیا تو فرمایا آگے آ پیچھے ہٹ عقل نے حکم کی تعمیل کی تو اللہ جل شانہ نے فرمایا میں تیری وجہ سے ہی مواخذہ کروں گا اور تیری وجہ سے روکوں گا۔ چنانچہ قانون کی پابندی عقل کے ساتھ وابستہ ہے۔ عقل ہی کو اللہ تعالی نے جوہرِ کمال قرار دیا ہے اور یہی چیز انسان کو مکلّف بناتی ہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ قرآن میں جہاں فرقان کا لفظ آیا ہے اس سے مراد جوہرِ عقل ہے۔

'وَنَهَى النَّفسَ عَنِ الهَوٰى' یعنی عقل مند وہ شخص ہے جس نے اپنے نفس کو خواہشات سے روکے رکھا تو گویا خواہشات انسانی کو عقل کے تابع رکھنا انسان کا درجہ کمال ہے۔

عبداللہ بن عباس کی روایت اور دیگر روایتوں میں آتا ہے کہ زمین و آسمان کے درمیان انسان کا سب سے بڑا دشمن خواہش ہے اسی کی وجہ سے انسان گمراہ ہوتا ہے۔ ایمان و ہدایت سے محروم ہو جاتا ہے۔ تمام لوگ بچے ہیں سوائے اس کے کوئی بالغ نہیں جو خواہشات سے بچا ہوا ہے۔

سورۃ النزِعت تفسیرِ مظہری سے (صفحہ نمبر ۱۸۹)

تفسیرِ مظہری میں سورۃ النزعت کی یوں تفسیر کی گئی ہے کہ مومن دنیوی مصائب میں گویا بندھا ہوا قیدی ہوتا ہے ملائکہ اس بندش سے اس کو رہا کرتے اور آسانی سے اس کی گرہ کھول دیتے ہیں جیسے اونٹ کا زانو بند کھول دیا جاتا ہے (اور اونٹ آزاد ہو جاتا ہے) حدیث میں مومنوں کی روح کے متعلق آتا ہے کہ گویا انکا زانوں بند کھول دیا گیا اور ان کو رہا کر دیا گیا۔ حضرت براابن عازبؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب مومن دنیا سے انقطاع اور آخرت کی طرف توجہ کی حالت میں ہوتا ہے تو آفتاب جیسے گورے چہروں والے ملائکہ جنتی کفن اور بہشتی خوشبو لے کر آتے ہیں اور حد نظر کے فاصلہ پر بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آکر اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے اے نفس مطمئنہ اللہ کی مغفرت اور خوشنودی کی طرف نکل کر چل فوراً جان اس طرح بہہ کر باہر آجاتی ہے جیسے مشکیزہ سے پانی کا قطرہ ملک الموت اس کو لے لیتا ہے مگر وہ ملائکہ لمحہ بھر نفس کو ملک الموت کے پاس نہیں چھوڑتے اور خود اپنے قبضہ میں لے کر جنتی کفن اور بہشتی خوشبو میں رکھ دیتے ہیں اور اس سے پاکیزہ ترین مشک کی خوشبو نکلتی ہے۔ الحدیث۔ اور کافر بندہ جب دنیا سے قطع تعلق کی حالت میں ہوتا ہے تو آسمان سے سیاہ رو ملائکہ ٹاٹ لے کر اس کے پاس آتے ہیں اور بقدر حد نظر بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آکر اس کے سرہانے بیٹھ کر کہتا ہے اۓ نفس خبیث اللہ کے غضب کی طرف نکل کر چل جان بدن کے اندر ڈرتی پھرتی ہے مگر ملک الموت اس کو اس طرح کھینچ کر نکالتا ہے جیسے خاردار تار تر اون سے کھینچ کر نکالا جاتا ہے آخر اس کو پکڑ لیتا ہے اس کے بعد وہ ملائکہ اس کو لمحہ بھر تاخیر کئے بغیر لے لیتے ہیں اور ٹاٹ میں لپیٹ دیتے ہیں اور اس سے مردار کی بو کی طرح بدبو نکلتی ہے۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ ملک الموت کافر کی جان کو رگوں سمیت کھینچتا ہے۔ رداہ احمد۔

صوفیہ کہتے ہیں کہ ارواح کے سامنے نفوس کو اللہ نے اپنے کمال قدرت سے اس طرح قائم کیا ہے

جیسے سورج کے سامنے آئینہ جس طرح آئینہ سورج کی کرنوں سے بھر جاتا ہے اور جگمگا جاتا ہے اسی طرح روح کا فیضان نفس پر ہوتا ہے یا نفس چاند کی طرح اور روح سورج کی طرح ہے اور فلاسفہ کا قول ہے کہ چودھویں کا چاند سورج کی روشنی سے بھرپور روشن ہوتا ہے پس بدن کی زندگی تو نفس کی وجہ سے ہے اور نفس کی زندگی روح کی وجہ سے اور روح میعاد مقرر پر نفس کو بدن سے کھینچ لیا جاتا ہے لیکن روح مجرد کا تعلق منقطع نہیں ہوتا نفس کے کھینچ جانے سے روح نہیں کھینچتی۔

اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ نفس کو بدن سے کھینچا جاتا ہے اور کفن وحنوط (ایک خاص خوشبو) میں رکھ کر اوپر چڑھایا جاتا ہے اور نفس مومن کیلئے ساتویں آسماں تک سب آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں پھر اللہ فرماتا ہے میرے بندے کے اعمالنامے کو علیین میں لکھ دو اور اس کو زمین کی طرف لوٹا دو کیونکہ زمین سے ہی میں نے ان کو پیدا کیا ہے اور اسی کی طرف لوٹاں گا اور اسی سے دوبارہ برآمد کروں گا۔ کافر کیلئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے بلکہ اس کی روح کو زمین پر پھینک دیا جاتا ہے۔ بعض احادیث سے ثابت ہے کہ ایک آسمان دوسرے آسمان سے پانچ سو برس کی راہ کے فاصلہ پر ہے۔

سورۃ النّٰزِعٰت تفاسیر صِراط الجِنان فی تفسِیر القرآن (صفحہ نمبر ۵۶۱)

صراط الجنان فی تفسیر القرآن میں ہے کہ قیامت کے دن کافروں کو دوبارہ ضرور زندہ کیا جائے گا اس کے متعلق سورۃ النّٰزِعٰت میں ہے:

وَّالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ۔ فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا ۔ فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا۔

ترجمہ کنزالایمان: اور آسانی سے تیریں۔ پھر آگے بڑھ کر جلد پہنچیں۔ پھر کام کی تدبیر کریں کہ کافروں پر ضرور عذاب ہوگا۔

ترجمہ کنزالعِرفان: اور آسانی سے تیرنے والوں کی۔ پھر آگے بڑھنے والوں کی۔ پھر کائنات کا نظام چلانے والوں کی (اے کافرو! تم پر قیامت ضرور آئے گی)۔

ہر کام وسیلے کے ذریعے ہونا اللہ تعالیٰ کا قانون ہے۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت تو یہ ہے کہ ہر چھوٹا بڑا کام کسی وسیلے کے بغیر خود اسی کے حکم سے ہو جائے لیکن قانون یہ ہے کہ کام وسیلے کے ذریعے ہو کیونکہ دنیا کا ہر کام کائنات کا نظام چلانے پر مقرر فرشتوں کے سپرد ہے۔ آیت سے بھی معلوم ہوا کہ بعض نام اللہ تعالیٰ اور مخلوق کے درمیان مشترک ہیں، جیسے علی، سمیع، بصیر، انہیں میں سے **مُدَبِّر** بھی ہے کہ **رَب عَزَّ وَجَلَّ** بھی تدبیر فرمانے والا ہے اور فرشتے بھی **مُدَبِّراتِ اَمر** یعنی کاموں کی تدبیر کرنے والے ہیں۔

سورۃ النّزِعٰت تفسیرِ ضیاء القرآن (صفحہ نمبر ۴۷۹)

سختی سے کسی چیز کے کھینچنے کو نزع کہا جاتا ہے۔ کیونکہ جب موت آتی ہے تو کافر کی روح جسم سے نکلنے سے انکار کر دیتی ہے۔ فرشتے اس کے رگ و ریشہ میں گھس کر اس کو باہر کھینچ لاتے ہیں۔

کسی چیز کو نرمی اور آسانی سے باہر نکالنے کو عربی میں نشط کہتے ہیں جیسے کنوئیں سے پانی کا ڈول نکالا جاتا ہے۔ اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو مومن کی روح کو قبض کرنے آتے ہیں۔ وہ روح پہلے ہی محبوبِ حقیقی کے وصال کیلئے بے تاب ہوتی ہے۔

سَبَح کا معنی ہے پانی میں تیرنا، تیز رفتار گھوڑے کو بھی **فرسٌ سابحٌ** کہتے ہیں۔ اس مراد وہ فرشتے ہیں جو ان روحوں کو لے کر فضائے عالم میں تیرتے ہوئے بڑی برق رفتاری سے بارگاہِ ربانی میں پیش کرتے ہیں۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ثابت سے منقول ہے کہ امورِ دنیا کی تدبیر چار ملائکہ کے سپرد ہے۔ جبرائیل، میکائیل، عزرائیل اور اسرافیل۔ ہواؤں اور خدائی لشکروں کا انتظام جبرائیل کے ذمہ ہے۔ بارشوں اور کھیتی باڑی کے کام میکائیل کے سپرد ہیں۔ بحر و بر میں روحوں کو قبض کرنا عزرائیل کی ذمہ داری ہے اور اسرافیل تمام احکام ان تک پہنچاتے ہیں۔

سورۃ عبس

اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ عبس ہے۔اس میں ایک رکوع اور بیالیس آیتیں ہیں۔یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

سورۃ عبس کا موضوع تفسیرِ معالم العِرفان سے (صفحہ نمبر ۱۰۵) : اس سورۃ میں قیامت کا ذکر انسانی جماعت اور انسان کے خویش واقربا کو مدِ نظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ جب قیامت کی چیخ سنائی دے گی تو انسان اپنی نجات کے لیے اس قدر متفکر ہوگا کہ کسی قریبی رشتہ دار کی طرف توجہ نہیں کر سکے گا۔اس دن ہر شخص اپنی نجات کے لیے چیخے گا چلائے گا تو یہاں گویا اپنے خویش واقربا یا جماعت کے اعتبار سے قیامت کا مسئلہ سمجھایا گیا ہے۔

سورۃ عبس تفسیرِ معالم العِرفان سے (صفحہ نمبر ۱۰۴)

اس میں انسان کی ظاہری اور باطنی کیفیت کو یوں بیان کیا کہ اس کا منشا یہ ہے کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔پہلی قسم وہ ہے جو بظاہر مہذب، شائستہ، دانا، خوشحال، عاقل اور تمیز والے ہوتے ہیں مگر وہ غور و فکر کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔گویا باطنی طور پر وہ نادان اور بیوقوف ہوتے ہیں۔لوگوں کی دوسری قسم وہ ہے جس میں ظاہری طور پر لوگ بالکل کچھ نہیں ہوتے، عام معمولی خوبصورتی سے بھی محروم ہوتے ہیں جیسے نابینا ہونا، مال واسباب کا فقدان ہونا، مگر باطنی طور پر یہ لوگ غور و فکر کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔علت و معلول کو سمجھتے ہیں۔سبب اور مسبب کو سمجھتے ہیں (Cause and Fact) کو جانتے ہیں۔ان میں نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے گویا انکا باطن روشن ہوتا ہے۔

قرآن پاک چاہتا ہے کہ کافر و مشرک جو خطرناک بیماری میں مبتلا ہے۔اس کی بجائے اس شخص پر توجہ دی جائے جو حق کا متلاشی ہے۔اس کی مثال ایسے ہے کہ کسی ڈاکٹر کے پاس دو مریض آتے ہیں ایک ہیضے جیسی خطرناک بیماری کا مریض ہے جب کہ دوسرا نزلہ زکام میں مبتلا ہے۔ایسی

صورت میں عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ ڈاکٹر ہیضے کے مریض کی طرف فوری توجہ سے اور زکام والے کو مؤخر کردے مگر یہاں پر اللہ تعالیٰ نے یہ اصول بیان فرمایا کہ ہیضے کا مریض اگرچہ مہلک بیماری میں مبتلا ہے مگر وہ علاج کا طالب نہیں برخلاف اس کے زکام جیسی معمولی بیماری کا مریض علاج کا طالب ہے لہذا پہلے اس کی طرف توجہ کی جائے گی۔

اسلام لانے کیلیے بہت زیادہ حریص ہونا بھی کوئی ضروری نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس بات سے روک دیا اور فرمایا کہ اپنا فرض پورا کرو **وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ** آپ سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ لوگ جہنم میں کیوں گئے بلکہ یہ تو دوزخیوں سے سوال ہوگا **مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ** تم جہنم میں کس وجہ سے آئے۔ اس کی جواب دہی انہیں خود کرنی ہوگی۔

عالمِ دین نے فرمایا کہ انسان کیلیے مٹی یا زمین بمنزلہ حقیقی ماں کے ہے۔ اور آگ کا کام صرف کھانا پکانا ہے اور یہ ہر چیز کو جلا کر رکھ دیتی ہے چونکہ روح بمنزلہ باپ کے ہے اس لیے جب یہ جسم سے جدا ہونے لگتی ہے تو اسے مردہ (جسم) کو زمین یعنی حقیقی ماں کے سپرد کرنا چاہیئے یا آگ کے جو صرف کھانا پکاتی ہے، بلکہ جلا ڈالتی ہے تو اس طرح اس برہمن کو یہ ماننا پڑا کہ مسلمانوں کا دفن کرنے کا طریقہ ہی بہتر ہے۔

سورۃ عبس تفسیرِ مظہری سے (صفحہ نمبر ۲۰۱)

تفسیرِ مظہری میں سورۃ عبس کو یوں بیان کیا گیا:

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ موت دارالقرار تک پہنچانے والی ہے اس لئے امانت کا شمار نعمتوں میں کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا موت مومن کے لئے تحفہ ہے۔ **اَقْبَرَہٗ** کا معنی یہ ہے کہ جنازہ کو درندوں سے محفوظ رکھنے کیلئے اللہ نے لوگوں کو حکم دیا کہ میت کو قبر میں دفن کریں۔ **اقبر** قبر میں داخل کرایا قبر میں داخل کرنے کا حکم دیا۔ قبر میں دفن کرنے کا حکم اللہ کی مزید نعمت ہے کہ اللہ نے انسان کو اتنی عزت عطا فرمائی کہ اس کی لاش کو دوسرے جانوروں کی لاشوں کی طرح پھینکنے کا حکم نہیں دیا۔

فَاَنبتنَا فِیهَا حبا پھر ہم نے زمین میں اگائے دانے گیہوں جو وغیرہ۔

وَ عِنَباً وَّقَضبًا اور انگور اور ساگ **قَضبٌ** اصل میں مصدر ہے کاٹنا **قضبه** اس کو کاٹ دیا۔ ساگ بھی بار بار کاٹا جاتا ہے اس لئے اس کو قضب کہا جاتا ہے صحاح جوہری میں ہے کہ قضب کا استعمال سبزی میں ہوتا ہے قاموس میں ہے قضب وہ درخت ہے جس کی شاخیں لمبی اور پھیلی ہوئی ہوں کوئی درخت ہو۔

یَومَ یَفِرُّ المَرءُ مِن اَخِیهِ وَاُمِّه وَاَبِیهِ وَصَاحِبَتِه وَبنِیهِ ۔ جس روز آدمی اپنے بھائی، ماں باپ، بیوی اور لڑکوں سے بھاگے گا۔ یا تو بھاگنے کی یہ وجہ ہوگی کہ اس کو خود ہی اپنی پڑی ہوگی اور اس کو معلوم ہوگا کہ ان اقربا میں سے کوئی میرے کام آنے والا نہیں یا اقربا کے کفر اور ان کی بدحالی کی وجہ سے ہر شخص کو اپنے اقربا سے نفرت اور عداوت ہو جائے گی۔

حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے اپنے دو بچوں کی کیفیت رسول اللہ ﷺ سے دریافت کی جن کا انتقال اسلام سے پہلے ہو گیا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا وہ دونوں دوزخ میں ہوں گے (حضرت خدیجہؓ کو یہ سن کر کچھ ناگواری ہوئی) حضور ﷺ نے ان کے چہرہ پر ناگواری کا اثر دیکھ کر فرمایا اگر تم ان کے مقام کو دیکھ لو تو تم کو بھی ان سے نفرت ہو جائے گی۔

لوگوں میں سے ہر شخص کا حال اس روز ایسا ہوگا کہ دوسرے کے حال سے اس کو لاپرواہ بنا دے گا۔

ام المومنین حضرت سودہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ لوگوں کو برہنہ پا ننگے بدن بے ختنہ اٹھائے گا لوگوں کے منہ پر پسینہ کی لگام ہوگی اور کانوں کی لو تک پسینہ پہنچا ہوگا یعنی قدم سے لے کر منہ اور کانوں کی جڑوں تک آدمی پسینہ میں غرق ہوگا۔ حضرت سودہ کہتی ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ پردہ کے اعضا ایک دوسرے کے دیکھے گا۔ فرمایا لوگوں کو اس کا ہوش ہی نہیں ہوگا۔ ہر شخص کا حال اس روز ایسا ہوگا کہ اس کو دوسروں سے لاپرواہ کر دے گا۔ اس حدیث کو طبرانی بیہقی اور بغوی نے نقل کیا ہے۔

سورۃ عبس تفاسیر صراط الجنان فی تفسیر القرآن سے (صفحہ نمبر ۵۳۴)

اس میں اللہ تعالی کی وحدانیت، حضور ﷺ کی رسالت اور اخلاقیات کی اعلی تعلیم دی گئی ہے کہ لوگوں کے درمیان ان کے بنیادی حقوق میں مساوات رکھی جائے۔ قرآنِ مجید کی آیات تمام مخلوق کے لئے نصیحت ہیں اور جو چاہے ان سے نصیحت حاصل کرے اور جو چاہے ان سے اعراض کرے۔ اس سے متعلق فرمایا گیا:

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ۔ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ۔ فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ۔ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ۔ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ۔ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ۔

ترجمہ کنزالایمان: یوں نہیں یہ تو سمجھانا ہے تو جو چاہے اسے یاد کرے ان صحیفوں میں کہ عزت والے ہیں بلندی والے پاکی والے ایسوں کے ہاتھ لکھے ہوئے جو کرم والے نیکی والے۔

ترجمہ کنزالعرفان: ایسے نہیں، بیشک یہ باتیں نصیحت ہیں۔ تو جو چاہے اسے یاد کرے۔ ان عزت والے صحیفوں میں۔ جو بلندی والے پاکی والے ہیں۔ ان لکھنے والوں کے ہاتھوں سے (لکھے ہوئے)۔ جو معزز نیکی والے ہیں۔

اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ: (بیشک یہ باتیں نصیحت ہیں)۔ اس آیت اور اس کے بعد والی 5 آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ بے شک قرآن کی آیات مخلوق کے لئے نصیحت ہیں تو بندوں نے جو چاہے ان آیات کو یاد کر کے ان سے نصیحت حاصل کرے اور ان کے تقاضوں کے مطابق عمل کرے اور جو چاہے ان سے اِعراض کرے اور یہ آیات ان صحیفوں میں لکھی ہوئی ہیں جو اللہ تعالی کے نزدیک عزت والے، بلند قدر والے اور پاکی والے ہیں کہ انہیں پاکوں کے سوا کوئی نہیں چھوتا اور یہ صحیفے ان لکھنے والوں کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے ہیں جو کرم والے، نیکی والے اور اللہ تعالی کے فرمانبردار ہیں اور وہ فرشتے ہیں جو ان کو لوحِ محفوظ سے نقل کرتے ہیں۔

قرآنِ کریم کی عظمت

اس سے معلوم ہوا ہے کہ جن کاغذوں پر قرآن لکھا جائے، جن قلموں سے لکھا جائے اور جو لوگ لکھیں سب حرمت والے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ قرآنِ پاک کو سب سے اونچا رکھا جائے، ادھر پاؤں یا پیٹھ نہ کی جائے اور ناپاک آدمی اسے نہ چھوئے اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ قرآنِ پاک کو حفظ کرنا چاہیئے، اس کی فضیلت کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے، رسولِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس شخص کی مثال جو قرآن کریم کو پڑھتا ہے یہاں تک کہ اسے ذہن نشین کر لیتا ہے تو وہ بزرگ فرشتوں کے ساتھ ہوگا اور اس شخص کی مثال جو قرآنِ پاک کو پڑھے اور اسے ذہن نشین کرتے ہوئے بڑی دشواری کا سامنا ہو تو اس کے لئے دگنا ثواب ہے۔

سورۃ التکویر

اس سورۃ کا نام سورۃ التکویر ہے تکویر کے معنی ہے لپیٹنا۔اس میں ایک رکوع اور انتیس آیتیں ہیں۔یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

سورۃ التکویر کا موضوع تفسیرِ ضیاء القرآن سے (صفحہ نمبر ۴۹۸) قیامت اور رسالت کے بارے میں ہی یہاں دلائل وشواہد ذکر فرمائے جارہے ہیں۔قیامت کے دو مرحلے ہیں۔پہلا مرحلہ وہ ہے جب یہ موجودہ نظامِ کائنات درہم برہم کر دیا جائے گا۔دوسری طرف جنت اپنی تمام زینت اور آرائش کے ساتھ بندگانِ خدا کیلیے چشم براہ ہوگی۔

سورۃ التکویر تفسیرِ معالم العرفان سے (صفحہ نمبر ۱۳۲)

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے **مَنْ سَرَّهُ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ كَاَنَّهٗ رَأْىَ عَيْنٍ**۔ جو شخص قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے اسے چاہیئے کہ سورۃ تکویر پڑھے۔اس کے علاوہ سورۃ **اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ**

'اور بعض دوسری سورتوں کا بھی ذکر آتا ہے۔ان سورتوں کو پڑھ کر قیامت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ حضور ! کیا بات ہے آپ ﷺ پر بڑھاپا طاری ہو رہا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا 'شَیَّبَتْنِی سُوْرَۃُ هُوْدٍ وَالْوَاقِعَۃُ وَاِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ وَالْمُرْسَلٰتُ وَالنَّبَا' یعنی بڑھاپا فکر کی وجہ سے آرہا ہے قیامت کی فکر سے۔ان سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا کہ ان میں قیامت کا حال پڑھ کر مجھے فکر لاحق ہو جاتی ہے۔گویا بڑھاپا طاری ہونا غم اور فکر کی وجہ سے ہوتا ہے۔

کسی شخص نے طبیب سے پوچھا مَا شَیَّبَتْنِی مجھے کس چیز نے بوڑھا کر دیا ہے؟ طبیب نے جواب دیا قَالَ بَلْغَم یعنی بلغم کی زیادتی نے جب جسم میں بلغم زیادہ ہو جائے اور دوسرے اخلاط کم ہو جائیں تو بال سفید ہو جاتے ضعف طاری ہو جاتا ہے تو اس شاعر نے حکیم سے کہا: آپ غلط کہتے ہیں میرا بڑھاپا بلغم کی وجہ سے نہیں بلکہ غم کی وجہ سے آرہا ہے ابن ماجہ کی روایت میں ہے غم نصف الہرم ہے یعنی آدھا بڑھاپا غم کی وجہ سے آتا ہے۔اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ ان سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے کیونکہ ان میں قیامت کا ذکر ہے۔محاسبہ کا ذکر ہے اور اس غم کی وجہ سے بڑھاپا طاری ہو رہا ہے۔

نظامِ شمسی

: جب سے اللہ تعالی نے اس دنیا کو پیدا کیا ہے سورج کا یہ نظام قائم ہے۔سورج کا حجم زمین کے حجم سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ماہرینِ فلکیات کی تحقیق کے مطابق کل سات سیارے ہیں جن میں سورج، چاند، زحل، مشتری، مریخ، زہرہ اور عطارد ہیں۔اس میں دو سیاروں یعنی سورج اور چاند کی حرکت اس قدر باقاعدہ ہے کہ اس میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں آتا۔البتہ ان کے علاوہ جو باقی پانچ سیارے زحل، مشتری، مریخ، زہرہ اور عطارد ہیں۔ان کا نظام کچھ عجیب سا ہے۔

یہ غیر منظّم ہیں۔ ماہرینِ فلکیات انہیں خمسہ متحیرہ یعنی پانچ حیران کن سیارے کہتے ہیں۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ان سیاروں کا ذکر کر کے قیامت کے ساتھ ان کا ربط بھی بیان فرمادیا ہے۔ فرمایا **فَلَآ أُقسِمُ بِالخُنَّسِ** ۔ پس میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹ جانے والوں کی۔

اَلجَوارِ ان کی جو سیدھے چلتے ہیں **اَلکُنَّسِ** ان سیاروں کی جو رک جاتے ہیں خنس کا معنی پیچھے ہٹ جانا، خناس اس سے مشتق ہے۔

حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ ان پانچ سیاروں کی چال بے ڈھب ہے عام طور پر ان کی چال مغرب سے مشرق کی جانب ہوتی ہے۔ چلتے چلتے جب یہ سورج کے قریب آتے ہیں تو رک جاتے ہیں نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی چال مشرق سے مغرب کی جانب شروع ہو جاتی ہے۔ تو گویا یہ سیارے کبھی سیدھے چلتے ہیں کبھی رک جاتے ہیں کبھی پیچھے ہٹ جاتے ہیں ان کا اپنا ایک نظام ہے۔

کائنات میں دو قسم کے نظام چل رہے ہیں ایک نظامِ منظّم ہے اور دوسرا نظامِ خمسہ متحیرہ کا غیر منظّم نظام ہے۔ یہ دونوں نظام بھی کسی تیسرے ان سے اوپر والے نظام کے تحت چل رہے ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ کی اصلاح میں اس تیسرے نظام کو حظیر القدس کا نظام کہا گیا ہے۔ کائنات کا شمس و قمر والا نظام ہو یا خمسہ متحیرہ کا غیر منظّم نظام ہو۔ یہ حظیر القدس والے نظام کے تحت چل رہے ہیں۔ آج یہ نظامِ شمسی نظر آ رہا ہے۔ نظامِ شمسی ختم ہو جائے گا اور حظیر القدس والا نظام کارفرما ہو جائے گا۔ قرآن کریم کا نزول بھی اسی نظام کے تحت ہوا ہے۔

جبرائیلؑ کو قرآن پاک لانے کی وجہ سے اس کے ساتھ خاص تعلق ہے اور جبرائیلؑ کیا چیز ہے۔ **ذی قُوَّۃٍ** بڑی طاقت کا مالک ہے ایک موقع پر حضورﷺ نے حضرت جبرائیلؑ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری قوت کا ذکر کیا ہے۔ ذرا بتا کہ تمہاری طاقت کتنی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس قدر طاقت عطا کی ہے جس کا اندازہ قومِ لوط کی تباہی سے کیا جا سکتا ہے۔ بحر میت کے

قریب شرقِ اردن میں چھ بڑے بڑے شہر تھے جن کی مجموعی آبادی چار لاکھ نفوس سے زیادہ تھی۔ زمین تھی، باغات تھے، مگر جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا میں نے اپنے پر کے ایک ذرا سے کنارے سے پورے علاقے کو اٹھا کر اتنی بلندی پر لے گیا کہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آسمان پر سنائی دینے لگیں۔ پھر میں نے ان کو زمین پر پٹخ دیا۔ بحرِ مردار کی آج تک یہ حالت ہے کہ اس کے پانی میں کوئی جانور زندہ نہیں رہ سکتا۔ حضرت جبرائیل کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے کہ وہ قرآن کریم کو حظیر القدس سے لانے والا ہے۔

سورۃ التکویر تفسیرِ مظہری سے (صفحہ نمبر ۲۰۹)

کتاب 'فرالبحرو لاحوال' میں ابنِ ابی الدنیا نے اور کتاب العظمتہ میں ابوالشیخ نے ان آیات کے ذیل میں حضرت ابنِ عباسؓ کا قول اس طرح نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن خدا سورج، چاند اور ستاروں کو بے نور کر کے سمندر میں ڈال دے گا اور ایک پچھمی ہوا بھیجے گا جو سمندر پر لگے گی اور سمندر آگ ہو جائے گا۔

سورۃ التکویر تفسیرِ ضیاء القرآن سے (صفحہ نمبر ۴۹۹)

عہدِ جاہلیت میں کئی قبیح اور سنگدلانہ رسمیں رائج تھیں جنہیں وہ بڑے شرحِ صدر سے انجام دیا کرتے تھے۔ انہی غیر انسانی رسوم میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے۔ اس پر غمزدہ یا پشیمان ہونے کی بجائے وہ فخر و مباہات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اس ظالمانہ حرکت کے آغاز کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ایک دفعہ ربیعہ قبیلہ پر ان کے دشمنوں نے شبخون مارا اور ربیعہ کے ایک سردار کی بیٹی کو وہ اٹھا کر لے گئے۔ جب دونوں قبیلوں کے درمیان صلح ہو گئی تو اس لڑکی کو بھی واپس کر دیا گیا اور اسے اختیار دیا گیا کہ چاہے اپنے باپ کے پاس رہے اور چاہے تو اسیری میں جس کے ساتھ رہی تھی اس کے پاس واپس چلی جائے۔ اس نے اس شخص کے پاس جانا پسند کیا۔ اس کے باپ کو بڑا غصہ آیا اور اس نے اپنے قبیلہ میں یہ رسم جاری کر دی کہ جب کسی کے

ہاں بچی پیدا ہو تو اس کو زندہ زمین میں دبا دیا جائے تاکہ آئندہ ان کی ایسی رسوائی نہ ہو۔ آہستہ آہستہ دوسرے قبائل میں بھی یہ رواج مقبولیت اختیار کرتا گیا۔ عام اہلِ عرب کی معاشی حالت بڑی خستہ ہوتی تھی۔ بچیوں کو پالنا، جوان کرنا، پھر ان کی شادی کرنا وہ اپنے لئے ناقابلِ برداشت بوجھ تصور کرتے تھے اس لیے ان کو بچپن میں ہی ٹھکانے لگا دیا کرتے تھے۔ قبائل میں باہمی کشت وخون روزمرہ کا معمول تھا۔

حضرت فاروقِ اعظمؓ کے چچازاد بھائی زید بن عمرو بن نفیل کو جب پتہ چلتا کہ فلاں کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے اور وہ زندہ دفن کرنا چاہتا ہے تو دوڑ کر اس کے پاس جاتے اور اس بچی کی پرورش اور اس کی شادی وغیرہ کے اخراجات کی ذمہ داری اٹھاتے اور اس طرح اس معصوم کی جان بچاتے۔ مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصہ بن ناجیہ المجاشعی کا بھی یہی معمول تھا۔ علامہ آلوسی نے طبرانی کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں نے زمانہ جاہلیت میں بھی نیک کام کیے ہیں۔ کیا مجھے ان کا بھی اجر ملے گا؟ میں نے تین سو ساٹھ بچیوں کو زندہ درگور ہونے سے بچایا اور ہر ایک کے عوض دو دو، دس دس ماہی گابھن اونٹنیاں اور ایک ایک اونٹ بطورِ فدیہ ان کے باپوں کو دیا۔ کیا مجھے اس عمل کا کوئی اجر ملے گا؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس عمل کا اجر تو تجھے مل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو اسلام لانے کی توفیق مرحمت فرمائی اور نعمتِ ایمان سے تجھے سرفراز کر دیا۔

سورۃ التکویر تفسیرِ انوار البیان سے (صفحہ نمبر ۳۵۷)

تفسیرِ انوار البیان میں ہے رات کا گزرنا اور صبح کا آنا مشابہ ہے ظلمت کفر کے رفع ہو جانے کے اور نور ہدایت ظاہر ہو جانے کے اور ان دونوں کا سبب قرآن کریم ہے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ (اور اس فرشتہ کو رسول اللہ ﷺ نے افق مبین یعنی آسمان پہ صاف کنارے پر دیکھا ہے)۔ حضرت جبرائیلؑ جب وحی لاتے تھے تو حضرت دحیہ کلبی کی صورت میں آیا کرتے تھے۔ سرورِ عالم ﷺ نے انہیں دو مرتبہ ان کی اصل صورت میں دیکھا، ایک مرتبہ

شبِ معراج میں سدرۃ المنتہٰی کے قریب اور ایک مرتبہ محلّہ جیا میں (جو مکہ معظّمہ کا ایک محلّہ ہے) دیکھا آپ نے دیکھا کہ ان کے چھ سو پر ہیں اور پوری افق کو گھیر رکھا ہے۔

سورۃ الانفطار

اس سورۃ کا نام سورۃ الانفطار ہے انفطار کے معنی ہے پھٹ جانا۔اس میں ایک رکوع اور انیس آیتیں ہیں۔یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

سورۃ الانفطار کا موضوع تفاسیر صِراط الجِنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۵۶۰) :اس میں قیامت قائم ہوتے وقت کائنات میں ہونے والی ہیبت ناک تبدیلیاں بیان کر کے فرمایا گیا کہ اس وقت ہر جان کو وہ سب کچھ معلوم ہو جائے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو اس نے پیچھے چھوڑا۔ ہر انسان پر کراما کاتبین دو فرشتے مقرر ہیں جو اس کے اعمال اور اقوال کے نگہبان ہیں اور وہ اس کے تمام اعمال جانتے ہیں۔

سورۃ الانفطار تفسیرِ معالم العِر فان سے (صفحہ نمبر ۱۵۰)

معالم العرفان میں ہے کہ قیامت کے دن ہر عمل پر گواہی بھی پیش ہوگی۔انسان کے اپنے اعضا اس کے خلاف یا اس کے حق میں گواہی دیں گے۔اس کے علاوہ باہر کی چیزیں بھی گواہی دیں گی۔ان کے فرشتے بھی شہادت دیں گے۔یہ سارا انتظام اللہ تعالی نے اس لیے کیا ہے کہ ہر نیک و بد کو اس کے کیے کی جزا یا سزا مل سکے چنانچہ فرمایا:

اِنَّ الا برَارَ لَفِی نَعِیمٍ یادرکھو نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ابرار وہ لوگ ہیں جن کی نگاہ ہر وقت نیکی کی روح پر ہوتی ہے۔ایک ظاہری عمل ہوتا ہے اور اس کی روح ہوتی ہے جیسے ظاہری طور پر نماز کی ایک شکل وصورت ہے مگر اس کی ایک روح بھی ہے اور روح یہ ہے کہ '**کَاَنَّکَ تَرَاہ**' اللہ تعالی کی عبادت اس طرح کرو، گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو یعنی عبادت میں حضوری اور اخلاص عبادت کی روح ہے۔

اِنَّمَا الاَعمَالُ بِالخَوَاتِیمِ۔ یعنی اعمال کا دارومدار خاتمے پر ہے جس کا خاتمہ اچھا ہو گیا وہ کامیاب ہو گیا۔ بسا اوقات کوئی شخص ساری عمر اچھے کام کرتا رہا مگر خاتمہ کفر پر ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات ساری عمر برے اعمال کا ارتکاب کرتا رہتا ہے مگر خاتمہ ایمان پر ہوتا ہے۔ اسی لیے ابرار کی نگاہ ہمیشہ خاتمہ پر رہتی ہے۔

سورۃ الانفطار تفاسیر صِراط الجِنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۵۶۴)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے، حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کے حِلم اور بردباری سے دھوکے میں نہ پڑ جائے، بے شک جنت اور دوزخ تمہارے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہے۔

حضرت فضیل بن عیاضؒ جب اس آیت ' **یَعلَمُونَ مَا تَفعَلُونَ** ' کی تلاوت فرماتے تو کہتے: غافل لوگوں پر اس سے زیادہ سخت کوئی آیت نہیں۔

سورۃ الانفطار تفسیرِ مظہری سے (صفحہ نمبر ۲۱۹)

ایک عورت نے قاضی سے استغاثہ کیا کہ میرے شوہر نے میرے اوپر ایک اور عورت سے نکاح کر لیا ہے قاضی نے کہا تجھ کو اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں اللہ نے مردوں کے لئے حسبِ مرضی دو دو، تین تین اور چار چار عورتیں مباح کر دی ہیں۔ عورت بولی قاضی جی اگر حجاب وحیا مانع نہ ہوتی تو میں اپنا حسن تم کو دکھاتی اور پھر پوچھتی کہ جس کا حسن وجمال ایسا ہو میرا، کیا اس کے رخ موڑ کر دوسرے سے مشغلہ کرنا جائز ہے۔ عورت کا یہ قول ایک اہلِ دل نے سن پایا اور سنتے ہی چیخ مار کر بے ہوش ہو کر گر پڑا کچھ دیر کے بعد ہوش میں آیا تو کہنے لگا میں نے ایک ہاتف کو یہ ندا دیتے سنا کہ کیا اس عورت کی بات تو نے نہیں سنی اگر عظمت وکبریا کا حجاب نہ ہوتا تو میں تم کو اپنا جمال کھاتا جس کی سمائی کسی مقابل میں نہیں اور تم سے پوچھتا کہ جو مجھ سے مشغلہ رکھ سکتا ہے کیا اس کے لئے دوسرے سے مشغلہ رکھنا درست ہے مجھ جیسا کہاں ہے میری مثل کون ہے کوئی

میری مثل ہو ہی نہیں سکتا۔ میری ہی طلب کر طلب کرے گا مجھے پالے گا۔

فَعَدَلَكَ تجھے موڑا اور جس صورت کی طرف چاہا پھیر دیا یا دوسرے حیوانوں کی خلقی (صورت وطبیعت سے) پھیر دیا یہاں تک کہ تو سب سے جدا اور ممتاز ہو گیا۔ یا بعض اجزا کی طبیعت کو بعض کی طرف موڑ کر اعتدال پیدا کر دیا۔ صفرا کی حرارت اور خشکی کو بلغم کی سردی اور رطوبت سے توڑ دیا اور سودا کی خشکی و برودت کو خون کی رطوبت وحرارت سے شکستہ کر دیا اور بلغم کی برودت ورطوبت کو صفرا کی حرارت و یبوست سے اور خون کی حرارت ورطوبت کو سودا کی خشکی و برودت سے توڑ دیا۔ اس طرح تمام حیوانات سے زیادہ تیرے مزاج میں اعتدال پیدا ہو گیا (کوفیوں کی قرات میں **عَدَلَكَ** ہے جس کی توضیح ہم نے کر دی)۔

اِنَّ الا برَارَ لَفِی نَعِیم ۔ بلاشبہ ابرار راحت میں ہوں گے ابرار وہ لوگ جو اپنے ایمان میں سچے ہیں غلط عقائد برے اخلاق اور قبیح کردار غرض ہر ممنوع سے پرہیز رکھتے اور اللہ کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں ابن عسا کر نے اپنی تاریخ میں حضرت ابنِ عمر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے ان کو ابرار اس لئے فرمایا کہ انہوں نے باپ اور بیٹوں کے ساتھ نیک سلوک کیا۔

سورۃ المطففین

اس سورۃ کا نام سورۃ المطففین ہے مطففین کا معنی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والے۔ اس میں ایک رکوع اور چھتیس آیتیں ہیں۔ یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

سورۃ المطففین کا موضوع تفاسیر صراط الجنان فی تفسیر القرآن سے (صفحہ نمبر ۵۶۹) اس سورۃ میں اسلام کے بنیادی عقائد بیان کئے گئے اور ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی مذمت فرمائی گئی ہے اور بتایا گیا کہ کافروں کا اعمال نامہ سب سے نیچی جگہ سجین میں لکھا ہوا ہے اور جس دن وہ اعمال نامہ نکالا جائے گا تو اس دن قیامت کے منکروں کیلیے خرابی ہے۔ قیامت کے دن کو وہی جھٹلاتا

ہے جو سرکش اور گناہگار ہے۔ دنیا میں جو کافر مسلمانوں کا مذاق اڑاتے اور ان پر ہنستے تھے قیامت کے دن ان کی رسوائی اور دردناک انجام دیکھ کر مسلمان ان پر ہنسیں گے۔

سورۃ المطففین تفسیرِ مظہری سے (صفحہ نمبر ۲۲۲)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچ چیزیں پانچ چیزوں سے آتی ہیں۔

1- جس قوم نے بھی عہد توڑا اللہ نے ان کے دشمن کو ان پر مسلط کر دیا۔

2- جس قوم نے بھی اللہ کے نازل کردہ حکم کے خلاف فیصلہ کیا ان میں افلاس ضرور پھیل گیا۔

3- جس قوم میں بدکاری کھلم کھلا ہوئی ان میں موت ضرور پھیلی۔

4- جس قوم نے بھی ناپ میں کمی بیشی کی اس سے زمین کی روئیدگی ضرور روک دی گئی اور کال میں مبتلا کیا گیا۔

5- جس قوم نے زکوۃ نہ دی اس سے بارش روک دی گئی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابنِ عمرؓ بائع کی طرف سے گزرتے تو فرماتے اللہ سے ڈرتا رہ ناپ تول پورا کیا کر کیونکہ قیامت کے دن ناپ تول میں کمی کرنے والوں کو اتنا کھڑا کیا جائے گا کہ پسینہ کی لگام ان کے دہانہ پر ہو جائے گی اور آدھے کانوں تک پسینہ پہنچے گا۔ (گویا پسینہ میں غرق ہوں گے ناک اور ناک سے اوپر کا حصہ ڈوبنے سے بچے گا)۔

بیہقیؒ نے آیت **يَومَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ العَالَمِين** ۔ کی تشریح میں قتادہ کا قول نقل کیا ہے قتادہ نے کہا مجھے یہ خبر ملی ہے کہ حضرت کعب فرماتے تھے کہ لوگ بمقدار تین سو برس کھڑے رہیں گے۔

سِجین سجن سے مشتق ہے۔ سجن کا معنی ہے حبس قید۔ قاموس میں ہے سجین بروزن سکین دوامی سخت قید۔ اخفش نے کہا سجین سجن سے بروزن فعیل ہے شربت بہت پینے والا فسیق بڑا فاسق ایسے ہی سجین سخت قید۔ عکرمہ نے کہا آیت لفی سجین میں سجین سے مراد ہے ذلت اور گمراہی حقیقت میں

فجار کے مندرجہ کتاب اعمال ان کی قید ذلت اور گمراہی کے موجب ہیں (یعنی اپنے اعمال کی وجہ سے کافر قید ذلت اور گمراہی میں ہوں گے) مگر مجازاً کتاب کو قید و ذلت میں قرار دیا۔

حضرت ابنِ عباسؓ حضرت کعب احبار کے پاس گئے اور فرمایا آیت **اِنَّ کِتَابَ الفُجَّارِ لَفِی سِجِّین** کی تشریح سے مجھے مطلع کیجئے کعب احبار نے فرمایا فاجر (کافر) کی روح کو آسمان کی طرف چڑھایا جاتا ہے مگر آسمان اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے پھر زمین کی طرف اس کو اتارا جاتا ہے زمین بھی اس کو لینے سے انکار کر دیتی ہے آخر سات زمینوں کے نیچے اس کو داخل کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سجین تک اس کو پہنچا دیا جاتا ہے اور اس میں لکھ کر مہر کر کے ابلیس کی فوج کے نیچے (ایک مقام پر) اس کو رکھ دیا جاتا ہے تا کہ قیامت کے دن بوقت حساب اس کی تباہی کی شناخت ہو سکے۔

کلبی کا قول ہے کہ سجین ساتویں نچلی زمین کے نیچے ایک سبز پتھر ہے آسمانوں کی سبزی اسی (کے عکس) کی وجہ سے ہے اس کے نیچے کافروں کی کتاب رکھ دی جاتی ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حدیث میں آیا ہے الفلق جہنم کے اندر سجین میں سر پوش ڈھانکا ہوا ایک کنواں ہے اور ایک کنواں سر پوش کھلا ہوا (بھی) جہنم میں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سجین ساتویں زمین کے نیچے ہے اور سجین جہنم میں ہے یہ دونوں قول متعارض ہیں ان کا تعارض اس طرح دور کیا جا سکتا ہے کہ جہنم ساتویں زمین کے نیچے ہے۔ ابو الشیخ نے العظم میں نیز بیہقی نے باسناد ابو الزعرا حضرت عبداللہ کا قول نقل کیا ہے کہ جنت ساتویں آسمان میں اور دوزخ ساتویں نچلی زمین میں ہے۔ بیہقی نے دلائل میں حضرت عبداللہ بن سلام کا قول نقل کیا ہے کہ جنت آسمان میں اور دوزخ زمین میں ہے۔

اِنَّھُم عَن رَّبِھِم یَومَئِذٍ لَمَحجُوبُونَ۔ یعنی قیامت کے دن مومن جب اللہ کو دیکھیں گے کافر اس روز دیدارِ الٰہی سے یقیناً روک دیئے جائیں گے۔ بداعمالیوں کی تاریکیوں کے حجاب ان کی آنکھوں پر پڑے ہوں گے پس جس طرح وہ دنیا میں حق کو نہیں دیکھتے تھے اسی طرح

قیامت کے دن دیدارِ الٰہی نہ کر سکیں گے۔

حسن بصری کے فرمایا اگر زاہدوں اور عابدوں کو معلوم ہو جائے کہ رب کا دیدار ان کو نہ ہوگا تو ان کی جان نکل جائے۔

يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُونَ جس طرح **وَيْلٌ لِلْمُكَذِّبِينَ** ۔ کتاب کی صفت ہے اسی طرح یہ جملہ بھی کتاب کی صفت ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ **مُقَرَّبُونَ** سے مراد ہیں قرب رکھنے والے ملائکہ میں کہتا ہوں کہ شہیدوں اور صدیقوں اور پیغمبروں کی روحیں بھی مقربین میں شامل ہیں کیونکہ یہ سب ارواح وہاں ہوں گی۔

ابوالشیخ نے حضرت انس کا قول نقل کیا ہے کہ (قیامت کے دن) سفید پرندوں کے پوٹوں سے اللہ شہیدوں کو اٹھائے گا۔ یہ پرندے ان قندیلوں میں ہوں گے جو عرش سے آویزاں ہیں۔ صبح کو نکل کر (سیر کو) چلے جاتے ہیں پھر گلزار جنت کی طرف لوٹ جاتے ہیں روزانہ اللہ ان پر جلوہ انداز ہو کر السلام علیکم فرماتا ہے۔

ابونعیمؒ نے ضعیف سند سے حضرت ابوہریرہؓ اور وہب بن منبہ کا قول نقل کیا ہے کہ ساتویں آسمان میں اللہ کا مقرر کردہ ایک مکان ہے جس کو مکان سفید کہا جاتا ہے اس میں مومنوں کی روحیں جمع ہوتی ہیں۔

حدیث میں مومنوں کی روحوں کی حالت حسبِ تفاوت درجہ بیان کی گئی ہے جو شعبی نے بحرالکلام میں نقل کی ہے کہ روحیں چار طرح کی ہوتی ہیں۔ انبیا کی روحیں بدن سے نکل کر مشکی اور کافوری شکلیں اختیار کر لیتی ہیں اور جنت میں کھاتی پیتی اور چین کرتی ہیں اور رات کو ان قندیلوں میں قرار گزین ہوتی ہیں جو عرش سے آویختہ ہیں۔ شہیدوں کی روحیں بدن سے نکل کر سبز پرندوں کے پوٹوں میں رہ کر جنت کے اندر کھاتی پیتی اور چین کرتی ہیں اور رات کو ان قندیلوں میں قرار گزین ہوتی ہیں جو عرش سے آویختہ ہیں۔ فرماں بردار مومنوں کی روحوں کو جنت میں روک لیا جاتا ہے وہ

جنت میں نظارے تو کرتی ہیں مگر کھاتی پیتی نہیں نہ اور کسی طرح سے لذت اندوز ہوتی ہیں۔ گناہ گار مسلمانوں کی روحیں آسمان وزمین کے درمیان فضا میں رہتی ہیں۔ رہیں کافروں کی روحیں تو وہ سیاہ پرندوں کے جوف میں سجین کے اندر ساتویں زمین کے نیچے بند رہتی ہیں۔ انبیا کی روحیں اپنی مشکی شکلوں میں ہو جاتی ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے جسم انسانوں جیسے جسم ہوتے ہیں مگر مشکی ہوتے ہیں تا کہ ان کی پاکیزہ خوشبو (ادھر ادھر منتشر) ہو۔

حسن بصری نے کہا تازگی چہرے پر ہوتی ہے اور خوشی دل میں۔

سورۃ المطففین تفاسیرِ صراط الجنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۵۷۲)

حضرت مالک بن دینارؒ فرماتے ہیں کہ میں اپنے ایک پڑوسی کے پاس اس کے انتقال کے وقت گیا تو اس نے مجھے دیکھ کر کہا: اے مالک بن دینارؒ! اس وقت مجھے اپنے سامنے آگ کے دو پہاڑ نظر آ رہے ہیں اور مجھ سے کہا جا رہا ہے کہ ان پہاڑوں پر چڑھو لیکن ان پر چڑھنا میرے لئے دشوار ہے۔ میں نے اس کے گھر والوں سے اس بارے میں پوچھا تو ان لوگوں نے بتایا کہ اس کے پاس غلہ ناپنے کے دو پیمانے ہیں، ایک سے غلہ ناپ کر لیتا تھا اور دوسرے سے غلہ ناپ کر دیتا تھا۔ حضرت مالک بن دینارؒ فرماتے ہیں: میں نے ان دونوں پیمانوں کو منگوایا اور انہیں ایک دوسرے پر رکھ کر توڑ دیا۔ پھر اس شخص سے پوچھا کہ اب تمہارا کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا میرے ساتھ ویسا ہی معاملہ ہے بلکہ اب پہلے سے زیادہ خراب ہو گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو صحیح ناپنے اور تولنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سورۃ المطففین تفسیرِ ضیاء القرآن سے (صفحہ نمبر ۵۱۳)

اس سورۃ کا نزول ہجرت کے فوراً بعد مدینہ طیبہ میں ہوا۔ وہاں ایک تاجر تھا جس کا نام ابو جہینہ تھا اس نے دو قسم کے باٹ رکھے ہوئے تھے۔ جب کوئی جنس خریدتا تو اس کے لئے اور باٹ استعمال کرتا اور جب فروخت کرتا تو اس کیلئے دوسرے باٹ۔

حضرت ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "ان پانچ چیزوں پر یہ پانچ سزائیں ملتی ہیں۔ جو قوم عہدِ شکنی کرتی ہے، اللہ تعالی اس پر اس کے دشمن مسلط کر دیتا ہے۔ جو قوم احکام الٰہی کے خلاف فیصلہ کرتی ہے، اللہ تعالی ان کو تنگ دست کر دیتا ہے۔ جس قوم میں بدکاری عام ہو جاتی ہے، اس میں طاعون پھیل جاتی ہیاور جو قوم اپنے ناپ تول میں کمی کرتی ہے، وہاں زرعی پیداوار میں برکت نہیں رہتی اور قحط سالی پھیل جاتی ہے۔ جو قوم زکوۃ نہیں دیتی، اللہ تعالی ان پر بارش نازل نہیں کرتا۔

علامہ ابنِ منظور لکھتے ہیں کہ رَینٌ اس زنگار کو کہتے ہیں جو تلوار یا آئینہ کو لگ جاتا ہے۔ جو غبار دل کو زنگار کی طرح ڈھانپ لیتا ہے اس کو بھی رَین کہتے ہیں۔ حسن بصری فرماتے ہیں پے در پے گناہ کرنے سے دل سیاہ ہو جاتا ہے اس سیاہی کو رَین کہتے ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا: بندہ جب گناہ کرتا ہے تو دل پر ایک سیاہ داغ بن جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کرے، اس گناہ سے باز آ جائے اور استغفار کرے تو دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر بار بار وہ گناہ کرتا رہے تو وہ داغ بڑھتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ سارے دل کو گھیر لیتے ہیں۔

سورۃ المطففین تفسیرِ انوار البیان سے (صفحہ نمبر ۲۶۴)

نماز یا حج کی سنتیں چھوڑ دینا، روزہ رکھنا لیکن اس میں غیبتیں کرنا، تلاوت کرنا لیکن غلط پڑھنا یہ سب طفف میں شامل ہے۔ یعنی ثواب میں کمی ہو جاتی ہے اور بعض مرتبہ تلاوت غلط ہونے کی وجہ سے نماز ہی نہیں ہوتی، اگر زکوۃ پوری نہ دے تو یہ بھی طفف ہے۔ (طفف کا معنی گھٹانا اور کم کرنا) جو لوگ حکومت کے کسی بھی ادارے میں یا کسی انجمن یا مدرسہ وغیرہ میں ملازم ہی انہوں نے معروف اصول و قواعد یا معاملہ اور معاہدے کے مطابق جتنا وقت دینا طے کیا ہے اس وقت میں کمی کرنا اور تنخواہ پوری لینا یہ سب طفف ہے۔

حضرت ابنِ عمرؓ نے یَومَ یَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ العٰلَمِینَ ۔ کی تفسیر کرتے ہوئے

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ یہ (رب العلمین کے حضور کھڑے ہونا) اس دن ہوگا جس میں یہ لوگ اتنے زیادہ پسینہ میں کھڑے ہوں گے جو (نیچے سے لیکر) آدھے کانوں تک ہوگا (۔جیسے کوئی شخص نہر میں کھڑا ہو)۔

اہلِ کفر جو قیامت کے منکر ہیں ان کے بارے میں فرمایا: **کَلَّا** (کہ ہرگز ایسا نہیں ہے) جیسا کہ تم خیال کرتے ہو بلکہ جزاوسزا کا وقوع ضرور ہوگا اور کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میرے اعمال تو ہوا میں اڑ گئے وہ کہاں محفوظ ہیں، اوران کی پیشی کا کیا راستہ ہے، کیونکہ بندوں کے سب اعمال محفوظ ہیں اور منضبط ہیں، کافروں کے اعمال نامے سجین میں ہیں، جو ساتویں زمین میں کافروں کی روحوں کی رہنے کی جگہ ہے یہ اعمال نامے محفوظ ہیں روز جزا یعنی قیامت کے دن ہر ایک کا اپنا اپنا اعمال نامہ سامنے آجائے گا جو عمل کرنے والے پر حجت ہوگا اور انکار کی گنجائش نہیں ہوگی۔

گناہوں کا جو زنگ ہے وہ اہلِ ایمان کے قلوب کا بھی ناس کھو دیتا ہے۔ حضرت اغرؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب مومن بندہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ داغ لگ جاتا ہے پس اگر توبہ استغفار کر لیتا ہے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے۔

علیین ساتویں آسمان میں مومنین کی روحوں کے رہنے کی جگہ ہے۔

لَا تُفَتَّحُ لَهُم اَبوَابُ السَّمآءِ وَلَا يَدخُلُونَ الجَنة حَتّٰى يَلِجَ الجَمَلُ فِى سَمِّ الخِيَاطِ ۔(ان کیلئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور نہ وہ کبھی جنت میں داخل ہوں گے جب تک اونٹ سوئی کے ناکہ میں نہ چلا جائے اور اونٹ سوئی کے ناکہ میں جا نہیں سکتا لہذا وہ بھی جنت میں نہیں جا سکتے) پھر اللہ عزوجل فرماتے ہیں کہ اس کو کتاب سجین میں لکھ دو جو سب سے نیچی زمین میں ہے، چنانچہ اس کی روح (وہیں سے) پھینک دی جاتی ہے۔

سورۃ المطففین تفسیرِ ابنِ عباسؓ سے (صفحہ نمبر ۱۰۹۷)

سجین ساتوں زمینوں کے نیچے سبز چٹان پر لکھے ہوئے آدم کے اعمال ہیں۔

علیین ساتوں آسمانوں کے اوپر اور عرش رحمٰن کے نیچے سبز زمرد کی تختی پر نیک لوگوں کے لکھے ہوئے اعمال ہیں۔

(وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ۔ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ) اس شراب کی آمیزش تسنیم کے پانی سے ہوگی اور تسنیم جنت عدن میں ایسا چشمہ ہے جس سے صرف مقرب پئیں گے۔

سورۃ المطففین تفسیرِ بصائر الفرقان سے (صفحہ نمبر ۸۱۸)

سجین قید خانہ کو کہتے ہیں۔ نام سے ظاہر ہو گیا ہے کہ یہ اعمال نامہ کافروں کیلئے قید خانہ کے مترادف ہے۔

سورۃ الانشقاق

اس سورۃ کا سورۃ الانشقاق ہے انشقاق کا معنی ہے پھٹنا۔ اس سورۃ میں ایک رکوع اور پچیس آیتیں ہیں۔ یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

سورۃ الانشقاق کا موضوع تفسیرِ معالم العرفان سے (صفحہ نمبر ۲۰۳): اس سورۃ میں اللہ تعالی نے انسان کی فطری ترقی کے پیشِ نظر قیامت کا مسئلہ بیان کیا ہے۔ اگر انسان فطری طور پر ترقی کرتا جائے تو اس کی اگلی منزل قیامت ہی ہوگی۔

سورۃ الانشقاق تفسیرِ معالم العرفان سے (صفحہ ۲۰۶)

حضور ﷺ نے فرمایا: قیامت کے روز سب سے پہلے میری قبر شق ہوگی اور اس وقت جنت سے لا کر مجھے لباس پہنایا جائیگا۔ بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ حشر کے میدان میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم کو لباس پہنایا جائے گا کیونکہ کافروں نے آپ کو رسیوں سے باندھ کر برہنہ حالت میں آگ میں پھینکا تھا۔

زمین و آسمان دونوں بدل دیے جائیں گے۔ موجودہ زمین کی جگہ دوسری سفید زمین بچھا دی جائے گی اور محاسبہ کا عمل اس دوسری زمین پر پیش آئے گا۔ جس زمین پر انسان کے گناہوں کی

آلودگی ہیں ہوگی۔اب رہی یہ بات کہ تبدیلی زمین کے وقت لوگ کہاں ہوں گے تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس درمیانی عرصہ میں تمام لوگ پل صراط کے ایک کنارے پر ہوں گے۔

انسان کو ہر صورت میں مشقت برداشت کرنا ہے ارشادِ باری تعالی ہے: **لَقَد خَلَقنَا الاِنسَانَ فِی کَبَدٍ** بیشک انسان کو ہم نے مشقت میں پیدا کیا ہے۔کوئی انسان مشقت سے خالی نہیں۔ حضرت جبرائیلؑ نے نبی کریم ﷺ سے کہا **یَا مُحَمَّدُ عِش مَا شِئتَ فَاِنکَ مَیِّتٌ** اے نبی کریم ﷺ ! آپ جب تک چاہیں زندہ رہیں مگر ایک دن موت ضرور آنی ہے۔ نیز یہ بھی کہا **وَاحبِب مَا شِئتَ** دنیا میں آپ جس سے چاہیں محبت کریں۔ **فاِنک مفارِقه** ایک دن جدائی ضرور ہوگی **وَاعمَل مَاشِئتَ فَاِنَّکَ مُلَا قِیهِ** آپ جو چاہیں عمل کریں۔ اس کا نتیجہ ضرور سامنے آئے گا مطلب یہ کہ انسان تکلیف اٹھا کر، مشقت برداشت کر کے ایک دن ضرور اللہ کے ہاں پیش ہوگا۔

ایک سال یا چالیس دن کے عرصے تک مرنے والے کا رخ اس جہان کی طرف رہتا ہے۔اس لیے فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ ایسی حالت میں مرنے والے کے لئے دعا، استغفار یا ایصالِ ثواب بہت مفید ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا رخ ادھر ہوتا ہے لہذا جہاں تک ممکن ہو اسے فائدہ پہنچانا چاہیئے۔اس کیلئے بخشش کی دعا کرنے چاہیئے۔غرباء مساکین کو کچھ دے کر ایصالِ ثواب کرنا چاہیئے۔

سورۃ الانشقاق تفسیرِ مظہری سے (صفحہ نمبر ۲۳۴)

حاکم نے حضرت ابنِ عمر کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کا دن ہوگا تو زمین کو اس طرح پھیلا دیا جائیگا جیسے چمڑا پھیلایا جاتا ہے اور مخلوق کو اٹھایا جائیگا۔ حضرت جابر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن زمین کو اس طرح پھیلایا جائیگا جیسے چمڑے کو پھیلایا جاتا ہے پھر آدمی کو زمین میں صرف قدم رکھنے کی جگہ ملیگی۔پھر سب سے پہلے مجھے بلایا جائیگا۔میں سجدے

میں گر جاں گا تو مجھے (کچھ عرض کرنے کی) اجازت دی جائیگی۔

ابوالقاسم نے الدیباج میں عمدہ سند کے ساتھ حضرت ابنِ عمر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت **اِذَاالسَّمَآءُ انشقّت الخ** کی تشریح میں فرمایا میں ہی ہوں وہ سب سے اول شخص جو زمین پھٹ کر باہر نکلے گا۔ میں (اٹھ کر) اپنی قبر میں بیٹھ جاؤں گا۔ میرے سر کے مقابل آسمان تک ایک دروازہ کھل جائے گا کہ عرش تک مجھے دکھائی دیگا۔ پھر میرے نیچے سے ایک دروازہ کھولا جائیگا کہ ساتویں زمین تک مجھے دِکھ جائیگی اور ثریٰ تک میں دیکھ لونگا پھر دائیں طرف ایک دروازہ کھولا جائیگا کہ میں جنت تک دیکھ لونگا اور اپنے ساتھیوں کے مکان مجھے دِکھ جائیں گے اور زمین مع میرے جنبش میں آجائیگی تو میں کہونگا زمین تجھے کیا ہو گیا زمین جواب دے گی۔ میرے مالک نے مجھے حکم دیا ہے کہ میرے اندر جو کچھ ہے اس کو باہر پھینک دوں اور خالی ہو جاں لہذا جیسے میں (انسانوں سے پہلے) تھی ویسی ہی ہو جاؤں گی۔

سورۃ الانشقاق تفسیرِ ابنِ عباس سے (صفحہ نمبر ۱۱۰)

وَاِذَ الاَرضُ مُدَّت اور جب زمین کو کھینچ دیا جائے گا۔

حضرت ابنِ مسعودؓ نے فرمایا: زمین اتنی وسیع کردی جائے گی تا کہ مخلوق حساب کے لئے اس پر کھڑی ہو سکے پھر بھی مخلوق کی کثرت کی وجہ سے ہر بندے کو صرف قدم رکھنے کی جگہ ملے گی۔

سورۃ الفجر

اس سورۃ کا نام سورۃ الفجر ہے فجر کا معنی ہے صبح۔ اس سورۃ میں ایک رکوع اور تیس آیتیں ہیں۔ یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

سورۃ الفجر کا موضوع تفسیرِ معالم العرفان سے (صفحہ نمبر ۲۹۵)

اس سورۃ کے آخری حصے میں قیامت کے محاسبے کا ذکر ہے۔ درمیانی حصے میں اللہ تعالی نے ان اسباب کا تذکرہ فرمایا ہے جن کی وجہ سے انسان رسوا ہوتے ہیں۔ ساتھ میں کامیابی کے

اصول بھی بیان فرما دیے ہیں۔ سورۃ کے ابتدائی حصے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے چند چیزوں کی تاکیدیں قسمیں کھا کر اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ کس طرح انسانوں کی نگرانی کرتا ہے اور پھر مجرموں کو سزا دیتا ہے۔

سورۃ الفجر تفسیرِ معالم العِرفان سے (صفحہ نمبر ۲۹۵)

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے نماز پڑھائی، اس میں قرأت زیادہ لمبی کر دی۔ لوگوں نے حضور ﷺ کے پاس شکایت کی۔ عشاء کی نماز کا واقعہ تھا۔ آپ نے فرمایا اتنی لمبی سورتیں کیوں پڑھتے ہو جس سے لوگوں کو شکایت پیدا ہوتی ہے۔ اس کی بجائے **سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى۔ هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ۔ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا۔ وَالْفَجْرِ** وغیرہ سورتیں پڑھ لیا کرو۔ جو نسبتاً چھوٹی ہیں تاکہ لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔

هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ۔کیا اس میں قسم ہے عقلمندوں کیلئے یعنی عقل مندان باتوں کو سامنے رکھ کر سوچ سکتے ہیں۔ اور کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ متکبرین کو ضرور سزا دی جائے گی۔ حجر کے دو معنی آتے ہیں۔ حجر عقل کو بھی کہتے ہیں اور منع کرنے کو بھی۔ عقل بھی انسان کو قبیح امور سے روکتی ہے۔ لہٰذا اسے حجر کہتے ہیں۔ اور ذی حجر کا معنی صاحبِ عقل ہوگا۔ قرآن پاک میں حجر کا ہم معنی لفظ **نُهٰى** بھی آیا ہے۔ جیسے **اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى** اس میں عقل مندوں کیلیے نشانیاں ہیں یہ تمام چیزیں صاحبِ عقل لوگوں کیلیے بطور گواہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ منکرین سے ضرور باز پرس کرے گا اور انہیں یونہی نہیں چھوڑ دیا جائے گا۔

تفسیری روایتوں میں آتا ہے کہ شداد قومِ عاد کا بادشاہ تھا یہ وہی شخص ہے جس نے عجیب وغریب طریقے سے پرورش پائی۔ غیر معمولی طریقے سے دولت مند اور پھر بادشاہ بنا اور پھر اس کی موت بھی عجیب وغریب طریقے پر واقع ہوئی۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک بے نظیر شہر آباد کیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسے نظروں سے غائب کر دیا۔ روایت ہے کہ یہ شہر اپنی جگہ پر موجود ہے۔ مگر خدا کی

حکمت کہ نظروں سے اوجھل ہے۔

کہتے ہیں کہ ملک الموت نے بارگاہِ رب العزت میں عرض کی کہ اے مولا کریم میں نے کروڑوں لوگوں کی جانیں قبض کی ہیں مگر دو جانیں ایسی ہیں کہ جنہیں قبض کرتے وقت مجھے بڑا ہی صدمہ ہوا۔ میں نے تیرے حکم کی تعمیل ضرور کی، مگر نہایت ہی دکھ کے ساتھ۔ یہ دونوں ماں بیٹا تھے۔ واقعہ یوں ہوا کہ جہاز غرق ہو گیا اور ایک عورت اپنے شیر خوار بچے کے ساتھ ایک تختے کا سہارا لینے میں کامیاب ہو گئی تختہ دریا میں بہ رہا تھا اور ماں بیٹا اس پر سوار تھے۔ مولا کریم ! اچانک تیرا حکم ہوا اور میں نے ماں کی جان اسی تختے پر نکال لی۔ میرے لیے پریشان کن بات یہ تھی کہ ماں مرچکی ہے اب بچے کا کیا حشر ہوگا۔

بچہ ایک ٹوٹے ہوئے تختے پر سوار ہے۔ اور تختہ ہر آن پانی کی لہروں کے تھپیڑے کھا رہا ہے۔ جو کسی وقت بھی کسی تیز لہر کی زد میں آ کر الٹ سکتا ہے۔ بچے کیلئے نہ خوراک کا انتظام ہے، نہ کسی نگہداشت کا بندوبست۔ دریا کے کنارے دھوبی کپڑے دھو رہے تھے۔ اچانک کسی کی نظر پڑی تو تختے کو کھینچ لائے۔ بڑے حیران ہوئے کہ ماں مرچکی ہے اور بچہ بے یارومددگار تختے پر زندہ سلامت موجود ہے۔ وہ لوگ اس بچے کو اپنے سردار کے پاس لے گئے۔ سردار بے چارہ بے اولاد تھا۔ خوبصورت بچہ دیکھ کر اس کا دل آ گیا۔ اور اس نے بچے کو اپنی نگرانی میں لے کر اسے اپنا بیٹا بنا لیا۔

یہ بچہ آٹھ نو سال کا تھا کہ اپنے ساتھی بچوں کے ساتھ کہیں کھیل رہا تھا اتنے میں بادشاہ کی سواری کی آمد کا شور اٹھا سب لوگ ادھر ادھر بھاگ گئے۔ مگر یہ بچہ اکیلا سڑک پر کھڑا رہ گیا۔ بادشاہ کی سواری گزر گئی۔ اس کے پیچھے اس کا عملہ پیدل آ رہا تھا۔ ان میں سے ایک سپاہی کو راستے میں کہیں سرمہ کی ایک پڑیا مل گئی۔ اتفاق سے اس کی نظر کمزور تھی اور سرمہ کی اسے ضرورت بھی تھی، لہذا اس نے وہ سرمہ بحفاظت اپنے پاس رکھ لیا۔ آنکھوں میں لگانے سے پہلے خیال آیا کہ یہ سرمہ کوئی ضرر نہ

پہنچائے، خود لگانے سے پہلے کسی دوسرے شخص پر آزمالینا چاہئے۔ قریب ہی وہ بچہ کھڑا تھا۔ اس نیاسی پر آزمانا چاہا۔ بچے نے سرمہ اپنی آنکھوں میں لگا لیا مگر جونہی اس نے سرمہ لگایا، اسے زمین کی تہ میں موجود چیزیں بھی نظر آنے لگیں۔ اس نے دیکھا کہ زمین کے اندر بہت سے خزانے پوشیدہ ہیں۔ بچہ ہوشیار تھا اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا کہ سرمہ لگانے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں سخت تکلیف پیدا ہوگئی ہے جب سپاہیوں نے یہ صورتِ حال دیکھی تو سرمہ وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔

بچہ سرمہ کی پڑیا لے کر گھر پہنچا اور خوشی خوشی باپ کو سارا واقعہ بتا دیا۔ سردار بڑا خوش ہوا کہنے لگا ہمارے پاس آدمی بھی ہیں اور گدھے بھی ہیں تم سرمہ لگا ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔ جہاں کہیں خزانہ پا ہمیں بتا ہم نکال لیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بچے کے بتانے پر وہ لوگ خزانے نکالنے لگے اور تھوڑے عرصہ میں وہ امیر آدمی بن گیا۔

بچہ جوان ہوا تو اس نے پر پرزے نکالنے شروع کیے۔ دولت کی فراوانی تھی زمین کے تمام خزانے اس کی نظروں میں تھے۔ اس نے آہستہ آہستہ بہت سے آدمی اپنے ساتھ ملائے۔ اس کے بعد تمام سرداروں کو ادھر ادھر کر دیا اور خود سردار بن گیا۔ آخر نوبت یہاں تک آئی کہ اس نے بادشاہ کے ساتھ بھی ٹکر لے لی۔ اسے مغلوب کر کے خود بادشاہ بن گیا۔

اس بچے کا نام شداد تھا۔ اور یہ وہی بچہ تھا جس کی ماں تختے پر ہی مر گئی تھی۔ اور یہ اکیلا دریا کی لہروں کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب یہ برسرِ اقتدار آیا تو اس نے حکم دیا کہ ایک ایسا کمال درجے کا شہر آباد کیا جائے جس کی ایک اینٹ سونے کی اور ایک اینٹ چاندی کی ہو۔ اس میں ایک عالی شان باغ ہو جس میں دنیا کی ہر چیز میسر ہو۔ جب وہ باغ ہر لحاظ سے مکمل ہو گیا تو شداد نے ارادہ کیا کہ اس کا جا کر نظارہ کرے۔ مگر ابھی وہ دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ ملک الموت کو حکم ہوا اور اس نے وہیں اس کی جان قبض کر لی۔ اسے اتنا موقع بھی نہ دیا کہ اپنے بے مثال باغ کو ایک نظر

دیکھ سکتا۔ ملک الموت نے کہا کہ اے مولا کریم ! اس شخص کی روح قبض کرتے وقت بھی مجھے نہایت صدمہ پہنچا کہ وہ شخص ہر چیز تیار کر کے اسے دیکھ بھی نہ سکا۔ اللہ تعالی نے فرمایا: یہ وہی بچہ ہے جس کی ماں تختے پر مرگئی تھی اور تجھے اس پر ترس آیا تھا۔ اس بچے نے بڑے ہوکرنافرمانی کی، خدا کے حکم سے بغاوت کی، سرکشی اختیار کی۔ مگر ہم نے اسے خودساختہ جنت میں قدم رکھنے کی بھی مہلت نہ دی۔ اور اسے باہر ہی ہلاک کر دیا۔ اسی باغ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دنیا میں موجود ہے۔ مگر انسانی نظروں سے اوجھل ہے امیر معاویہ کے زمانے میں ایک صحابی کا اونٹ گم ہوگیا تھا وہ اونٹ کی تلاش میں کہیں اس علاقے میں جا نکلا، تو اللہ تعالی نے اسے وہ سب کچھ دکھا دیا تھا۔ وہ صحابی وہاں کی کوئی نشانی بھی ساتھ لایا تھا۔ اس نے یہ واقعہ حضرت امیر معاویہ کے پاس بیان کیا انہوں نے کافی تلاش کرایا مگر کسی کونہیں ملا۔ اللہ تعالی نے غائب کر دیا۔

اللہ تعالی نے مغرور اور سرکش لوگوں کی تین مثالیں بیان فرمائیں۔ ان میں ایک قومِ عاد ہے، جو یمن میں آباد تھی۔ دوسری قوم ثمود جو عرب کے شمال میں آباد تھی اور تیسرا فرعون جو مصر میں مقیم تھا۔ اللہ تعالی کا قانون جو پوری کائنات پر حاوی ہے۔

انسانوں کی چار قسمیں ہیں

کل چار قسم کے لوگ ہوتے ہیں جن میں سے تین قسم کے لوگ ناکام ہوتے ہیں اور چوتھا گروہ کامیاب ہوتا ہے۔ قرآن پاک اس مقام پر صرف دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہے جن کی مثال عاد وثمود یا فرعون سے دی گئی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو یا خود بادشاہ تھے یا بادشاہ پرست تھے۔ بادشاہ پرست وہ لوگ ہوتے ہیں جو بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ خواہ بادشاہ کی رائے صحیح ہو یا نہ ہو۔ اور یہ دونوں طبقے ہلاک ہوتے ہیں۔ تیسرا طبقہ زر پرست ہے جسے سرمایہ پرست یا سرمایہ دار بھی کہتے ہیں۔ آیات زیر درس میں اس گروہ کا حال بیان ہو رہا ہے، اور پھر سورۃ کے آخر میں چوتھے گروہ کا حال آئے گا جو کامیاب وکامران ہے اور جس کو فلاح نصیب ہوگی۔ یہ

وہ طبقہ ہے جو ایمان کی دولت سے مالا مال ہے۔اور جس کے دل میں بنی نوعِ انسان کی ہمدردی موج زن ہے۔

زر پرست طبقہ: ارشاد ہوتا ہے: **فَاَمَّا الاِنسَانُ اِذَا مَا ابتَلٰه' رَبُّه'** اس کا رب اسے آزماتا ہے **فَاکرَمَه'** اس کو عزت دیتا ہے ونعمہ اور اس کو نعمت بخشتا ہے **فَیَقُولُ** پس وہ انسان کہتا ہے **رَبِّی اَکرَمن** میرے رب نے میری عزت کی **وَاَمَّا اِذَا مَا ابتَلٰه'** اور بہر حال انسان کو جب اس کا رب آزماتا ہے **فَقَدَرَعَلَیهِ رِزقَه'** اور اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے **فَیَقُولُ رَبِّی اَهانَنِ** تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا ہے۔یہی وہ تیسرا طبقہ ہے کہ جسے جب نعمت ملتی ہے تو خوش ہوتا ہے۔

وَلَو بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزقَ لِعِبَادِه لَبَغَوافِی الاَرضِ اگر اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کیلیے رزق کے یکساں دروازے کشادہ کر دیتا ہے، تو وہ سرکشی میں مبتلا ہو جاتے۔ **وَلٰکِن یُنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَا یَشَآءُ** مگر رزق تو اللہ تعالیٰ اپنے خاص اندازے کے مطابق نازل فرماتا ہے۔اللہ تعالیٰ مصلحت کو بہتر جانتا ہے انسان نہیں سمجھ سکتا۔بعض اوقات خدا تعالیٰ نیکوکار لوگوں کو تنگی میں مبتلا کرتا ہے ان کے درجات بلند کرنا مقصود ہوتا ہے۔اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنے نافرمان بندوں کو آسودگی عطا کر کے ان کی آزمائش کرتا ہے۔

سورۃ الفجر تفسیرِ مظہری سے (صفحہ نمبر ۲۶۰)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رمضان کے بعد افضل روزے ماہِ محرم کے ہیں اور فرض نماز کے بعد افضل نماز تہجد ہے۔تمام مخلوق شفع ہے یعنی ہر مخلوق کا مقابل موجود ہے۔کفر و ایمان ہدایت اور گمراہی، نیک بختی اور بد بختی، رات اور دن، آسمان اور زمین، بر و بحر سورج اور چاند، جن و انس نر اور مادہ لیکن وتر اکیلا اللہ ہے۔مخلوق کے احوال کا باہمی تضاد شفع ہے زندگی اور موت، عزت اور ذلت، عاجزی اور قدرت، کمزور اور قوت، علم اور جہالت، بینائی اور نابینائی، بالنا اور خاموشی غنا اور

فقر اور صفات خداوندی کا انفرادوتر ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم لوگوں کو صرف ضعفا (اہلِ فلاس) کے سبب ہی رزق دیا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فقرا مہاجرین قیامت کے دن دولتمندوں سے چالیس سال پہلے جنت میں جائیں گے۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فقرا جنت میں دولت مندوں سے پانچ سو سال آدھے دن بیشتر جائیں گے۔ اگر فقر اور کمزوری کے ساتھ صبر اور رضا ہو تو ایسا فقر نعمت ہے بے عزتی نہیں۔

سورۃ البلد

اس سورۃ کا نام سورۃ البلد ہے بلد کا معنی ہے شہر۔ اس سورۃ میں ایک رکوع اور بیس آیتیں ہیں۔ یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

سورۃ البلد کا موضوع تفسیرِ معالم العرفان سے (صفحہ نمبر ۳۲۷)

اس سورۃ کا موضوع انسان کا مکلّف ہونا ہے۔ نوعِ انسانی کے وجود کا تقاضا ہے کہ وہ مکلّف ہو، یعنی قانون کی پابندی کرے۔ جب انسان کا مکلّف ہونا ضروری ہو گیا تو پھر اس کے ساتھ جزائے عمل بھی لازم ہے۔ لہذا اس سورۃ میں جزائے عمل کا ذکر بھی ہے۔ تاہم بنیادی طور پر اس سورۃ میں انسان کے مکلّف ہونے کا ہی ذکر ہے کہ اللہ نے انسان کو مہمل پیدا نہیں کیا بلکہ مکلّف بنایا ہے تاکہ وہ قانون کی پابندی اختیار کرے جس کے نتیجے میں اسے ترقی نصیب ہو گی۔

سورۃ البلد تفسیرِ معالم العرفان سے (صفحہ نمبر ۳۲۷)

اس سورۃ میں بلد کا لفظ مذکور ہے جس سے سورۃ کا نام اخذ کیا گیا ہے۔ بلد شہر کو کہتے ہیں اور جس شہر کا اس سورۃ میں ذکرِ خیر آیا ہے وہ مکہ مکرمہ کا شہر ہے۔

مکہ مکرمہ ایسا عزت والا اور برکت والا شہر ہے، دنیا کے کونے کونے سے اللہ سے محبت رکھنے والے لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ عاشقانِ الٰہی کی بستی ہے۔ جب حضور ﷺ

ہجرت کے لئے مکہ مکرمہ کو خیر آباد کہہ رہے تھے، تو زبانِ مبارک سے فرمایا: **مَآ اَطْيَبَكَ مِن بَلَدٍ** (خدا کی قسم تم کتنے پاکیزہ شہر ہو)۔ خدا کی قسم اگر یہ لوگ مجھ کو یہاں سے نہ نکالتے **مَاسَكَنتُ فِي غَيرِكَ** (تو میں تیرے سوا کسی اور شہر میں نہ ٹھہرتا)۔

انسان مکلّف ہے۔ اللہ تعالی کا منشا یہ ہے کہ انسان قوتِ بہمیت پر غالب رکھے، تا کہ اسے ترقی نصیب ہو، اگر ملکیت مغلوب ہوگئی تو انسان ناکام ہو گیا۔ یہ دونوں قوتیں آخرت میں بھی انسان کے ساتھ رہیں گی۔ گویا ان دونوں قوتوں کا تقاضا ہے کہ انسان مہمل نہ ہو بلکہ مکلّف ہو۔

اعشیٰ شاعر سے واقعہ ہے کہ کسی شخص کی کئی لڑکیاں تھیں مگر غریب ہونے کی وجہ سے کوئی ان کا رشتہ لینے کیلئے تیار نہ تھا۔ اسے کسی نے مشورہ دیا کہ اعشیٰ کی دعوت کر ڈالو۔ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ شاعران دنوں میلے میں آیا ہوا تھا۔ اس شخص نے اسے گھر پر کھانے کی دعوت دی اور اس کی خوب خدمت تواضع کی۔ اعشیٰ نے خوش ہو کر اس شخص کی تعریف میں قصیدہ کہہ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ بھی اس کی لڑکیوں کے لئے نکاح کا پیغام دینے لگے۔ چنانچہ مشرکینِ مکہ سمجھتے تھے کہ اگر اعشیٰ کی حضور ﷺ سے ملاقات ہوگئی اور اس نے حضور ﷺ کی شان میں قصیدہ کہہ دیا تو سارا عرب متاثر ہو جائے گا انہوں نے اس شاعر کو حضور ﷺ کے پاس آنے ہی نہیں دیا۔

سورۃ البلد تفسیرِ مظہری سے (صفحہ نمبر ۲۷۲)

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالی فرماتا ہے اے ابنِ آدم اگر تیری زبان ناجائز چیزوں کے لئے تجھ سے کشاکش کرے تو میں نے اس کے خلاف تیری مدد کیلئے دو ڈھکن تجھے دیئے ہیں تو اس کو ڈھکن میں بند کر دے (اور ناجائز بات زبان سے نہ نکال) اور اگر تیری نگاہ ناجائز چیزوں کے لئے تجھ سے کشاکش کر لے تو تیری مدد کیلئے میں نے دو غلاف دے دیئے ہیں تو ان غلافوں میں اس کو بند رکھ اور اگر تیری شرم گاہ ناجائز امور کی طرف تجھے کھینچے تو میں نے تیری مدد کیلئے دو پردے دے دیئے ہیں ان پردوں میں اس کو بند رکھ۔

سورۃ البلد تفاسیرِ صراط الجنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۲۷۹)

حضرت علامہ شیخ عبدالحق دہلوی فرماتے ہیں کہ علما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں نبی کریم ﷺ کے علاوہ اور کسی نبی کی رسالت کی قسم یاد نہ فرمائی۔

جب اللہ تعالی کے حکم سے نبی کریم ﷺ مدینہ پہنچے تو اس مقام کو 7 عظمتیں حاصل ہوئی۔

1۔ وہ مدینہ ہے جو برے لوگوں کو اس طرح دور کرتا ہے جیسے بھٹی لوہے کے میل کچیل کو دور کرتی ہے۔

2۔ اللہ تعالی نے مدینہ کا نام طابہ رکھا ہے۔

3۔ مدینہ منورہ کے دونوں پتھریلے کناروں کے درمیان کی جگہ کو میری زبان سے حرام قرار دیا گیا ہے۔

4۔ بے شک یہ حرم ہے اور امن کا گھوارہ ہے۔

5۔ رسول ﷺ نے دعا فرمائی اے اللہ! جتنی برکتیں مکہ میں نازل کی ہیں اس سے دگنی برکتیں مدینہ میں نازل فرما۔

6۔ میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان کی جگہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔

7۔ جس شخص کو مدینہ میں موت آ سکے تو اسے یہاں ہی مرنا چاہئے کیونکہ یہاں مرنے والوں کی خاص شفاعت ہو گی۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: انسان کا خاموشی پر ثابت رہنا ساٹھ برس کی عبادت سے افضل ہے۔

سورۃ الشّمس

اس سورۃ کا نام سورۃ الشّمس ہے شمس سورج کو کہتے ہیں۔ اس سورۃ میں ایک رکوع اور پندرہ آیتیں ہیں۔ یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

سورۃ الشّمس کا موضوع تفاسیرِ صراط الجنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۲۹۳) : اس سورۃ میں

لوگوں کو نیک اعمال کرنے کی ترغیب دینا اور گناہ کرنے سے ڈرایا گیا ہے۔اس میں اللہ تعالی نے سورج، چاند، دن، رات، آسمان، زمین، انسانوں کے نفس اور اپنی ذات کی قسم ذکر کر کے فرمایا کہ جس نے اپنے نفس کو برائیوں سے پاک کر لیا وہ کامیاب ہو گیا اور جس نے نفس کو گناہوں میں چھپا دیا وہ ناکام ہو گیا۔

سورۃ الشمس تفسیرِ معالم العِرفان سے (صفحہ نمبر ۳۴۸)

اس کائنات میں شریعت کو وہی حیثیت حاصل ہے جو آسمان کو ہے۔آسمان میں بہت سی چیزیں ہیں جیسے ستارے، سورج، سیارے وغیرہ جس طرح یہ انسان کی راہنمائی کرتے ہیں اسی طرح شریعت بھی انسان کے عقائد، اعمال اور اخلاق میں انسان کی راہنمائی کرتی ہے۔آسمان بلند ہے تو شریعت بھی بلندی سے آتی ہے۔جس طرح آسمان میں سورج کو نمایاں حیثیت حاصل ہے اسی طرح شریعت میں نبی ﷺ آفتابِ ہدایت ہیں۔جس طرح ستارے سورج سے روشنی لیتے ہیں اسی طرح نبی آخرالزماں کے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں جن میں براہِ راست آفتاب رسالت سے فیض حاصل ہوتا ہے اور کائنات کے لیے روشنی کا سبب بنتے ہیں۔جس طرح بارش آسمان سے نازل ہوتی ہے اسی طرح خدا کی رحمت کا فیضان بھی عالمِ بالا سے آتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالی نے اپنی معرفت کا تخم انسانوں کے قلوب میں نازل کیا ہے۔

سورۃ الشمس تفسیرِ بصائر القرقان سے (صفحہ نمبر ۱۷۸)

مادیت میں گھس جانے سے پاکیزگی ختم ہو جاتی ہے۔سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۱۷۶، میں اللہ تعالی فرماتا ہے کہ جب وہ ارض یا مادیت میں گھس گیا تو اس کی مثال کتے کی طرح ہے۔بوجھ رکھیں تو بھی ہانپے، بوجھ نہ رکھیں تو بھی ہانپے۔

سورۃ الیل

اس سورۃ کا نام سورۃ الیل ہے۔ رات کو عربی میں لیل کہتے ہیں۔ اس میں ایک رکوع اور اکیس آیتیں ہیں۔ یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

سورۃ الیل کا موضوع تفاسیرِ صراط الجنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۷۰۱) : اس سورۃ میں وہ اوصاف بیان کئے گئے ہیں جن کی وجہ سے انسان کو کامیابی حاصل ہوتی ہے اور جن کی وجہ سے وہ ناکامی کا سامنا کرتا ہے۔

سورۃ الیل تفسیرِ معالم العرفان سے (صفحہ نمبر ۳۸۲)

امام موسیٰ بن عقبہؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر کا واحد خاندان ہے جس کی چار پشتیں صحابی ہیں، یعنی ابوقحافہ، آپ کا پوتا۔ تمام کے تمام جماعتِ صحابہؓ میں داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنا شرف بخشا۔ یہ شرف کسی اور خاندان کو حاصل نہیں ہوا۔

اس آیت کے شانِ نزول کے اعتبار سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی فضیلت مسلم ہے اس سلسلے میں حضورﷺ کی بہت سی احادیث بھی موجود ہیں۔ حدیث اہلِ بیت میں امام محمد جعفر نے اپنے والد امام محمد باقرؒ وہ اپنے والد امام زین العابدین، وہ اپنے والد حضرت امام حسینؓ سے وہ اپنے والد حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ حضورﷺ نے فرمایا: سورج جن چیزوں پر طلوع ہوتا ہے ان میں ابوبکر صدیقؓ سے زیادہ فضیلت والا کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سب سے زیادہ فضیلت بخشی ہے۔

سورۃ الیل تفسیرِ ضیاء القرآن سے (صفحہ نمبر ۵۷۷)

حضورﷺ نے فرمایا: جو لوگ صبح اٹھتے ہیں ان کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ اپنے نفس کو خرید کر اس کو آزاد کر دیتے ہیں اور کچھ لوگ اپنے نفس کو فروخت کر کے اس کو ہلاک کر دیتے ہیں۔

سورۃ الیل تفسیرِ ابنِ عباسؓ سے (صفحہ نمبر ۱۱۵۱)

آپ ﷺ نے ابوبکر کو بتایا کہ بلال کو اللہ کی خاطر تکالیف دی جاتی ہیں تو ابوبکر نے ایک رطل سونا دے کر انہیں خرید لیا۔ مشرکین نے کہا ابوبکرؓ نے ایسا صرف اس وجہ سے کیا ہے کہ بلال کا اس پر کچھ احسان تھا اس پر اللہ تعالی نے فرمایا: اور (اس لئے) نہیں (دیتا کہ) اس پر کسی کا احسان (ہے) جس کا وہ بدلا اتارتا ہے بلکہ اپنے خداوند اعلی کی رضا مندی حاصل کرنے کے لئے دیتا ہے اور وہ عنقریب خوش ہو جائے گا۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں ہر شخص کا جنت اور دوزخ میں ٹھکانہ لکھا جا چکا ہے تو صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ پھر ہم اسی پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا تم عمل کرتے رہو ہر شخص کے لئے آسان کر دیا گیا ہے۔ پھر فرمایا تو جس نے (خدا کے رستے میں مال) دیا اور پرہیز گاری کی اور نیک بات کو سچ جانا اس کو ہم آسان طریقے کی توفیق دیں گے۔

سورۃ الضحٰی

اس سورۃ کا نام سورۃ الضحی ہے عربی میں چاشت کے وقت کو ضحیٰ کہتے ہیں۔ اس میں ایک رکوع اور گیارہ آیتیں ہیں۔ یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

سورۃ الضحٰی کا موضوع تفاسیرِ صراط الجنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۷۱۹)

اس سورۃ میں حضور ﷺ کی شخصیت کے بارے میں کلام کیا گیا ہے۔ اللہ تعالی نے چڑھتے دن اور رات کی قسم ذکر کر کے نبی کریم ﷺ پر کئے گئے کفار کے اعتراض کا جواب دیا۔ اس میں یتیم پر سختی کرنے اور سائل کو جھڑکنے سے منع کیا گیا اور اللہ تعالی کی نعمت کا خوب چرچا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

سورۃ الضحٰی تفسیرِ معالم العرفان سے (صفحہ نمبر ۳۸۷)

ضحیٰ دن کے اس حصے کو کہتے ہیں جب دن روشن ہو جاتا ہے اور اس کی تپش سے ریت گرم ہو جاتی ہے۔ اس وقت جو نماز پڑھی جاتی ہے اس کو چاشت کی نماز کہا جاتا ہے۔ چاشت کے وقت پڑھی جانے والی نماز صلوۃ الاوابین ہے۔ اواب کا معنی ہے خدا کی طرف رجوع کرنے والا۔ سورج کے طلوع ہونے کے تھوڑی دیر بعد جو نماز ادا کی جاتی ہے اسے اشراق کی نماز کہتے ہیں۔ اشراق کے معنی سورج کا چمکنا ہے یعنی سورج چمکتا ہے یا ظاہر ہوتا ہے اسے اشراق کہتے ہیں۔ (چاشت اور اشراق دونوں نفلی نمازیں ہیں)

مغرب کے بعد چھ نوافل کی بڑی فضیلت ہے۔ ابنِ ماجہ شریف سے روایت ہے کہ جو شخص بعد نمازِ مغرب چھ نفل اخلاص کے ساتھ ادا کرے گا اللہ تعالی اس کو بارہ سال کی نمازوں کا اجر عطا فرمائے گا۔

حقیقت میں قرآن حکیم نے حکیمانہ طریقے پر بہت سی باتیں سمجھائی ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے جملوں اور چھوٹی چھوٹی سورتوں میں علم و حکمت کے موتی بکھیرے ہیں اور مختلف طریقوں سے گہری باتیں ذہن نشین کرائی ہیں۔ قرآنِ پاک میں اللہ تعالی نے فرمایا: ایمان نور اور روشنی ہے۔ جب انسان کے باطن پر کفر و شرک کی تاریکی چھا جاتی ہے تو اسکی بصیرت زائل ہو جاتی ہے۔ اسے صحیح بات کی سمجھ ہی نہیں آتی۔ وہ فاسد عقیدے کے اندر ہی پڑا رہتا ہے اور اس کے اعمال بھی فاسد ہو جاتے ہیں۔ جسے ایمان کی دولت نصیب ہو جائے اس کے دل و دماغ میں روشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے وہ نیکی اور بدی میں تمیز کرنے لگتا ہے۔ ایک مسلمہ اصول ہے کہ انسانیت ہمیشہ علم سے ترقی کرتی ہے۔

اسلام کے دو دور ہیں ایک روشن اور دوسرا تاریک۔ خلفائے راشدین کی مثال چاند کی سی ہے

جنہوں نے حضور ﷺ سے روشنی حاصل کر کے دنیا کو منور کیے رکھا۔ تابعین اور تبع تابعین ستاروں کی مانند ہیں جنہوں نے اپنی بساط کے مطابق اسلام کے راستے کو منور رکھا۔

آپ ﷺ کے والد آپ ﷺ کی ولادت سے دو ماہ پہلے صرف تیئس چوبیس سال کی عمر میں وفات پا گئے تھے۔ یعنی آپ ﷺ پیدا ہی یتیم ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یتیم کے سر پر ہاتھ رکھو اور مسکین کو کھانا کھلا، خدا تمہارے دل کی سختی کو دور کر دیگا۔ تنگدلی بہت بری بیماری ہے۔

قرآن پاک کی تعلیمات میں دو چیزوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اول اللہ کی غلامی اور دوسری تعلیم دین کی۔ **لَا اِلٰہ اِلاَّاللّٰہ** کا مطلب ہے صرف اللہ کی عبادت کی جائے۔ چھوٹے بڑے سارے کے سارے اللہ ہی کے غلام ہیں اس لیے انسان کو انسان کی غلامی کسی صورت میں قبول نہیں کرنی چاہئے۔

سورۃ الضحیٰ تفسیرِ ضیاء القرآن سے (صفحہ نمبر ۵۸۸)

امام باقر نے اس شخص سے کہا کہ اے اہلِ عراق تم یہ کہتے ہو کہ قرآنِ کریم کی سب سے امید افزا آیت یہ ہے: **یعبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمتہ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً**۔ لیکن ہم اہلِ بیت یہ کہتے ہیں کہ کتابِ الٰہی میں سب سے زیادہ امید افزا آیت یہ ہے: **ولسوف یُعطیك رَبُّك فترضٰی**۔

علامہ آلوسی نے اس آیت کے ضمن میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک بار حضور عہدِ طفولیت میں اپنے دادا جان سے الگ ہو کر مکہ کی گھاٹی میں چلے گئے حضرت عبد المطلب نے بہت تلاش کیا لیکن آپ ﷺ نہ ملے جس سے آپ کی بے چینی بہت بڑھ گئی اور غلافِ کعبہ کو پکڑ کر بارگاہِ الٰہی میں فریاد کرنی شروع کر دی۔ حضور اسی گھاٹی میں گھوم رہے تھے اسی ثنا میں ابو جہل اپنی اونٹنی پر سوار اپنے ریوڑ کو ہانک کر لا رہا تھا۔ جب اس نے حضور ﷺ کو دیکھا تو اپنی اونٹنی کو بٹھایا اور آپ ﷺ کو اپنے پیچھے

بٹھا لیا اور خود آگے بیٹھ گیا اور اونٹنی کو اٹھنے کا اشارہ کیا لیکن اونٹنی اٹھنے کا نام ہی نہ لیتی۔ بڑی کوششوں کے باوجود بھی اونٹنی نہ اٹھی ابو جہل حیران رہ گیا۔ اللہ تعالی نے اونٹنی کو قوتِ گویائی بخشی اور اس نے کہا **'یا احسق ھو الامام و کیف یکون خلف المقتدی'** اے بیوقوف ! یہ امام ہیں اور امام متقدی کسی کے پیچھے کھڑا نہیں ہوا کرتے ابو جہل نے آپ ﷺ کو اٹھا کر آگے بٹھایا تو اونٹنی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ جس طرح اللہ تعالی نے حضرت موسیٰ کو فرعون کے ذریعے اپنی والدہ تک پہنچایا تھا اسی طرح اللہ تعالی نے اس امت کے فرعون ابو جہل کے ذریعے حضور ﷺ کو اپنے جدِ امجد تک پہنچایا۔

اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو عیال دار پایا (کیونکہ ساری امت حضور کی عیال ہے) تو غنی کر دیا یا آپ کو تنگ دست پایا تو غنی کر دیا۔ ظاہری غنی کی صورت یہ تھی کہ حضرت خدیجہ نے اپنی جان، اپنا سارا مال حاضر کر دیا اور اپنے تمام رشتہ داروں کی موجودگی میں یہ اعلان کر دیا کہ یہ مال اب میرا نہیں بلکہ ان کا ہے۔ چاہے تو ابھی تقسیم کر دیں چاہے اپنے پاس رکھیں۔ ام المومنین حضرت خدیجہ کے وصال کے بعد حضرت صدیقِ اکبر نے اپنا سارا مال و متاع حضور ﷺ کی خدمت کے لئے وقف کر دیا، حقیقی غنی وہ ہے جو اللہ تعالی نے بلا واسطہ ارزانی فرمائی۔ قلبِ مبارک کو غنی کر دیا اور زمین کے سارے خزانوں کی کنجیاں مرحمت فرما دیں اور کائنات کی ہر چیز کو تابعِ فرمان فرما دیا۔

ایک دن حضور ﷺ کا شانہ اقدس میں تشریف لائے مسلسل فاقہ کشی کے باعث شکمِ مبارک کمر کے ساتھ پیوست ہو گیا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت عائشہ بے تاب ہو گئیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے شکمِ مبارک کو بوسہ دیا اور عرض کی یا رسول اللہ: اپنے رب سے اتنا تو مانگیے کہ یوں فاقوں کی نوبت تو نہ آئے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے عائشہ ! اگر میں چاہوں تو یہ سارے پہاڑ سونے کے بن کر میرے ساتھ چلنا شروع کر دیں۔ حضور ﷺ کا یہ فقر، فقرِ اضطراری نہ تھا بلکہ فقرِ اختیاری تھا۔

سائلوں سے برافروختہ وہ ہوتا ہے جس کو اپنے سرمایہ کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ جب آپ کے رب نے آپ کو غنی کر دیا ہے تو یہ خزانے کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ پھر آپ کسی سائل کو کیوں جھڑکیں یا سائلوں کی کثرت سے تنگ دل کیوں ہوں۔ آپ کو آپ کے رب نے بے شمار دولتیں اور بے حساب نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ آپ انہیں سائل کی استعداد کے مطابق بانٹتے رہیں۔ آپ کے در پر آنے والا کوئی سائل خالی نہ جائے۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے کبھی کسی سائل کے جواب میں 'لا' (نہیں) نہ فرمایا۔

ایک مرتبہ ایک انصاری بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوا۔ اس نے عرض کی کہ اے اللہ کے پیارے رسول ! بے دریغ خرچ فرمایا کیجئے اور عرش والے پروردگار سے قلت کا خوف مت کیجئے۔ یہ سن کر حضورﷺ خوشی سے ہنس پڑے۔ چہرہ مقدس پھول کی طرح شگفتہ ہو گیا۔ ارشاد فرمایا کہ میرے رب نے مجھے یہی حکم دیا ہے۔

ہر نعمت کا شکر واجب ہے اور شکر کا طریقہ یہ ہے کہ اس نعمت کو منعم (نعمت دینے والے) کی رضا میں صرف کیا جائے۔ نعمتِ مال کا شکر یہ ہے کہ وہ اللہ تعالی کے راستے میں خلوص نیت کے ساتھ اسے خرچ کرے۔ صحت کی نعمت کا شکر یہ ہے کہ فرائض کو ادا کرے اور گناہوں سے مجتنب رہے اور علم وعرفان کی نعمت کا شکر یہ ہے کہ جاہلوں کو علم سکھائے اور گم کردہ راہوں کو راہِ راست پر گامزن کرے۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہے: اگر کوئی چیز گم ہو جائے تو اس سورۃ کو انسان سات بار پڑھے اور اپنے سر کے اردگرد انگشتِ شہادت پھیرتا رہے۔ جب سات بار پڑھ چکے تو کہے اصبحت فی امان اللہ وامسیت فی جوار اللہ۔ امسیت فی امان اللہ واصبحت فی جوار اللہ۔ خوانده دستک زنند۔ اور تالی بجائے۔

سورۃ الضحیٰ تفسیرِ انوار البیان سے (صفحہ نمبر ۴۱۴)

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ "اور لیکن سوال کرنے والے کو مت جھڑکیے۔ جس طرح یتیم بچہ بے یارومددگار ہوتا ہے اس کے لئے رحمت اور شفقت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح بعض مرتبہ غیر یتیم بھی حاجت مند ہو جاتا ہے اور حاجت مندی اسے سوال کرنے پر مجبور کر دیتی ہے جب کوئی سوال کرنے آئے تو اسے کچھ دے کر خوشی سے رخصت کیا جائے اگر اپنے پاس کچھ دینے کے لئے نہ ہو تو کم از کم اس سے نرمی سے بات کریں تاکہ اس کی تکلیف میں اضافہ نہ ہو۔ سائل کو جھڑکنا ظلم و زیادتی کی بات ہے ایک تو اس کو کچھ دیا نہیں اور پھر اوپر سے جھڑک دیا، یہ اہلِ ایمان کی شان کے خلاف ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے: **رُدُّ وَالسَّائِلَ وَلَوبِظِلفِ مُحَرَّقِ** سوال کرنے والے کو کچھ دیکر واپس کیا کرو اگرچہ جلا ہوا کھر ہی ہو۔

سورۃ الضحیٰ تفسیرِ ابنِ عباسؓ سے (صفحہ نمبر ۱۱۵۵)

جب کچھ دیر کے لئے وحی نہ آئی تو حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کے انتہائی خوف کو دیکھ کر آپ ﷺ سے ناراض ہو گیا ہے۔

حضرت خولہؓ کہتی ہیں کہ آپ کے گھر ایک کتیا کا بچہ چارپائی کے نیچے گھسا اور وہیں مر گیا۔

نبی ﷺ پر کئی دن وحی نازل نہ ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا اے خولہؓ میرے گھر میں کیا ہوا ہے؟ جبرئیلؑ میرے پاس نہیں آ رہے۔ خولہ کہتی ہیں کہ بہتر ہوتا کہ میں گھر میں جھاڑو دے کر سامان درست کر دیتی۔ پھر میں نے جھاڑو کو چارپائی کے نیچے بڑھایا تو وہاں کوئی بھاری چیز پڑی تھی میں نے اسے جھاڑو کے ذریعے نکالا تو وہ مرا ہوا کتیا کا بچہ تھا میں نے اسے دیوار کے پیچھے پھینک دیا۔ نبی ﷺ ادھر سے آئے آپ ﷺ کے دانت بج رہے تھے جب آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو آپ ﷺ پر کپکپی طاری ہو جاتی اور آپ ﷺ فرما رہے تھے اے خولہ مجھے چادر اوڑھا دو۔

سورۃ الم نشرح

اس سورۃ کا نام سورۃ الم نشرح ہے نشرح کا معنی کشادگی ہے۔اس سورۃ میں ایک رکوع اور آٹھ آیتیں ہیں۔یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

سورۃ الم نشرح کا موضوع تفاسیرِ صراط الجنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۷۳۶)

اس سورۃ میں آپ ﷺ کو عطا کی گئی نعمتیں بیان کی گئیں کہ اللہ تعالی نے آپ کی خاطر ہدایت، معرفت، نصیحت، نبوت اور علم وحکمت کے لئے آپ کے سینۂ اقدس کو کشادہ اور وسیع کر دیا اور شفاعت قبول کئے جانے والا بنا کر آپ کے اوپر سے امت کے گناہوں کے غم کا وہ بوجھ دور کر دیا جس نے آپ کی پیٹھ توڑی تھی اور آپ کی خاطر آپ کا ذکر بلند کر دیا۔

سورۃ الم نشرح تفسیرِ معالم العرفان سے (صفحہ نمبر ۴۰۸)

اس سورۃ میں شرح کا لفظ مذکور ہے اسی لفظ سے سورۃ کا نام اخذ کیا گیا ہے۔النشر اح کا معنی کشادگی ہے۔اس سورۃ میں جس شرح صدر کا ذکر ہے وہ ظاہری نہیں بلکہ باطنی شرح صدر ہے۔باطنی شرح صدر سے مراد دل کی کشادگی ہے۔

ظاہری شرح صدر یہ ہے کہ حضور ﷺ کے سینہ مبارک کو چار دفعہ چاک کیا گیا ہے۔پہلی شرح صدر کے وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک چار سال تھی۔آپ ﷺ کا سینہ مبارک چاک کر کے قلبِ مبارک کو نکالا گیا اور صاف کر کے دوبارہ اپنی جگہ پر رکھ دیا گیا۔یہ آپ ﷺ کی زندگی میں شرح صدر کا پہلا واقعہ تھا۔شرح صدر کا دوسرا واقعہ اس وقت پیش آیا جب حضور ﷺ کی عمر مبارکِ دس سال تھی۔دس سال کی عمر جوانی کی آمد آمد ہوتی ہے اس عمر میں جس قسم کے انسان کے خیالات ہوتے ہیں ان کو صاف کرنے کے لئے اللہ تعالی نے شرح صدر کا یہ انتظام کیا۔سینہ چاک ہونے کا تیسرا واقعہ اس وقت پیش آیا جب آپ ﷺ کو نبوت ملنے کا وقت بالکل قریب تھا تا کہ آپ ﷺ کے اندر نبوت کا بھار اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہو۔اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک چالیس سال

تھی۔ چوتھا شرح صدر آپ ﷺ کے معراج پر روانگی کے وقت پیش آیا۔ معراج پر غیر معمولی واقعات پیش آنے والے تھے اس لئے شرح صدر ضروری تھا تا کہ آپ ﷺ کسی قسم کی گھبراہٹ وغیرہ محسوس نہ کریں۔

جماعت بندی کا حکم

نبی ﷺ نے فرمایا: اگر تین آدمی بھی کسی بستی یا دیہات میں موجود ہوں اور وہ نماز باجماعت ادا نہ کریں تو ان پر شیطان غالب آجاتا ہے۔ مقصد یہ کہ جس مقام پر صرف تین آدمی بھی ہوں تو ان پر جماعت لازم ہو جاتی ہے۔

حضور ﷺ نے تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ پیر کے روز آپ ﷺ کو نبوت عطا ہوئی اور دوسرے روز یعنی منگل کے دن آپ ﷺ نے نماز باجماعت ادا کی۔ آپ ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت علی، ام المومنین حضرت خدیجہ اور آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام اور حضرت زید تھے۔

جب آپ ﷺ نے قریش مکہ سے معاہدہ حدیبیہ کی صورت میں طے کر لیا تھا تو آپ اس دور کے بادشاہوں کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کو خطوط لکھے جن میں اسلام کی دعوت دی۔ آپ ﷺ نے سب کو لکھا کہ میں آپ کو اسلام کی دعوت دے رہا ہوں، اگر اسلام قبول کرو گے تو سلامتی پاؤ گے۔ اس زمانے میں جتنے بھی بادشاہ تھے آپ ﷺ نے سب کو خطوط لکھے۔ ان تمام خطوط کو جمع کیا گیا اور ہندوستان کے جلیل القدر عالم حضرت مولانا حفیظ الرحمٰن سیوہارویؒ کی کتاب مکاتیب سید المرسلین میں محفوظ کیا گیا۔

سورۃ الم نشرح تفسیرِ ضیاء القرآن سے (صفحہ نمبر ۶۰۱)

یہاں انہوں نے حضرت فاروقِ اعظم کا ایک پر از حکمت ارشاد نقل کیا ہے۔ اسے پیشِ خدمت کرتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ آپ اسے خوبصورت لکھ کر ایسی جگہ آویزاں کریں گے

جہاں اکثر آپ کی نظر پڑتی ہے۔

اِنِی لَاکرَہُ اَن اَریٰ اَحدَکُم فَارغًا سَبهللاً لَا فِی عَمَلِ دُنیَاہُ وَلَا فِی عَمَلِ آخِرتِه (روح المعانی)

یعنی میں اس بات کو سخت ناپسند کرتا ہوں کہ میں تمہیں نکما بیٹھے ہوئے دیکھوں۔ نہ تم دنیا کا کوئی کام کرر ہے ہواور نہ تم اپنی آخرت کو سنوار رہے ہو۔

سورۃ الم نشرح تفسیر بصائر الفرقان سے (صفحہ نمبر ۸۸۸)

ہر چیز کی بنیاد، روحانیت اور نورانی علم ہیں۔

لَا اِلٰه الاالله کی ادائیگی سے جلال پیدا ہوتا ہے، **محمد الرسول الله** پڑھنے سے جمال بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔

لا الٰہ الا اللّٰہ کی ادائیگی کے بعد ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ رب کی ذات پاک کا جلال ماحول پر چھا جاتا ہے اور انسان کا 'اضطراب' بڑھنے لگتا ہے، تو ساتھ جب الفاظ **محمد الرسول الله** ادا کیے جائیں تو جمال وارد ہوتا ہے۔ انسان جہاں رب کی ذات کے ورا، ورا ہونے کے اثرات سے رب کی ذات کی اپنے شہ رگ کی نزدیکی کے باوجود پھر بھی خوف سے دور ہی سمجھتا ہے۔ لیکن اللہ تعالی کے حبیب ﷺ کی رسالت کے الفاظ سے ساری اجنبیت دور ہو جاتی ہے۔ انسان اپنایت میں سکون محسوس کرنے لگتا ہے۔ تو اپنے حبیب ﷺ کے ذکر کو بلندی عطا کرنے والی بات کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

اللہ تعالی اپنے حبیب ﷺ کی وساطت سے اعلان کر کے انسان کو اس کی مشکلات کے سلسلے میں تسلی دیتے ہیں کہ زندگی ایک امتحان ہے۔ بے شک اربوں سالوں کی کائنات کی زندگی میں اور اس کائنات میں انسانی سفر کا مشکل ترین حصہ، یہ دنیاوی سفر ہے۔ ہم بہتر زندگی سے دنیا میں مشکل زندگی میں وارد ہوئے ہیں۔ اس کے بعد دوبارہ بہتر زندگی میں چلے جائیں گے۔ ہمارے

آقا ﷺ نے اس زندگی کو مومن کیلئے قید کا نام دیا ہے۔

سورۃ التین

اس سورۃ کا نام سورۃ التین ہے عربی میں انجیر کو التین کہتے ہیں۔اس سورۃ میں ایک رکوع اور آٹھ آیتیں ہیں۔یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

سورۃ التین کا موضوع تفسیرِ معالم العرفان سے (صفحہ نمبر ۴۲۱)

اس سورۃ کی ابتدا میں اللہ تعالی نے چار چیزوں کی قسم اٹھا کر انسان کی تخلیق کا ذکر فرمایا ہے کہ اس نے انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا ہے۔اس سے بہتر صورت اللہ نے کسی مخلوق کو عطا نہیں کی۔اس کی مزید تفصیل یہ ہے کہ اگر انسان اپنے فرائضِ منصبی کو ادا کرتا ہے تو واقعی وہ کائنات کی بہترین ہستی ہے اور اگر وہ ان فرائض کی بجا آوری نہیں کرتا تو پھر اس سے بڑھ کر ذلیل چیز بھی دنیا میں کوئی نہیں ہوسکتی۔ایسا انسان کائنات کی حقیر سے حقیر چیز سے بھی بدتر ہوجاتا ہے۔

سورۃ التین تفسیرِ معالم العِر فان سے (صفحہ نمبر ۴۲۳)

اللہ تعالی نے چار چیزوں سے انسان کی تخلیق کی۔پہلی چیز انسان کا جسم، دوسری چیز روح، تیسری چیز ملکیت اور چوتھی چیز محبت الہی۔

عیسی بن موسی خلیفہ منصور عباسی کا ایک درباری چاندنی رات میں اپنی بیوی سے گفتگو کر رہا تھا۔ اچانک اس نے اپنی بیوی سے کہا اگر تو چاند سے زیادہ حسین نہ ہو تو تجھ پر تین طلاقیں تو اس نے کہہ دی مگر اس کا نتیجہ دور تھا۔بات خلیفہ کے دربار تک پہنچی کہ ایسا کہنے سے واقعی طلاق ہوگئی ہے یا نہیں۔علما سے فتوی لیا گیا، تو انہوں نے کہا کہ طلاق پڑگئی ہے کیونکہ عورت چاند سے حسین نہیں ہو سکتی۔دربار میں امام ابوحنیفہ کے ایک شاگرد بھی موجود تھے۔خلیفہ خاص طور پر ان کی طرف متوجہ

ہوئے کہ وہ بھی اپنی رائے دیں تو انہوں نے بسم اللہ شریف پڑھ کر سورۃ التین کی تلاوت کی اور کہا کہ اللہ تعالی نے انسان کو احسنِ تقویم فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے انسان جیسی کوئی ہستی کائنات میں پیدا ہی نہیں کی تو چاند ایک انسان سے زیادہ بہتر کیسے ہو سکتا ہے۔ لہذا عورت چاند سے زیادہ حسین ہے اور اس پر طلاق نہیں پڑی۔ یہ سن کر سب لوگ مطمئن ہو گئے کہ حقیقت یہی ہے کہ انسان بہترین مخلوق ہے مگر اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض منصبی فطری امور کے مطابق ادا رے۔

سورۃ التین تفسیرِ مظہری سے (صفحہ نمبر ۳۰۴)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جنت میں کوئی اس وقت تک نہ جائے گا جب تک اس کو اس کی دوزخ والی جگہ نہ دکھا دی جائے یہ دوزخ والی جگہ اس کے لئے اس وقت ہوتی جب وہ بدی کا مرتکب ہوتا۔ ایسا اس لیے کیا جائے گا کہ وہ زیادہ شکر ادا کرے۔ اور دوزخ میں کوئی اس وقت تک نہ جائے گا جب تک اس کو اس کی جنت والی جگہ نہ دکھا دی جائے یہ جگہ اس کے لئے اس وقت ہوتی جب وہ نیکوکار ہوتا ایسا اس کی حسرت بڑھانے کے لئے کیا جائے گا۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب مسلمان جسمانی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اللہ فرشتے کو حکم دیتا ہے کہ اس کے لئے (اب بھی) وہی نیک عمل لکھ جو وہ (صحت کی حالت میں) کرتا تھا۔

سورۃ التین تفسیرِ انوار البیان سے (صفحہ نمبر ۴۲۱)

حدیثِ مبارکہ: اللہ تعالی پاک ہے جس نے مردوں کو داڑھیوں کے ذریعہ اور عورتوں کو سر کے بالوں کے ذریعہ زینت دی۔

کسی بھی چہرے کو غور سے دیکھیں تو اس میں خاص ایک چمک، نور نظر آئے گا جو کہ مظہرِ خدا ہے۔

سورۃ التین تفسیرِ بصائرالفرقان سے (صفحہ نمبر ۸۹۲)

مختصر الفاظ میں جامع بیان قرآن کی خصوصیت ہے:

قرآن پاک کی شان کا ایک پہلو یہ ہے کہ بیانات جتنے مختصر الفاظ یا اختصار کے ساتھ ہوں گے مفہوم میں اتنی زیادہ گہرائی ہوتی ہے اور بیانات کے باطن میں بھی جھانکنا ضروری ہو جاتا ہے۔

سورۃ العلق

اس سورۃ کا نام سورۃ العلق ہے علق عربی میں خون کے لوتھڑے کو کہتے ہیں۔اس سورۃ میں ایک رکوع اور انیس آیتیں ہیں۔یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

سورۃ العلق کا موضوع تفسیرِ ضیاء القرآن سے (صفحہ نمبر ۶۰۹)

یہ سورۃ دو حصوں پر مشتمل ہے۔پہلی پانچ آیتیں جبریل امین لے کر پہلی مرتبہ غارِ حرا میں تشریف لائے اور پہلی وحی آ کر تعلیم کی۔سورۃ کا دوسرا حصہ بعد میں اس وقت نازل ہوا جب حضور ﷺ نے حرم شریف میں نماز پڑھنی شروع کی۔حضور کا اندازِ عبادت اہلِ مکہ کیلیے بالکل انوکھا تھا۔لوگ دیکھ کر حیران ہوتے اور گزر جاتے۔لیکن ابو جہل جو جہالت اور اجڈ پن میں اپنی مثال آپ تھا، وہ اس اندازِ عبادت کو دیکھ کر ضبط نہ کر سکا اور دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔اس کی حماقت اور حرماں نصیبی پر ناراضگی کا اظہار فرمایا جا رہا ہے۔

سورۃ العلق تفسیرِ معالم العرفان سے (صفحہ نمبر ۴۳۶)

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ توحید کے چار درجے ہیں۔ان میں سے دو درجوں میں تو تمام انسان متفق ہیں۔اور دو میں اہلِ توحید اور مشرک مختلف ہو جاتے ہیں۔متفق والے درجات میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق اور اس کا واجب الوجود ہونا ہے۔دہریوں کی ایک قلیل تعداد کے سوا اہلِ توحید، کافر، مشرک اور دیگر تمام اہلِ مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ خالق صرف خدا تعالیٰ کی

ذات ہے۔

توحید کے دوسرے دو درجے جن میں اختلاف پایا جاتا ہے وہ ہیں تدبیر اور عبادت یہاں آ کر مشرکین اہلِ توحید سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اہلِ ایمان کا عقیدہ ہے کہ مدبر بھی صرف ذاتِ خداوندی ہے۔ مگر مشرکین اس میں دوسروں کو بھی شریک کر لیتے ہیں جب ان سے پوچھا جاتا ہے تدبیر کون کرتا ہے دوسری جگہ ارشاد ہے بلندیوں سے پستیوں تک ہر چیز کی تدبیر اللہ ہی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی تدبیر کرنے والا نہیں ہے۔ مگر یہاں حالت یہ ہے کہ کوئی انبیا کرام علیہم السلام کو تدبیر میں شریک کرتا ہے، کوئی جنات کو، کوئی فرشتوں کو اور کوئی دیگر مخلوق میں سے کسی اور کو کہ یہ بھی کچھ تدبیر کرتے ہیں لہذا شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم عام طور پر زبانی ہوتی ہے اور اعلیٰ تعلیم قلم کے ذریعے سے حاصل کی جاتی ہے۔

خاتم النبیین ﷺ کو بغیر قلم کے وہ تعلیم دی جو کسی دوسرے انسان کو عطا نہیں کی۔ اگر قلم نہ ہوتا تو لوگ تمام علوم، تاریخ اور سابقہ لوگوں کے علمی کارناموں سے بے خبر رہتے۔ یہ قلم ہی ہے جس نے ان سب چیزوں کو محفوظ رکھا۔

قرآن کا موضوع (SUBJECT) انسان ہے اور قرآن پاک یہی چیز بیان کرتا ہے کہ انسان کا کمال کس چیز میں ہے اور زوال کس بات میں، کونسی چیزیں انسان کو ترقی کی منازل پر پہنچاتی ہیں اور کونسی چیزیں اور اصول انسان کو انسانیت کے درجے سے گرا دیتی ہیں۔

اگر کوئی علم ہے تو وہ صرف وحیِ الٰہی کا علم ہے جس کی ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

جو شخص قرآنی تعلیم سے اعراض کرتا ہے اس کے حصول میں رکاوٹ ڈالتا ہے وہ طاغی کہلاتا ہے۔ طاغی کا معنی سرکش ہے کیونکہ طغیان کا معنی سرکشی یعنی حد سے بڑھنا ہے۔

کائنات میں کوئی چیز مستغنی نہیں ہے سارے کے سارے انسان محتاج ہیں۔ صرف ذاتِ خداوندی ہی واحد ذات ہے جو ہر لحاظ سے مستغنی ہے۔

زبانیہ پکڑنے والے یا دھکیلنے والے کو کہتے ہیں جو پکڑ کر یا باندھ کر جیل میں ڈال دیں۔اس دنیا میں زبانیہ حضورﷺ کے پیروکاروں کو بتایا گیا جنہوں نے نہایت بہادری اور جرت کے ساتھ کفار کا مقابلہ کیا اور مشرکوں کو مارا۔ان میں انصارِ مدینہ بھی شامل ہیں۔آخرت میں زبانیہ سے مراد اللہ کے فرشتے ہیں جو مجرموں کو پکڑ کر لے جائیں گے۔

سورۃ العلق تفسیر مظہری سے (صفحہ نمبر ۳۰۸)

نبیﷺ پر چالیس سال کی عمر میں نبوت کا نزول ہوا نبوت کے تین سال تک حضرت اسرافیلؑ ساتھ رہے اور آپ کو ہر بات اور ہر چیز کی تعلیم دیتے رہے مگر حضرت اسرافیلؑ کی زبانی قرآنِ مجید نازل نہیں ہوا۔ جب تین سال گزر گئے تو حضرت جبرائیلؑ کا تعلق آپ کی نبوت سے ہوا اور بیس سال تک حضرت جبرائیلؑ کی زبانی قرآنِ مجید اترتا رہا۔

انسان ساری کائنات کا مجموعہ ہے۔جو کچھ اس سنسار میں موجود ہے وہ سب انسان میں موجود ہے اسی لئے انسان کو عالمِ صغیر کہا جاتا ہے۔ پس انسان کو پیدا کرنے کے یہ معنی ہوئے کہ سارے جہان کی ہر چیز کو پیدا کر دیا۔

تعلیم تحریر کا ذکر تحریر کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ سیکھنے کی اصل غرض یہ ہے کہ سیکھنے والا یاد رکھے اور علوم باقی رہے اور علوم کا تحفظ اکثر تحریر کی وجہ سے ہی ہوتا ہے۔سب سے اول لکھنے والے حضرت ادریس تھے (یعنی تحریر حرفی حضرت ادریس کی ایجاد ہے)۔

جب رسول اللہﷺ نے مانا بقاری کہا اور (ہر بار) حضرت جبرائیلؑ نے آپ کو پکڑ کر اتنی زور زور سے دبایا کہ آپ بے طاقت ہو گئے اور اقر کہا اور تین بار 'اقراء' کہنے سے اللہ نے آپ کو اولین و آخرین سب علوم عطا فرما دیئے۔کیونکہ بندوں کے تمام افعال کا خالق تو اللہ ہی ہے۔

سورۃ القدر

اس سورۃ کا نام سورۃ القدر ہے قدر کے بہت سے معنی ہیں البتہ یہاں قدر سے عظمت

وشرافت مراد ہے۔اس سورۃ میں ایک رکوع اور پانچ آیتیں ہیں۔

سورۃ القدر کا موضوع تفاسیرِ صراط الجنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۷۷۳) : اس سورۃ میں قرآنِ مجید نازل ہونے کے ابتدائی زمانے کے بارے میں بتایا گیا اور جس رات میں قرآن مجید نازل ہوا اس کی فضیلت بیان کی گئی کہ یہ رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے، اس رات میں فرشتے اور حضرت جبرئیلؑ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اترتے ہیں اور یہ رات صبح طلوع ہونے تک سراسر سلامتی والی ہے۔

سورۃ القدر تفسیرِ مظہری سے (صفحہ نمبر ۳۱۷)

شبِ قدر میں پورا قرآن لوح محفوظ سے دنیوی آسمان کے بیت العزت میں نازل کر دیا گیا تھا پھر (بیت العزت سے) حضرت جبرائیلؑ بیس برس تک تھوڑا تھوڑا رسول اللہ ﷺ کو پہنچاتے رہے آیت 'بِمَوَاقِعِ النُّجُومُ' کا یہی مطلب ہے۔حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت ابراہیم کے صحیفے تیسری رمضان کو اور ایک روایت میں آیا ہے کہ پہلی رمضان کو نازل ہوئے اور توریت موسیٰ چھٹی رمضان کو اور انجیل تیرہویں رمضان کو اور زبور داد اٹھارہویں رمضان کو اتاری گئی اور قرآن رسول اللہ ﷺ پر چوبیسویں رمضان کو جبکہ رمضان کی چھ راتیں باقی تھیں نازل کیا گیا۔

امام احمد اور طبرانیؒ نے حضرت وایلہ بن الاسقع کی حدیث نقل کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے صحیفے رمضان کی پہلی رات کو نازل ہوئے اور توریت چھٹی رمضان کو اور انجیل تیرہویں رمضان کو اتری اور قرآن چوبیسویں کو انہی احادیث کی بنا پر بعض علما نے کہا کہ شبِ قدر رمضان کی چوبیسویں رات ہے۔حضرت ابن مسعودؓ، شعبی حسن بصریؒ اور قتادہ کی طرف اس قول کی نسبت کی گئی ہے اس کی تائید حضرت بلال کی اس مرفوع حدیث سے ہوتی ہے جس کو امام احمد نے نقل کیا ہے کہ شبِ قدر کو چوبیسویں تاریخ میں تلاش کرو۔

تعیین شبِ قدر کے متعلق علما کے اقوال مختلف ہیں جن کی کل تعداد تقریباً چالیس ہے۔صحیح یہ ہے کہ ہر سال شبِ قدر رمضان کے آخری عشرہ میں ضرور ہوتی ہے مگر تاریخیں بدلتی رہتی ہیں۔(ہر سال کیلیئے ایک ہی تاریخ مقرر نہیں ہے)

ابوداؤد طیالسی نے حضرت ابوسعید خدریؓ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ شبِ قدر چوبیسویں رات ہے۔حضرت ابی بن کعب کو تو اس پر یقین تھا اور آپ نے اس پر قسم کھائی تھی کسی نے پوچھا ابومنذر آپ کس وجہ سے اس کے قائل ہیں فرمایا اس علامت کی وجہ سے جو رسول اللہ ﷺ نے ہم کو بتائی تھی کہ اس روز صبح کو سورج بغیر شعاعوں کے طلوع ہوتا ہے۔رواہ مسلم۔

حضرت عمرؓ حضرت حذیفہؓ اور بکثرت دوسرے صحابیوں کا یہ قول ابنِ ابی شیبہ نے روایت کیا ہے اور اس قول کی تائید میں حضرت ابوہریرہؓ کی وہ روایت پیش کی جاتی ہے جس میں حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا تھا کہ ہم باہم شبِ قدر کا ذکر کر رہے تھے اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں کسی کو یاد ہے کہ جب کہ چاند شگاف چشم کی طرح نکلا تھا (یعنی پتلا خمیدہ چھوٹا کم نور) ابوالحسن فارسی نے کہا مراد ستائیسویں شب ہے کیونکہ اس رات کو چاند کی یہی حالت ہوتی ہے۔ابوالحسن نے کہا اس سے مراد ہے چاند کے وقت کا پورا ہو جانا (جس کے بعد چاند ڈوب جاتا ہے پھر برآمد نہیں ہوتا) اور یہ ستائیسویں شب کو ہوتا ہے۔

حضرت عثمان غنیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے جماعت کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی اس نے گویا نصف شب کا قیام کیا اور جس نے جماعت کے ساتھ فجر کی نماز بھی پڑھی اس نے گویا پوری رات عبادت کی۔

مستحب ہے کہ شبِ قدر میں **اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عفو تحب العفو فاعف عنی** کا ورد زیادہ کرے۔

سورۃ القدر تفسیرِ انوار البیان سے (صفحہ نمبر ۴۳۳)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے فجر کی نماز جماعت سے پڑھ لی گویا اس نے آدھی رات نماز میں قیام کیا اور جس نے عشا کی نماز باجماعت پڑھ لی گویا اس نے پوری رات نماز پڑھ لی۔

سورۃ البینۃ

اس سورۃ کا نام سورۃ البَیِّنَۃ ہے بینہ کا معنی ہے روشن اور بہت واضح دلیل۔ اس سورۃ میں ایک رکوع اور آٹھ آیتیں ہیں۔ یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

سورۃ البینۃ کا موضوع تفاسیرِ صراط الجنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۷۷۹)

اس سورۃ میں یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں کے مذہب کا باطل ہونا بیان فرمایا گیا۔ اہلِ کتاب میں دین کے معاملے میں پھوٹ کس وقت پڑی اور تورات وانجیل میں انہیں دیئے گئے احکام بیان کئے گئے۔ اس سورۃ میں بتایا گیا جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے تو وہی تمام مخلوق میں سب سے بہتر ہیں، اس کے بعد ان کی جزا بیان کی گئی۔

سورۃ البینۃ تفسیرِ معالم العِرفان سے (صفحہ نمبر ۱۷۴)

اس آیت میں حنفآ کا جو لفظ آیا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے: **حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَیْرَ مُشْرِكِیْنَ**۔ یعنی خالص اللہ کی عبادت کرنیوالے بن جا، شرک کرنے والے نہ بنو۔ حضرت ابراہیمؑ نے بھی اپنی قوم سے فرمایا تھا اور حضور ﷺ بھی یہی ارشاد فرما رہے ہیں کہ حنیف بن جا۔ حنیف دراصل حضرت ابراہیمؑ کا لقب ہے اور معنی اس کا یہ ہے کہ ہر طرف سے توجہ ہٹا کر صرف ایک خدا کی طرف متوجہ ہونا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ حنیف اسے کہا جاتا ہے جو

اللہ کی توحید کا قائل ہو۔ بیت اللہ شریف کا حج کرنے والا ہو، نماز پڑھنے والا ہو۔ یہی توحید کا مقام ہے اور ایسے ہی انسان کو حنیف کہا جاتا ہے۔ بدنی عبادت میں نماز سرِفہرست ہے اور یہ ام العبادات لمقربہ یعنی قربِ الٰہی دلانے والی عبادتوں میں نماز پہلے نمبر پر ہے۔ نماز خدا پرستی کی نشانی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بینہ کا لفظ معجزہ پر بھی بولا ہے۔ معجزہ بھی ایک واضح چیز ہوتی ہے اس لیے بینہ کا اطلاق معجزات پر بھی ہوتا ہے۔ پیغمبر کی ذات بھی اللہ تعالیٰ کی واضح نشانی ہوتی ہے اور پھر خاتم الانبیاء علیہ السلام اور آپ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ تو یہاں پر دو مرتبہ بینہ کے لفظ کا اطلاق کیا گیا ہے اس سے مراد پیغمبر علیہ السلام کا وجود مبارک اور آپ ﷺ کی ہستی ہے۔ حضور ﷺ نے اپنے صحابی حضرت ابی بن کعب سے فرمایا: **اِنَّ رَبِّی عَزَّوَجَلَّ اَمَرَنِی اَن اُقرِئَكَ هٰذِهِ السُّورَةَ۔** اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں لم یکنِ الذین کفروا پڑھا دوں۔ ابی بن کعب نے عرض کیا حضور ! کیا اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی میرے متعلق فرمایا ہے آپ ﷺ نے اثبات میں جواب دیا تو ابی بن کعب آبدیدہ ہو گئے کہ مجھ جیسے معمولی ہستی کے آدمی پر اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا احسان فرمایا۔ اب رہا یہ سوال کہ حضرت ابی بن کعب کو اس منصب کے لیے کیوں منتخب کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے آپ کے بارے میں فرمایا تھا **اَقرَأُ هُم اُبی بن کَعبٍ** یعنی میری امت میں سب سے بڑا قاری ابی بن کعب ہے۔ گویا آپ تمام قاریوں کے سردار ہیں۔ اسی طرح مفسرین کے سردار عبداللہ بن عباس سب سے بڑے قاضی حضرت علی ہیں۔ امت میں سب سے زیادہ حیادار حضرت عثمان ہیں۔ خدا کے معاملے میں سب سے زیادہ سختی کرنے والے عمر بن خطابؓ ہیں سب سے زیادہ رحیم اور کریم حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں۔ حلال وحرام کو سب سے زیادہ بہتر جاننے والے حضرت معاذ بن جبل ہیں اور علم فرائض اور وراثت کو سب سے زیادہ جاننے والے حضرت زیدؓ ہیں۔

انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ایک مومن جو کامل طریقے پر اللہ کی اطاعت کرتے ہیں۔اس کی وحدانیت کو مانتے ہیں قیامت پر یقین رکھتے ہیں۔انسانوں کی دوسری قسم وہ ہے جو طاغی کہلاتے ہیں۔یہ لوگ خدا کی وحدانیت کو نہیں مانتے۔ان کے اندر نہ ایمان ہے اور نہ یہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں بلکہ وہ مومن کی اس حد تک مخالفت کرتے ہیں کہ اسے نماز بھی نہیں پڑھنے دیتے۔وہ لوگ تو قرآن پاک کی آواز تک سننا نہیں چاہتے۔اس لیے وہ مخالفت کرتے ہیں۔

حضورﷺ پر جب یہ سورۃ نازل ہوئی اس زمانے میں جو مذاہب دنیا میں موجود تھے ان میں یہود، نصاریٰ اور صابی تھے۔صابی ستارہ پرست تھے اور تعداد میں نسبتاً کم تھے۔صابیوں کو بعض اہلِ کتاب میں شمار کرتے ہیں اور بعض مشرکوں میں۔ان کے علاوہ مجوسیوں کا مذہب تھا۔یہ لوگ ایران کے آتش پرست تھے اس زمانے میں آدھی دنیا ان کے زیرِ نگیں تھی۔باقی آدھی دنیا قیصر کے زیرِ اثر تھی۔قیصر عیسائی اور کسریٰ مجوسی تھا۔مجوسی آگ میں کرشمہ مانتے ہیں اور اس کی عبادت کرتے ہیں۔پانچواں فرقہ مشرکین عرب کا تھا۔یہ لوگ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کا متبع کہتے تھے کہ ہم ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے ہیں اور ان کا اتباع کرتے ہیں۔یہ پانچوں کے پانچوں باطل فرقے تھے۔قرآن پاک میں ان پانچوں کا ذکر موجود ہے۔

مشرکین کا حشر تو یہ ہوا کہ کچھ مارے گئے کچھ چلے گئے اور باقیوں نے اسلام قبول کر لیا۔مگر مدینہ طیبہ اور اسکے اطراف میں یہودی اسی طرح ڈٹے رہے۔یہودیوں کے دس بڑے عالم تھے۔ایک موقع پر حضورﷺ نے فرمایا کہ اگر یہ دس آدمی مسلمان ہو جائیں تو کوئی یہودی باقی نہ رہے سارے کے سارے اسلام قبول کر لیں۔مگر ان دس اشخاص میں سے صرف ایک نے اسلام قبول کیا باقی یہودیت پر قائم رہے اور اسی باطل عقیدہ پر ان کا خاتمہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ** اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کرتا ہے۔اے اہلِ کتاب **اَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ** تم میں سے اکثر

فاسق ہیں۔ جنہوں نے تفرقہ کیا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے یہ بات اشار سمجھا دی کہ پہلے یہود و نصاری کے بہتر (۷۲) فرقے بنے اور میری امت کے تہتر (۷۳) فرقے ہونگے۔ جن میں سے صرف ایک ناجی ہوگا، باقی سب آگ میں جائیں گے صحابہ نے پوچھا کہ ناجی فرقہ کون ہوگا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **مَا اَنَا عَلَیهِ وَاَصحَابِی** ناجی فرقہ وہ ہوگا جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقے پر ہوگا۔ باقی سب دوزخی ہوں گے۔

سورۃ البینۃ تفسیرِ مظہری سے (صفحہ نمبر ۳۲۳)

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِینَ اُوتُوا الکِتٰبَ اِلَّا مِن بَعدِ مَا جَآءَتهُمُ البَیِّنَةُ

یعنی رسول اللہ ﷺ کے آنے کے بعد ہی رسول پر ایمان لانے کے متعلق اہلِ کتاب کے اندر اختلاف پیدا ہوا اور نہ آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے تو آنے والے رسول کی تصدیق پر سب کا اتفاق تھا اور سب بعثت نبی ﷺ کے منتظر تھے کافروں کے خلاف نبی منتظر کے وسیلے سے فتح کی دعا کرتے تھے لیکن جب وہ جانا پہچانا نبی آ گیا تو محض حسد اور عناد کی وجہ سے اس کی تصدیق نہیں کی۔

اِنَّ الَّذِینَ کَفَرُوا مِن اَهلِ الکِتٰبِ وَالمُشرِکِینَ۔ یہ ان کا اسم ہے۔

فِی نَارِ جَهَنَّمَ۔ یہ اِن کی خبر ہے۔

خٰلِدِینَ فِیهَا۔ یہ (جار مجرور) ظرف کے فاعل سے حال ہے یعنی جن اہلِ کتاب اور مشرکوں نے کفر کیا وہ جہنم کی آگ میں ہوں گے (اور) اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اُولٰٓئِكَ هُم شَرُّ البَرِیَّةِ۔ مذکورہ اوصاف والے ہی تمام مخلوق یہاں تک کہ سوروں اور کتوں سے بھی بدتر ہیں۔

اِنَّ الَّذِینَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُم خَیرُ البَرِیَّةِ۔ اور ایمان دار نیکوکار سب مخلوق سے یعنی بے گناہ فرشتوں سے بھی بہتر ہیں۔ اسی جگہ سے علما نے کہا کہ خاص درجات والے انسان خاص درجات والے ملائکہ سے افضل ہیں اور عام انسان یعنی صاف دل اور

پاک نفس رکھنے والے ایماندار نیکوکار عام ملائکہ سے افضل ہیں رہے غیر صالح (گناہ گار) مومن تو جب مغفرت سے یا گناہ ہونے کی سزا دے کر ان کو گناہوں سے پاک کر دیا جائے گا تو عمل صالح رکھنے والے مومنوں کے ساتھ ان کو ملا دیا جائے گا اور وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے (اور گناہوں سے پاک ہونے کے بعد وہ عام ملائکہ سے افضل ہو جائیں گے)۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنھُم۔ جنّات اور **جنّات** کے اندر جو خدا دا نعمتیں ہوں گی یہ (رضا خداوندی کی) نعمت سب سے بڑھ کر ہوگی۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ جنت والوں سے فرمائے گا اے ساکنان جنت ! اہلِ جنت جواب دیں گے لبیک ربنا وسعدیک والخیر کلہ فی یدیک اللہ فرمائے گا کیا تم راضی ہو اہلِ جنت عرض کریں گے پروردگار ہمارے ناخوش رہنے کی کیا وجہ ہے تو نے تو ہم کو وہ چیزیں عطا فرمادیں جو تیری مخلوق میں کسی اور کو نہیں دی گئیں۔ اللہ فرمائے گا کیا ان سے بھی بڑھیا چیز میں تم کو نہ دوں اہلِ جنت عرض کریں گے پروردگار ! ان سے اعلی چیز کیا ہوگی۔ اللہ فرمائے گا میں تم پر اپنی رضامندی نازل کرتا ہوں آئندہ کبھی تم سے ناراض نہیں ہوں گا۔

وَرَضُوا عَنہ۔ بغوی نے لکھا ہے کہ بندہ کی رضا خدا سے دو طرح ہے ایک رضا کے بعد ب آتی ہے رضی بہ دوسری رضا کے بعد عن آتا ہے رضی عنہ۔ اول کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے رب اور مدبر کائنات ہونے پر بندہ راضی ہے دوسرے کا یہ معنی ہے کہ اللہ کے قضا و قدر سے بندہ خوش ہے۔

قضائے الٰہی پر اعتراض نہ کرے اور اس بات کا یقین رکھے کہ اللہ جو کچھ کرتا ہے واقع میں وہ اچھا ہی ہوتا ہے اگرچہ ہم کو اس کی خوبی معلوم نہ ہو اس قسم کی رضا تمام بندوں کیلئے اللہ کے ہر فیصلہ پر لازم ہے خواہ ان کی طبیعت کو پسند ہو یا ناپسند لیکن اگر کسی بندہ سے کوئی گناہ صادر ہو جائے یا کسی دوسرے سے گناہ یا کفر کا صدور ہو جائے تو انسان سے صدور کفر و معصیت اگرچہ اللہ کے ارادہ اور تخلیق سے ہی ہوتا ہے مگر انسانی کسب اور فعل کو اس میں دخل ہوتا ہے اس لئے بحیثیت کسب و عمل

بندہ کو بھی اس پر راضی ہونا چاہئے کیونکہ خدا کو بندہ کا کفر و عصیان پسند نہیں۔

سورۃ الھُمَزۃِ

اس سورۃ کا نام سورۃ الھمزۃِ ہے۔ ھمزہ کا معنی ہے لوگوں کے منہ پر عیب نکالنے والا۔ اس سورۃ میں ایک رکوع اور نو آیتیں ہیں۔ یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

سورۃ الھمزِۃ کا موضوع تفاسیر صِراط الجِنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۸۲۱) : اس سورۃ میں غیبت کرنے والے اور عیب نکالنے والے کیلئے آخرت میں شدید عذاب کی خبر دی گئی ہے۔ اور ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو دنیا کا مال جمع کرنے کے ایسے حریص ہیں جیسے انہوں نے دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے اور یہ بتایا گیا کہ انہیں جہنم کے اس درکہ (یعنی طبقے) میں پھینکا جائے گا جہاں آگ ان کی ہڈیاں پسلیاں توڑ ڈالے گی۔

سورۃ الھمزۃ تفسیرِ مظہری سے (صفحہ نمبر ۳۴۵)

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہزار برس تک آگ بھڑکائی گئی یہاں تک کہ سرخ ہوگئی پھر ہزار برس تک بھڑکانے کے بعد سفید ہوگئی پھر ہزار برس تک بھڑکائی گئی تو سیاہ ہوگئی اب وہ سیاہ تاریک ہے۔ ترمذی۔

بدن میں دل سب سے زیادہ لطیف اور الم پذیر ہے یا یہ وجہ کہ غلط عقائد کا محل اور برے اعمال کا سرچشمہ قلب ہی ہے گویا یہی آتش جہنم کی پیدائش گاہ ہے۔

سورۃ الکوثر

اس سورۃ کا نام سورۃ الکوثر ہے۔ کوثر سے دنیا اور آخرت کی بے شمار خوبیاں مراد ہیں اور جنت کی ایک نہر کا نام بھی کوثر ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع اور تین آیتیں ہیں۔ یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

سورۃ الکوثر کا موضوع تفاسیرِ صراط الجنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۸۴۴)

اس سورۃ کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے اس فضل و احسان کا بیان ہے جو اس نے اپنے حبیب ﷺ پر فرمایا۔ دوسری آیت میں نبی کریم ﷺ سے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کے شکریے میں نماز پڑھتے رہیں اور قربانی کریں۔ تیسری آیت میں فرمایا گیا کہ جو اللہ تعالیٰ کے حبیب ﷺ کا دشمن ہے وہی ہر خیر سے محروم ہے۔

سورۃ الکوثر تفاسیرِ معالم العِرفان سے (صفحہ نمبر ۵۷۵)

حضور ﷺ نے فرمایا کوثر ایک نہر ہے جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے کیا ہے وہ مجھے عطا فرمائے گا۔ اس کا پانی بڑا ٹھنڈا اور میٹھا ہوگا اس کے کنارے جو گلاس اور آنجورے ہوں گے۔ ان کی تعداد آسمان کے ستاروں کے برابر ہوگی۔ اس پانی کی تاثیر یہ ہوگی کہ جو شخص اس میں سے پی لے گا اسے حشر کے تمام عرصہ میں پیاس نہیں لگے گی۔

آپ ﷺ نے حضرت امام حسینؓ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا کہ حسین **سِبطٌ مِّنَ الاَسباطِ** ہیں۔ یعنی آپ قبیلوں میں سے ایک بڑا قبیلہ ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا: **اٰلُ مُحَمَّدٍ کُلُّ تَقِیٍ۔** ہر مومن متقی میری آل میں شامل ہے۔ گویا آپ ﷺ کی معنوی اولاد شمار سے باہر ہے۔ اتنی کسی دوسرے نبی کو نصیب نہیں ہوگی۔

قرآنِ پاک ایسا خیر کثیر ہے کہ اس قرآن پاک کا فیض نسلاً بعد نسل اور طبقاً بعد طبق دنیا میں پھیلتا رہے گا۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ جو آدمی دنیا میں جسقدر قرآن کریم سے فیضیاب ہوگا۔ اسی نسبت سے اس کو حوضِ کوثر پر پانی نصیب ہوگا۔ لہٰذا تمام اہلِ ایمان کو قرآن کریم کی اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیئے۔ اس کے علاوہ علوم و فنون سلطنت خزانے اور نماز کو بھی خیر کثیر میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ تمام چیزیں خیرِ کثیر کے تحت آتی ہیں۔

سورۃ الکوثر تفاسیرِ صراط الجنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۸۴۵)

کوثر کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، ان سب اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ اے محبوب ! بیشک ہم نے تمہیں بے شمار خوبیاں عطا فرمائیں اور کثیر فضائل عنایت کر کے تمہیں تمام مخلوق پر افضل کیا، آپ کو حسنِ ظاہر بھی دیا حسنِ باطن بھی عطا کیا، نسبِ عالی بھی، نبوت بھی، کتاب بھی، حکمت بھی، علم بھی، شفاعت بھی، حوضِ کوثر بھی، مقامِ محمود بھی، امت کی کثرت بھی، دین کے دشمنوں پر غلبہ بھی، فتوحات کی کثرت بھی اور بے شمار نعمتیں اور فضیلتیں عطا کیں جن کی انتہا نہیں۔
تاجدارِ رسالت ﷺ پر یہ عطا کسی عبادت اور ریاضت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان پر یہ عطا اللہ تعالی کے عظیم فضل اور احسان کی وجہ سے ہے کیونکہ یہاں عطا کا ذکر پہلے ہوا اور عبادت کا ذکر بعد میں ہوا۔

سورۃ الکوثر تفسیرِ انوار البیان سے (صفحہ نمبر ۴۶۳)

حضرت ابنِ عباسؓ سے یہی منقول ہے اسی خیر کثیر میں سے نہر کوثر بھی ہے جو اللہ تعالی نے نبی اکرم ﷺ کو عطا فرمائی۔
حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں (شبِ معراج) میں جنت میں چل پھر رہا تھا اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نہر ہے اس کے دونوں جانب موتیوں کے بنائے ہوئے ایسے قبے ہیں کہ موتیوں کو اندر سے تراش کر ایک ایک موتی کا ایک ایک قبہ بنا دیا گیا ہے۔ میں نے دریافت کیا اے جبرائیل یہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ کوثر ہے جو آپ کے رب نے آپ کو عطا فرمائی ہے۔اس کے اندر کی مٹی بہت تیز خوشبودار مشک ہے۔
حضرت عبداللہ بن عمروؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت سیدِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے حوض کا طول اور عرض اتنا زیادہ ہے کہ اس کے ایک طرف سے دوسری طرف جانے کیلئے ایک ماہ کی مدت درکار ہے اور اس کے گوشے برابر ہیں۔ (یعنی طول وعرض دونوں برابر ہیں) اس کا پانی دودھ

سے زیادہ سفید ہے اور اس کی خوشبو مشک سے زیادہ عمدہ ہے اور اس کے لوٹے اس قدر ہیں جتنے آسمان کے ستارے ہیں، جو اس میں سے پئیے گا کبھی پیاسا نہ ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میرا حوض اس قدر عریض و طویل ہے کہ اس کی دو طرفوں کے درمیان اس فاصلہ سے بھی زیادہ فاصلہ ہے جو ایلہ سے عدن تک ہے۔ سچ جانو وہ برف سے زیادہ سفید اور اس شہد سے زیادہ میٹھا ہے جو دودھ میں ملا ہوا ہو، اور اس کے برتن ستاروں کی تعداد سے زیادہ ہیں اور میں (دوسری امتوں) کو اپنے حوض پر آنے سے ہٹاں گا، جیسے (دنیا میں) کوئی شخص دوسرے کے اونٹوں کو اپنے حوض سے ہٹاتا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا اس روز ہم آپ کو پہچانتے ہوں گے؟ ارشاد فرمایا ہاں (ضرور پہچان لوں گا اس لئے کہ) تمہاری ایک علامت ہوگی جو کسی اور امت کی نہ ہوگی۔ اور وہ یہ کہ تم حوض پر میرے پاس اس حال میں آ گے کہ وضو کے اثر سے تمہارے چہرے روشن ہوں گے اور ہاتھ پاؤں سفید ہوں گے۔

دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ آسمان کے ستاروں کی تعداد میں حوض کے اندر سونے چاندی کے لوٹے نظر آ رہے ہوں گے۔

سورۃ الکوثر تفسیرِ بصائرالفرقان سے (صفحہ نمبر ۹۵۵)

کسی زبان میں کثرت یا کثیر کے لفظ کو اسم صفت کے طور پر انگریزی گرامر کے لحاظ سے Adjective کے طور پر معنی میں ایسی ڈگری تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔ جیسے کثرت یا کثیر کو یہاں عربی زبان میں کوثر تک پہنچایا گیا ہے۔

کتاب السنہ ابوداد میں حضرت ابو برزہ اسلمیؓ نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ انہوں نے حضور پاک ﷺ سے حوض کوثر کے بارے ایک نہیں، دو نہیں، تین نہیں، چار نہیں، پانچ نہیں، بار بار سنا جو اس کو جھٹلائے اللہ تعالیٰ اسے اس کا پانی نہ نصیب کرے۔

سورۃ الکٰفرون

اس سورۃ کا نام سورۃ الکٰفرون ہے۔ اس میں ایک رکوع اور چھ آیتیں ہیں۔ یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

سورۃ الکٰفرون کا موضوع تفاسیرِ صراط الجِنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۸۴۹): اس سورۃ مبارکہ میں مشرکوں کے عمل سے بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے اور کافروں کی اس امید کو ختم کر دیا گیا ہے کہ مسلمان اپنے دین اور اللہ تعالی کی عبادت کے معاملے میں کبھی ان سے سمجھوتہ کریں گے۔

سورۃ الکٰفرون تفاسیرِ صراط الجِنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۸۵۱)

سورۃ الکفرون کے شانِ نزول سے حاصل ہونے والی چند معلومات یہ ہے۔

(1) کفار سے دینی صلح حرام بلکہ کئی صورتوں میں کفر ہے۔

(2) کفار کے بتوں اور ان کے مذہبی ایام کی قابلِ تعظیم سمجھتے ہوئے ان کی تعظیم کرنا کفر ہے۔

(3) مومن کے دم میں کفار کی ہیبت نہیں ہونی چاہیئے۔

(4) کفار کو شرعی عذر کے بغیر اچھے القاب سے یاد نہ کیا جائے۔

(5) کافر کو بوقتِ ضرورت موقع محل کی مناسبت سے کافر کہنا درست بلکہ اسلوبِ قرآنی کے موافق ہے۔

سورۃ الکٰفرون تفسیرِ ضیاء القرآن سے (صفحہ نمبر ۶۹۱)

رحمتِ عالم ﷺ نے جب دعوت توحید کا آغاز کیا تو ابتدا میں کفار نے اس کو درخور اعتنا ہی نہ سمجھا، لیکن سعادت مند روحیں اس کی طرف جب کھچ کھچ کر جانے لگیں انہیں اپنے ماحول میں تبدیلی کے کچھ آثار دکھائی دینے لگے تو انہوں نے اس دعوت کی طرف توجہ دینی شروع کی۔ انہوں

نے سوچا کہ ہمارے پاس بے پناہ وسائل ہیں۔اس دائمی حق کو خریدنے کیلئے ہم بڑی سے بڑی قیمت ادا کر سکتے ہیں، چنانچہ حضرت ابوطالب کی معرفت سودا بازی کا آغاز ہوا۔کفار کے ایک وفد نے جناب ابوطالب سے ملاقات کی اور آ کر کہا کہ آپ کا بھتیجا ہمارے بتوں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کرتا ہے وہ ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہیں، آپ قوم کے سردار ہیں ہمارے دلوں میں آپ کا ازحد احترام ہے۔اسی وجہ سے ہم آپ کے بھتیجے کی باتیں سن کر اب تک خاموش رہے ہیں لیکن اب پیمانہء صبر لبریز ہو چکا ہے۔آپ اپنے بھتیجے کو کہیں کہ اگر اس کو مال و دولت کی خواہش ہے تو ہم سونے چاندی کا ڈھیر اس کے قدموں میں لگانے کیلئے تیار ہیں۔اگر اس کو حاکم بننے کا شوق ہے تو ہم متفقہ طور پر اس کو اپنا رئیسِ اعلیٰ تسلیم کرنے پر رضامند ہیں اور اگر کوئی رشتہ مطلوب ہے تو وہ صرف اشارہ کر دیں ہم فخر و مسرت کے ساتھ وہ رشتہ پیش کر دیں گے۔حضور ﷺ نے جب ان کی یہ پیشکش سنی تو فرمایا کہ وہ نادان مجھے پہچان نہیں سکتے۔میرے دائیں ہاتھ پر اگر وہ سورج لا کر رکھ دیں اور بائیں ہاتھ پر چاند لا کر رکھ دیں تو بھی میں اپنے رب کی توحید کی تبلیغ میں رائی برابر بھی سستی نہیں کروں گا۔اس تکرار کا مدعا یہ ہے کہ کفار کو ہمیشہ کیلئے مایوسی ہو جائے کہ مسلمان ان کے کفر کو ایک لمحے کیلیے بھی قبول نہیں کریں گے۔نیز ان کے بارے میں بتا دیا کہ وہ کبھی مسلمان نہیں ہوں گے۔

سورۃ الکٰفِرون تفسیرِ انوار البیان سے (صفحہ نمبر ۴۶۸)

ایک روایت میں ہے کہ قریش مکہ میں جو بہت سرکش لوگ تھے انہوں نے کہا اے محمد آ ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں اس سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ شانہ کے سوا کسی کی عبادت کروں، کہنے لگے کہ آپ اتنا کیجئے ہمارے بعض معبودوں کو بوسہ دے دیجئے ہم آپ کی تصدیق کر لیں گے اور ہم آپ کے معبود کی عبادت کرنے لگیں گے۔اس پر سورۃ الکفرون

نازل ہوئی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سورۃ اذا زلزلت نصف قرآن کے برابر ہے اور سورۃ قل ھو اللہ احد تہائی قرآن کے برابر ہے اور سورۃ **قُل یَاَیُّھَا الکَافِرُون** چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔

حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فجر کی دو سنتوں میں **قُل یَااَیُّھَا الکٰفِرون** اور **قُل ھُوَاللّٰہُ احد** پڑھی۔

حضرت ابنِ عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مغرب کی نماز میں **قُل یَااَیُّھَا الکٰفِرون ، قُل ھُوَاللّٰہُ احد** پڑھتے تھے۔(رواہ ابنِ ماجہ) اور عبد اللہ بن مسعودؓ نے بیان کیا کہ میں نہیں شمار کر سکتا کہ کتنی مرتبہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے مغرب کے بعد والی دو رکعتوں میں فجر سے پہلے دو رکعتوں میں **قُل یَااَیُّھَا الکٰفِرون** اور **قُل ھُوَاللّٰہُ احد** پڑھتے ہوئے سنا۔

سورۃ النصر

اس سورۃ کا نام سورۃ النصر ہے۔عربی میں مدد کو نصر کہتے ہیں۔اس سورۃ میں ایک رکوع اور تین آیتیں ہیں۔یہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔

سورۃ النصر کا موضوع تفاسیرِ صراط الجنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۸۵۳):اس سورۃ مبارکہ میں حضور ﷺ کو فتحِ مکہ کی بشارت دی گئی اور یہ بتایا گیا کہ عنقریب لوگ گروہ دینِ اسلام میں داخل ہوں گے اور آخری آیت میں نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالی کی تعریف اور پاکی بیان کرتے رہنے اور امت کیلئے مغفرت کی دعا مانگنے کا حکم دیا گیا۔

سورۃ النصر تفاسیرِ صراط الجنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۸۵۵)

سورۃ النصر کے نازل ہونے کے بعد 80 دن حضور ﷺ نے دنیا میں تشریف رکھا، پھر آیہء **اَلکَلٰلَةِ** نازل ہوئی، اس کے بعد حضورِ اقدس ﷺ 50 دن دنیا میں تشریف فرما رہے۔ پھر آیت **وَاتَّقُوا یَومًا تُرجَعُونَ فِیهِ اِلَی اللّٰهِ** نازل ہوئی، اس کے بعد

حضورِ اکرم ﷺ 21 دن یا 7 دن دنیا میں تشریف فرما رہے۔

سورۃ النصر تفسیرِ انوار البیان سے

حضرت عائشہؓ نے بیان فرمایا کہ آپ اپنی آخر عمر میں **سُبحَانَ اللّٰہِ وبِحمدِہٖ استغفِراللّٰہ واتوب اِلیہِ** کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔اور حضرت ام سلمہؓ نے بیان کیا کہ آپ اپنی زندگی کے آخری ایام میں اٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے سبحان اللہِ وبحمدِہٖ پڑھا کرتے تھے میں نے جو اس بارے میں آپ سے سوال کیا تو آپ نے جواب دیا کہ مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے، پھر آپ نے **اِذَا جَآءَ نَصرُ اللّٰہِ وَالفتحُ** کو آخر تک تلاوت فرمایا۔تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہاں الفتح سے فتح مکہ مراد ہے۔

حضرت عمرؓ حضرت ابنِ عباسؓ کو مشائخ بدر کی مجلس میں ساتھ بٹھایا کرتے تھے۔بعض حضرات کو ناگوار ہوا کہ ان کو ہمارے ساتھ مجلس میں کیوں بٹھاتے ہیں (حالانکہ نوعمر ہیں) اوران جیسے ہمارے لڑکے بھی ہیں انہیں ہمارے ساتھ مجلس میں کیوں نہیں بٹھاتے؟ حضرت عمرؓ کو پتہ چلا تو ایک دن ان حضرات کی موجودگی میں حضرت ابنِ عباسؓ کو بلایا اولا ان حضرات سے پوچھا کہ بتا **اِذَا جآءَ نصر اللّٰہِ وَالفَتحُ** میں کیا بات بتائی گئی ہے ان میں بعض نے تو خاموشی اختیار کی اور بعض نے جواب دیا کہ اس میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب اللہ کی مدد آجائے اور مما لک فتح ہو جائیں تو اللہ کی حمد کریں اور استغفار میں مشغول رہیں۔حضرت عمرؓ نے حضرت ابنِ عباسؓ سے کہا کیا بات اسی طرح ہے؟ حضرت ابنِ عباسؓ نے کہا نہیں۔فرمایا تم کیا کہتے ہو؟ حضرت ابنِ عباسؓ نے عرض کیا کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کی وفات کی خبر دی گئی ہے۔حضرت عمرؓ نے فرمایا میں بھی اس سورۃ کا مطلب یہی سمجھتا ہوں۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص سے دریافت فرمایا کیا تم نے نکاح نہیں کیا؟ انہوں نے عرض کیا کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں، کیسے نکاح کروں؟ فرمایا کیا سورۃ

قُل ھُوَاللّٰہُ اَحَد نہیں ہے، عرض کیا ہاں ہے، فرمایا وہ چوتھائی قرآن ہے پھر فرمایا کہ کیا تیرے پاس **قُل یَاَیُّھَا الکفِرُون** نہیں ہے، عرض کیا ہاں وہ میرے پاس ہے۔ فرمایا وہ چوتھائی قرآن ہے۔ پھر فرمایا کہ کیا تیرے پاس سورۃ اذا زلزلت الارض نہیں ہے۔ عرض کیا ہاں ہے فرمایا وہ چوتھائی قرآن ہے۔ تم نکاح کرلو۔ ان سورتوں کی برکت سے اللہ تعالی تمہارا نکاح کردے گا۔

سورۃ اللھب

اس سورۃ کا نام سورۃ اللھب ہے۔ لہب کا معنی ہے آگ کا شعلہ۔ اس سورۃ میں ایک رکوع اور پانچ آیتیں ہیں۔ یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔

سورۃ اللھب کا موضوع تفاسیرِ صراط الجنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۸۵۸) : اس سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ سید المرسلین ﷺ سے دشمنی رکھنے اور انہیں ایذا پہنچانے کی وجہ سے ابولہب دنیا میں ذلت ورسوائی کے ساتھ ہلاک ہوگا اور آخرت میں اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور اسی طرح اس کی بیوی بھی اس عذاب میں اس کے ساتھ ہوگی کیونکہ وہ اس دشمنی میں اس کی مددگار تھی۔

سورۃ اللھب تفاسیرِ صراط الجنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۸۵۷)

دشمنانِ خدا کو جوابدہی سنتِ رسول ہے، اور دشمنانِ رسول کو جواب دینا سنتِ الٰہیہ ہے۔ (**فِی جِیدِھَا حَبلٌ مِن مَّسَدٍ**: اس کے گلے میں کھجور کی چھال کی رسی ہے۔) اُمِ جمیل کے گلے میں کھجور کی چھال سے بنی ہوئی رسی ہوتی جس سے وہ کانٹوں کا گٹھا باندھتی تھی۔ ایک دن یہ بوجھ اٹھا کر لا رہی تھی کہ تھک کر آرام لینے کیلئے ایک پتھر پر بیٹھ گئی ایک فرشتے نے اللہ تعالی کے حکم سے اس کے پیچھے سے اس گٹھے کو کھینچا، وہ گرا اور اُمِ جمیل کو رسی سے گلے میں پھانسی لگ گئی اور وہ مرگئی۔

سورۃ اللھب تفسیرِ ضیاء القرآن سے (صفحہ نمبر ۱۰۷)

ابولہب حضور کا حقیقی چچا تھا۔ نیز یہ بنی ہاشم کا رئیس تھا۔ حضور ﷺ بھی ہاشمی تھے۔ خونی اور خاندانی قریبی تعلقات کے علاوہ وہ حضور سرورِ عالم ﷺ کا پڑوسی تھا۔ دونوں مکانوں میں صرف ایک دیوار حائل تھی۔ حضور اپنے گھر میں جب مصروف عبادت ہوتے تو وہ مردہ جانوروں کے بدبودار اوجھ، گلی سڑی آنتیں اٹھا کر لاتا اور حضورؐ پر پھینک دیتا۔ گھر کے آنگن میں کوڑا کرکٹ ڈالنا اور جہاں ہنڈیا پک رہی ہوتی وہاں غلاظت پھینکنا اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ صرف اسی پر بس نہیں، اس کی بدبخت بیوی کا نام اروہ تھا اور کنیت امِ جمیل تھی۔ یہ ابوسفیان کی بہن تھی اور بھینگی تھی۔ وہ امارت ووجاہت کے باوصف خود جنگل میں جاتی اور خاردار ٹہنیاں چنتی، ان کا گٹھا اپنے سر پر اٹھا کر لاتی اور رات کے وقت حضور کی راہ میں ڈال دیتی تاکہ آخر شب جب حضور حرم کی طرف تشریف لے جائیں، تو آپ کے نرم ونازک پاں میں کوئی کانٹا ہی چبھ جائے۔ جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو یہ سن کر آگ بگولا ہوگئی اور اپنی مٹھیوں میں سنگریزے بھر کر حضور کی تلاش میں نکلی کہ جہاں ملیں گے ان پتھروں سے خبرلوں گی۔ حضور ﷺ کعبہ کے پاس بیٹھے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ حاضرِ خدمت تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب اس کو آتے ہوئے دیکھا تو عرض کی یارسول اللہ ! امِ جمیل آرہی ہے اور یہ ضرور کوئی خباثت کرے گی۔ حضور نے ارشاد فرمایا وہ مجھے نہ دیکھ سکے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا وہ قریب آکر حضور کو نہ دیکھ سکی اور بڑبڑاتے ہوئے واپس چلی گئی۔ ارشاد فرمایا جس آگ میں اس کا گستاخ خاوند جلایا جائے گا اسی آگ میں وہ بھی جھونکی جائے گی۔

اعلان نبوت سے پہلے حضور ﷺ کی دوصاحبزادیاں اس کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کے ساتھ بیاہی گئی تھیں۔ جب سرورِ عالم نے اسلام کی تبلیغ شروع کی تو اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو بلایا اور واشگاف الفاظ میں کہا کہ اگر تم ان کی بیٹیوں کو طلاق نہیں دو گے تو تمہاری میری بول چال، لین دین، آنا جانا قطعاً بند ہوجائے گا۔ تم میرا منہ بھی نہ دیکھ سکو گے۔ چنانچہ دونوں نے حضور کی

صاحبزادیوں کو طلاق دے دی اور عتیبہ نے اپنے خبثِ باطن کا کچھ زیادہ ہی مظاہرہ کیا۔ کہنے لگا میں والنجم اذا ھوی کے رب سے کفر کرتا ہوں۔ اس ناپاک نے روئے انور پر تھوکنے کی جسارت کی جو لوٹ کر اسی کے قبیح منہ پر آ پڑی۔ حضور کی زبان سے نکلا الٰہی اپنے کتوں میں سے ایک کتا اس ناہنجار پر مقرر فرمادے۔ چنانچہ ایک سفر میں ایک شیر نے اسے پھاڑ ڈالا، لیکن نہ اس کا ناپاک خون پیا اور نہ اس کے پلید گوشت کو کھایا۔

ابولہب نے ہاشمی ہوتے ہوئے حضور کی مخالفت کی اور اس بائیکاٹ میں کفار مکہ کا ساتھ دیا۔ یہ کمبخت ہر ایسے موقع پر پہنچ جاتا اور چلا چلا کر لوگوں کو کہتا کہ اے لوگو ! یہ میرا بھتیجا ہے، یہ دیوانہ ہو گیا ہے، اس کے قریب مت جانا، اس کی بات ہرگز نہ سننا ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے۔ یہ اتنی شدت سے ہی اسلام کی مخالفت میں سرگرم رہا کرتا۔

تَــبَّ کا لفظ خسران، نامرادی اور بربادی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ غیبت، چغلی اور جھوٹ تین ایسی باتیں ہیں جو نیک اعمال کو غارت کر دیتی ہیں، روزہ توڑ دیتی ہیں اور وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

امِ جمیل کے بارے میں خصوصی طور پر یہ الفاظ استعمال کرنے میں یہ راز ہے کہ وہ مکہ کے رئیسِ اعظم کی بیوی تھی۔ اس کے گلے میں جواہرات کا گراں بہا ہار تھا اور وہ کہتی تھی: **والـــــلات والعزی لانفقنهافی عداوة محمد کہ لات و عزّٰی** کی قسم میں موتیوں کے اس بیش قیمت ہار کو فروخت کر کے محمد ﷺ کی عداوت میں خرچ کروں گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اسی اکڑی ہوئی گردن میں جس میں آج بڑا قیمتی ہار ہے ہم مونج کی رسی ڈال کر اسے جہنم میں گھسیٹیں گے جو ستر گز لمبی ہوگی۔ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ وہ حسبِ معمول خاردار لکڑیوں کا گٹھا سر پر اٹھائے ہوئے آ رہی تھی وہ گٹھا مونج کی رسی میں بندھا ہوا تھا۔ وہ ایک پتھر پر آرام کرنے کیلیے بیٹھ گئی۔ وہ گٹھا پیچھے ہٹ گیا اور رسی اس کے گلے میں حمائل ہو گئی جس سے اس کا دم گھٹ گیا اور وہ مر گئی۔

سورۃ اللھب تفسیرِ انوار البیان سے (صفحہ نمبر ۲۷۴)

سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے والد کے دس بھائی تھے جو عبدالمطلب کے بیٹے تھے ان میں ایک شخص ابولہب بھی تھا اس کا نام عبدالعزی تھا۔ اس کے بارے میں علامہ قسطلانی نے شرح بخاری میں لکھا ہے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کی طرف اپنے ہاتھوں سے پتھر پھینکا تھا جس سے آپ کے پاؤں مبارک کی ایڑی خون آلودہ ہو گئی تھی لہذا اس کے ہاتھوں کی ہلاکت کا خصوصی طور پر تذکرہ فرمایا۔

ابولہب کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو پیشگی خبر دی کہ وہ ہلاک ہوا اور یہ کہ جلنے والی آگ میں داخل ہو گا اس میں پہلی بات کا مظاہرہ دنیا ہی میں ہو گیا اور وہ اس طرح سے کہ اس کے جسم میں بہت خطرناک قسم کی چیچک نکل آئی جس کی وجہ سے لوگ اس سے گھن کرنے لگے اور اپنے عقیدہ کی وجہ سے اس کے پاس جانے سے ڈرنے لگے کہ کہیں یہ مرض ہمیں نہ لگ جائے لہذا اپنے اور پرائے اس سے دور ہو گئے، ایک گھر میں علیحدہ ڈال دیا گیا اور وہ بے بسی اور بے کسی کی حالت میں مر گیا تین روز تک اس کی نعش یوں ہی پڑی رہی جب سڑنے لگی تو لوگوں نے اس کے بیٹوں کو عار دلائی کہ دیکھو تمہارا باپ کس حال میں پڑا ہے اس پر انہوں نے ایک شخص کی مدد سے ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور اس کے بعد اس کو برابر پتھر مارتے رہے یہاں تک کہ وہ ان میں دب گیا۔

الروض الانف میں ہے کہ اس کو ایک لکڑی کے گڑھے میں ڈال دیا پھر اس پر پتھر برسا دیئے گئے۔

مکہ معظمہ میں ایک پہاڑ ہے اس کے بارے میں مشہور ہے کہ ابولہب کو اسی پر ڈال دیا گیا تھا اور یہ پہاڑ جبل ابولہب کے نام سے معروف ہے۔

حضرت ام کلثومؓ اور حضرت رقیہؓ کا ابولہب کے بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے نکاح ہوا تھا ابھی صرف نکاح ہی ہوا تھا رخصتی نہ ہونے پائی تھی کہ سورۃ تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ نازل ہوئی لہذا

ابولہب نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ تم دونوں محمد ﷺ کی بیٹیوں کو طلاق دیدو ورنہ میرا تمہارا کوئی تعلق نہیں، اس پر وہ دونوں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ایک نے تو صرف طلاق دے دی اور دوسرے نے گستاخی کے الفاظ بھی زبان سے نکال دیئے آپ نے اس کو بددعا دے دی **اَللّٰھُمَّ سَلِّطْ عَلَیہِ کَلبًا مِن کِلَابِکَ۔** (کہ اے اللہ اس پر اپنے پھاڑنے والے جانوروں میں سے ایک جانور مسلط فرمادے)۔

دلائل النبوت میں بھی اس واقعہ کو درج کیا ہے۔مگر مقتول کا نام عتبہ بتایا ہے۔سلسلہ بیان میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب وہ قافلہ شام میں داخل ہو گیا تو ایک شیر زور سے بولا۔اس کی آواز سن کر اس کے لڑکے کا جسم تھر تھرانے لگا۔لوگوں نے کہا کہ تو کیوں کانپتا ہے جو ہمارا حال وہی تیرا حال۔اس قدر ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس نے جواب دیا کہ محمد ﷺ نے مجھے بددعا دی تھی۔خدا کی قسم! آسمان کے نیچے محمد ﷺ سے سچا کوئی نہیں اس کے بعد رات کا کھانا کھانے کیلئے بیٹھے تو ڈر کی وجہ سے اس لڑکے کا ہاتھ کھانے تک نہ گیا پھر سونے کا وقت آیا تو سب قافلہ والے اس کو گھیر کر اپنے درمیان میں لے کر سو گئے شیر بہت معمولی آواز سے بھنبھناتا ہوا آیا اور ایک ایک کو سونگھتا رہا حتی کہ اس لڑکے تک پہنچ گیا اور اس پر حملہ کر دیا آخری سانس لیتے ہوئے اس نے کہا کہ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ محمد ﷺ سب سے زیادہ سچے ہیں یہ کہہ کر مر گیا۔ابولہب نے بھی کہا کہ میں پہلے سمجھ چکا تھا کہ محمد ﷺ کی بددعا سے اس لڑکے کو چھٹکارہ نہیں۔

سورۃ الاخلاص

اس سورۃ کا نام سورۃ الاخلاص ہے۔اس سورۃ میں ایک رکوع اور چار آیتیں ہیں۔

سورۃ الاخلاص کا موضوع تفاسیر صِراط الجنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۸۶۴) :اس سورۃ میں اسلام کے سب سے اہم عقیدے اللہ تعالی کی وحدانیت کو بیان کیا گیا ہے، نیز اللہ تعالی کے صفاتِ کمال کے ساتھ متصف ہونے کا ذکر اور عیسائیوں اور مشرکوں کا رد کیا گیا ہے۔

سورۃ الاخلاص تفاسیرِ صراط الجنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۸۶۲)

مفسرین نے اس سورۃ کے تقریبا 20 نام ذکر کیے ہیں ان میں سے 4 نام یہاں ذکر کیے گئے ہیں:

(1) اس سورۃ میں اللہ تعالی کی خالص توحید کا بیان ہے، اس وجہ سے اسے سورۃ اخلاص کہتے ہیں۔

(2) اس سورۃ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالی ہر نقص وعیب سے بری اور ہر شریک سے پاک ہے، اس مناسبت سے اسے سورۃ تنزیہہ کہتے ہیں۔

(3) جس نے اس سورۃ سے تعلق رکھا وہ غیروں سے الگ ہوجاتا ہے اس لئے اسے سورۃ تجرید کہتے ہیں۔

(4) اسے پڑھنے والا جہنم سے نجات پا جاتا ہے اس بنا پر اسے سورۃ نجات کہتے ہیں۔

جو شخص گھر میں داخل ہوتے وقت سلام کرے اور اگر گھر خالی ہو تو حضورِ اقدس ﷺ کو سلام کرے اور ایک بار قل ھو اللہ پڑھ لیا کرے تو اِن شآء اللہ فقر و فاقہ سے محفوظ رہے گا۔

سورۃ الاخلاص تفسیرِ ضیاء القرآن سے (صفحہ نمبر ۷۰۹)

سورۃ مقشقشہ: قشقشہ کہتے ہیں بیماری سے شفایاب ہوجانا۔ اس سورۃ کے ذریعے کیونکہ کفر و شرک کے مرض سے شفا نصیب ہوتی ہے، اسی لیے اسے مقشقشہ کہا گیا۔

سورۃ الاساس: کیونکہ ایمان و عمل کا قصرِ رفیع توحید کی بنیادوں پر تعمیر ہوتا ہے۔ اس کے بغیر اعلے سے اعلے عمل بھی بے معنی اور بے سود ہے۔

سورۃ المانعۃ: یہ اپنے قاری کو عذابِ دوزخ سے بچا لیتی ہے۔

سورۃ النور: اس کی ضیا پاشیوں سے مومن کے دونوں جہاں روشن ہوجاتے ہیں۔ اس کے ذہن اور اس کے دل دونوں میں اجالا ہوجاتا ہے۔

سورۃ الامان: اس سورۃ پر ایمان رکھنے والے کو خداوندِ ذوالجلال کے قہر و غضب سے امان مل جاتی

ہے۔

اس کی آیات کی تعداد چار اور بروایت پانچ، یہ پندرہ کلمات اور حروف پر مشتمل ہے۔اگر چہ یہ سورۃ صرف چار آیات پر مشتمل ہے لیکن اپنی عظمت شان کے باعث اس کو ایک بار پڑھنے سے دس پاروں کی تلاوت کا ثواب ملتا ہے۔اس سورۃ کو قرآن کریم کی ایک تہائی کہنے کی کئی وجوہات علمانے ذکر کی ہیں۔سب سے بہتر یہ ہے کہ قرآن میں تین چیزوں پر پوری توجہ صرف کی گئی ہے۔اللہ تعالی کی وحدانیت پر ایمان، رسالت پر ایمان اور روزِ قیامت پر ایمان۔اس سورۃ میں توحید کا ذکر کیا گیا ہے جو ان تین چیزوں میں سے ایک ہے اس لیے اسے قرآن کی ایک تہائی فرمایا گیا۔

ایک شخص نے بارگاہِ رسالت میں اپنے فقر اور تنگدستی کی شکایت کی۔حضور ﷺ نے اسے فرمایا کہ جب تم اپنے گھر میں داخل ہو اگر وہاں کوئی موجود ہو تو اس کو سلام کہو اور اگر کوئی موجود نہ ہو تو مجھ پر سلام بھیجو اور پھر ایک مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھو۔اس آدمی نے حسبِ ہدایت عمل کیا اللہ تعالی نے اسے اتنا وافر رزق عطا فرمایا کہ وہ اپنے پڑوسیوں کو بھی مستفید کرنے لگا۔

احد: اس ایک کو کہتے ہیں جس کا دوسرا نہ ہو، نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ کمالات میں۔

صمد: سب کا آقا، سب کا سردار، انعامات حاصل کرنے کیلیے جس کے دربار کا قصد کیا جائے اور طوفانِ مصائب میں جس کی جناب میں فریاد کی جائے۔

کفو کہتے ہیں ہمسر کو، جو قدرت، علم، حکمت اور دیگر صفات میں ہم پلہ اور ہم پایہ ہو۔

علماء لکھتے ہیں کہ شرک کبھی عدد میں ہوتا ہے، **احد** کہہ کر اس کی نفی فرمادی، کبھی مرتبہ و منصب میں ہوتا ہے، **صمد** کہہ کر اس کا بطلان کر دیا، کبھی نسب میں ہوتا ہے، **لم یلد ولم یولد** سے اس کا ابطال کر دیا اور کبھی کوئی کام کرنے اور اثر اندازی میں ہوتا ہے، اس کی تردید لم یکن لہ کفوا احد سے کر دی۔توحید کے اسی جامع مضمون کے باعث اس سورۃ کو سورۃ اخلاص کہا جاتا ہے۔

سورۃ الاخلاص تفسیرِ انوار البیان سے (صفحہ نمبر ۴۷۷)

حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ آپ اپنے رب کا نسب بیان کر دیجئے اس پر اللہ تعالی نے یہ سورۃ نازل فرمائی، اور حضرت ابنِ عباسؓ سے یوں مروی ہے کہ عامر بن طفیل اور ارید بن ربعیہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عامر نے کہا اے محمد ﷺ آپ کس کی طرف ہمیں دعوت دیتے ہیں آپ نے فرمایا میں تمہیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں عامر نے کہا کہ اللہ کی توصیف کیجئے ہمیں بتا دیجئے کہ وہ سونے کا ہے یا چاندی کا لوہے کا ہے یا لکڑی کا (ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ یہودیوں نے سوال کیا تھا کہ اللہ کس چیز کا بنا ہوا ہے۔ کیا وہ کھاتا ہے اور پیتا ہے؟) اس پر سورۃ الاخلاص نازل ہوئی اللہ تعالی نے اربد کو بجلی سے ہلاک فرما دیا اور عامر بن طفیل طاعون میں ہلاک ہو گیا۔

صمد وہ سید ہے جس کی سرداری مکمل ہے اور جس کا شرف کامل ہے وہ عظیم ہے جس کی عظمت کامل ہے وہ حلیم ہے جس کا حلم پورا ہے اور وہ علیم ہے جس کا علم کامل ہے وہ حکیم ہے جس کی حکمت پوری ہے اور وہ ذات ہے جو شرف اور سرداری کے تمام انواع میں کامل ہے۔ یہ معنی بہت اشمل واکمل ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا کہ اللہ تعالی نے فرمایا کہ مجھے ابنِ آدم نے جھٹلایا اس کو ایسا کرنا نہ تھا اور اس نے مجھے گالی دی اور اسے ایسا کرنا نہ تھا، اس کا مجھے جھٹلانا یہ ہے کہ وہ یوں کہتا ہے کہ اللہ مجھے موت کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کرے گا جیسا کہ اس نے مجھے پہلے کیا تھا حالانکہ یہ بات نہیں ہے کہ میرے لئے پہلی بار پیدا کرنے کی نسبت دوبارہ پیدا کرنا زیادہ آسان ہو (میرے لئے ابتدا پیدا کرنا اور دوبارہ پیدا کرنا دونوں برابر ہیں۔ جب یہ بات ہے تو دوبارہ پیدا کرنے کو مشکل سمجھنا اور بعثت پر ایمان نہ لانا یہ مجھے جھٹلانا ہوا) اور انسان کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالی نے اپنے لئے اولاد بنائی ہے حالانکہ میں **احد** ہوں

صمد ہوں میں نے کسی کو نہیں جنا اور نہ میں کسی سے جنا گیا اور میرا کوئی ہمسر نہیں۔
حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں تمہیں تہائی قرآن پڑھ کر سناتا ہوں اس کے بعد آپ نے سورۃ **قُل هُوَ اللهُ اَحَد ☆ اَللهُ الصَّمَد** ختم تک پڑھ کر سنائی۔ حضرت سعید بن المسیب سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جس نے دس مرتبہ **قُل هُوَ اللهُ اَحَد** پڑھ لی اس کے لئے جنت میں ایک محل بنا دیا جائے گا اور جس نے بیس مرتبہ پڑھ لی اس کیلئے جنت میں دو محل بنا دیئے جائیں گے یہ سن کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اللہ کی قسم اس صورت میں ہم اپنے بہت زیادہ محل بنالیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ بہت بڑا داتا ہے جتنا عمل کرلو گے اس کے پاس اس سے بہت زیادہ انعام ہے۔
حضرت انس نے فرمایا کہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے روزانہ دوسو مرتبہ **قُل هُوَ اللهُ اَحَد** پڑھ لی اس کے پچاس سال کے گناہ (صغیرہ) اعمال نامہ سے مٹا دیئے جائیں گے، ہاں اگر اس کے اوپر کسی کا قرض ہو تو وہ معاف نہ ہوگا۔
نیز حضرت انسؓ نے حضور اقدس ﷺ کا یہ ارشاد مبارک نقل کیا ہے کہ جو شخص بستر پر سونے کا ارادہ کرے اور داہنی کروٹ پر لیٹ کر سو مرتبہ **قُل هُوَ اللهُ اَحَد** پڑھ لے قیامت کے دن اللہ جل شانہ کا ارشاد ہوگا کہ اے میرے بندے تو اپنی دائیں جانب سے جنت میں داخل ہو جا۔

سورۃ الاخلاص تفسیرِ بصائر الفرقان سے (صفحہ نمبر ۳۷۹)

رب العالمین قرآن پاک میں تقریباً 42 دفعہ دہرایا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی صفات یا ذات کو پوری طرح بیان کرنے کا ہم شعور نہیں رکھتے کہ سورۃ الکھف کی آیت مبارکہ، اور سورۃ لقمان کی آیت مبارکہ، میں واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی باتیں تو تمام دنیا کے درخت قلمیں بن کر اور سارے سمندر سیاہی بننے کے بعد بھی مکمل طور پر نہ لکھ سکیں گے۔ اگر سوچا جائے تو اللہ تعالیٰ کا نظام چلانے میں باطل کا سرغنہ بن کر شیطان بھی بڑا اہم کام کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ کے پورے معاملات سمجھنے

ہمارے بس کی بات نہیں۔ لیکن ہم شیطان کا دفاع نہ کریں گیا اور یہ بھی نہ کہیں گیکہ وہ ایک بدضرورت کی پیداوار ہے۔ اس دنیا میں امت واحدہ اور دین اسلام کی تین بڑی ضرورتوں میں پہلی اور بنیادی ضرورت توحید ہے۔ دینِ حنیف کی تین بڑی ضرورتیں یہ ہیں:

(1) توحید (2) رسالت (3) آخرت

لفظ **صمد** کی صحابہ کرام اور تابعین نے بڑی پیاری وضاحتیں کی ہیں اور معنی میں لکھا ہر چیز کا بلند حصہ وہ ہستی ہے جس سے بالاتر کوئی نہ ہو۔ وہ سردار جس کی غیر مشروط طور پر اطاعت کی جائیاور اس کے بغیر کسی معاملہ کا فیصلہ نہ کیا جاتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ابتدا بھی آپ خود ہے اور انتہا بھی خود۔ اب اللہ تعالیٰ کیلئے الصمد کا لفظ اس معنی میں بھی کافی تھا کہ نہ کوئی چیز اس سے نکلے، نہ کوئی چیز اس میں داخل ہو۔

مسند عبدالرزاق کی ایک حدیث قدسی کے مطابق وہ چھپا ہوا خزانہ اور طاقت ہے۔ جب اس نے چاہا کہ وہ پہچانا جائے، یعنی اپنا تعارف کرنا چاہا تو اپنا عارف پیدا کیا اور یہ عارف یہی انسان ہے۔ ہم مادی حالت میں اور بھی اندھے ہیں آخرت کے وقت تو سورۃ ق کی آیت مبارکہ ۲۲، کے مطابق نظر کچھ تیز ہوگی فبصرک یوم الحدید۔

سورۃ الفلق

اس سورۃ کا سورۃ الفلق ہے۔ فلق کے کئی معنی ہیں اور یہاں اس سے مراد صبح ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع اور پانچ آیتیں ہیں۔

سورۃ الفلق کا موضوع تفاسیرِ صراط الجِنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۸۶۹)

اس سورۃ مبارکہ میں تمام مخلوق کے شر سے، رات کے اندھیرے کے شر سے، جادوگروں کے شر سے اور حسد کرنے والے کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

سورۃ الفلق تفاسیرِ صراط الجنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۸۷۱)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، آپ فرماتی ہیں کہ جب حضورﷺ کے اہل میں سے کوئی بیمار ہوتا تو حضورﷺ معوذات (یعنی سورۃ فلق اور سورۃ ناس) پڑھ کر اس پر دم فرماتے۔

سورۃ الناس

اس سورۃ کا نام سورۃ الناس ہے۔عربی میں انسانوں کو الناس کہتے ہیں۔اس سورۃ میں ایک رکوع اور چھ آیتیں ہیں۔یہ سورۃ مدنی ہے۔

سورۃ الناس کا موضوع تفاسیرِ صراط الجنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۸۷۳) :اس سورۃ مبارکہ میں ان جنات اور انسانوں سے اللہ تعالی کی پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں۔

سورۃ الناس تفاسیرِ صراط الجنان فی تفسیرِ القرآن سے (صفحہ نمبر ۸۷۴)

انسان اشرف المخلوقات ہے، اس لئے ان کا خصوصیت سے ذکر فرمایا۔اس سے انسان کی عظمت وشرافت بھی معلوم ہوئی کہ بطورِ خاص اللہ تعالی نے اپنی **رَبُوبِیَت** کی نسبت اس کی طرف فرمائی۔علماء نے یہاں یہ نکتہ بیان فرمایا ہے کہ اس سورۃ میں پانچ مرتبہ لفظ **اَلنَّاسِ** آیا ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ چونکہ انسان بچپن میں صرف پرورش ہی پاتا ہے، اس لئے سب سے پہلے **رَبِّ النَّاس** یعنی ربوبیت والی صفت کا ذکر فرمایا۔جبکہ انسان جوانی میں مست ہو کر بے راہ ہو جاتا ہے، اس وقت اس پر قانونی گرفت کی ضرورت ہے، اس لئے یہاں **مَلِكِ النَّاسِ** یعنی لوگوں کا بادشاہ فرمایا، اور چونکہ انسان بڑھاپے میں عبادت میں مشغول ہوتا ہے، اس لئے تیسری جگہ اللہ تعالی کی صفتِ الوہیت اور معبودیت کا ذکر فرمایا یعنی **اِلٰهِ النَّاسِ** ۔چوتھی جگہ النّاسِ سے صالحین مراد ہو سکتے ہیں کہ شیطان عموماً انہیں ہی وسوسوں کے ذریعے عبادت سے ہٹانے کی کوشش

کرتا ہے اور پانچویں جگہ **النَّاسِ** سے مراد شر پسند اور فسادی لوگ ہو سکتے ہیں کہ وہاں لوگوں کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔

مَلِكِ النَّاسِ: تمام لوگوں کا بادشاہ۔ یعنی ان کے کاموں کی تدبیر فرمانے والا ہے اور سب کا حقیقی حاکم و مالک کہ دنیا میں بھی کسی کو حکومت و مِلکیت ملے تو اسی کی عطا سے ملتی ہے۔

اِلٰـهِ النَّاسِ: تمام لوگوں کا معبود۔ معبود ہونا اسی کے ساتھ خاص ہے اور سارے لوگوں کا حقیقی معبود وہی ہے۔

مِن شَرِّ الوَسوَاسِ الخَنَّاسِ: بار بار وسوسے ڈالنے والے، چھپ جانے والے کے شر سے۔ اس سے مراد شیطان ہے اور یہ اس کی عادت ہے کہ انسان جب غافل ہوتا ہے تو اس کے دِل میں وسوسے ڈالتا ہے اور جب انسان اللہ تعالی کا ذکر کرتا ہے تو شیطان دبک رہتا ہے اور ہٹ جاتا ہے۔

یاد رہے کہ برے خیال کو وسوسہ کہا جاتا ہے جبکہ اچھے خیالات کو اِلہام۔ وسوسہ شیطان کی طرف سے ہے لہذا اس پر لاحول پڑھنی چاہیے، اور اِلہام فرشتے کے ذریعے اللہ تعالی کی طرف سے ہوتا ہے، اس لئے اس پر اللہ تعالی کا شکر کرنا چاہیے۔ نفسِ امارہ کے غلبہ میں وسوسے زیادہ ہوتے ہیں جبکہ نفسِ مطمئنہ کے غلبہ میں اِلہام زیادہ۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رات کے وقت جب بستر مبارک پر تشریف لاتے تو اپنے دونوں دستِ مبارک جمع فرما کر ان میں دم کرتے اور سورۃ **قُل هُوَاللّٰهُ اَحَد** اور **قُل اَعُوذُ بِرَبِّ الفَلَق** اور **قُل اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ** پڑھ کر اپنے مبارک ہاتھوں کو سر مبارک سے لیکر تمام جسمِ اقدس پر پھیرتے جہاں تک دستِ مبارک پہنچ سکتے، یہ عمل تین مرتبہ فرماتے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: صبح شام تین تین بار **قُل هُوَاللّٰهُ اَحَد** او **قُل اَعُوذُ بِرَبِّ الفَلَق** اور **قُل اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاس** پڑھو، ان کی تلاوت کرنا تمہیں ہر بری چیز سے

بچائے گا۔

سورۃ الفلق والناس تفسیرِ بصائرالفرقان سے (صفحہ نمبر ۹۷۸)

جب انسان رب العالمین کی پناہ طلب کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو محفوظ اور زیادہ طاقتور محسوس کرتا ہے۔ان دو سورتوں کے علاوہ قرآنِ پاک میں آیات مبارکہ ایسی ہیں جو قل سے شروع ہوتی ہیں۔

سورۃ الاعراف آیت مبارکہ ۱۷۲ کے مطابق انسان نفس ہے، جس کے بیچ سورۃ الحجر کی آیت مبارکہ ۲۹، سورۃ السجدہ کی آیت مبارکہ ۱۹ اور سورۃ ص کی آیت مبارکہ ۷۲، کے مطابق اللہ تعالی اپنی روح سے تھوڑا سا پھونک دیتے ہیں تو انسان کے دو بڑے حصے ہیں، ایک بدن جس کا تعلق اس مادی دنیا سے ہے، اور اس میں جو خون پیدا ہوتا ہے، اس کی عمر دن ہے اور باقی بدن کی عمر دس سال کہ روزانہ ادھڑ کر دس سالوں میں بالکل تبدیل ہو جاتا ہے۔تو ان دونوں کا تعلق ادراک سے اور حس یا sense سے یا اعصاب سے ہے یا کیفیت سے ہے وغیرہ۔جادو ایک حس یا sense یا لطیفہ ہے، جس کے اثرات انسان کے اعصاب اور لطائف پر ہو سکتے ہیں۔

پاکیزہ کلمہ کی شان میں قرآن پاک کی سورۃ ابراہیم کی آیت مبارکہ اور میں جو الفاظ ہیں ان کو سمجھنے کیلئے ایک زمانہ درکار ہے۔ جو پہلو وہاں واضح کیا گیا ہے۔ان سورتوں کی مدد سے جھاڑ پھونک کی مکمل اجازت ہے اور اس کے فوائد ہیں۔

پناہ مانگنا کسی کی حفاظت میں جانا ہوتا ہے۔ جیسا کہ شیطان سے پناہ مانگنے کیلئے ہم الفاظ **اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم** استعمال کرتے ہیں۔تو اس میں ساری اہمیت لفظ باللہ کی ہے۔اسی طرح اس سورۃ میں ساری بات پہلی آیت مبارکہ میں الفاظ 'برب الفلق' کی ہے۔مسلم شریف کے مطابق حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رحمتہ للعالمین ﷺ اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے اے میرے رب میں پناہ مانگتا ہوں، ان کاموں کے شر سے جو میں نے کیئے یا

ان کاموں کے بھی شر سے جو میں نے نہیں کیے۔

تیسری آیت مبارکہ میں لفظ 'غاسق' کے معنی تاریک کے ہیں اور وقب کے معنی داخل ہونے یا چھا جانے کے ہیں کہ 'غسق ' کا لفظ سورۃ بنی اسرائیل کی آیت مبارکہ ۷۸، میں انہی معنی میں استعمال ہوا۔اس لئے رات کی تاریکی کے شر سے پناہ مانگنے کی اس لئے ضرورت ہے کہ اکثر جرائم رات کی تاریکی میں ہوتے ہیں۔

قرآن کی ترتیب کے لحاظ سے سورۃ الفاتحہ میں رب کی عظمت کے بیان اور دعا سے شروع ہوا اور اس کا خاتمہ اب ان دونوں سورتوں میں اللہ تعالی کی پناہ میں جانے سے ہوگیا۔سورۃ المائدہ کی آیت مبارکہ ۳ کے مطابق اللہ تعالی نے ہمارے لئے اپنا دین مکمل کردیا کہ ہم صرف اسی کے ہوجائیں۔یہی سب سے بڑی نعمت ہے۔اللہ تعالی کی رب العالمین کے طور پر کی گئی صفت تک نہ ہمارا شعور ہمیں لفظ رب کی وسعتوں تک پہنچنے کیلیئے کچھ مدد دے سکتا ہے اور نہ ہمارا یہ شعور ہمیں العالمین یعنی کائنات اور اللہ تعالی کی تخلیقات کے زمان ومکاں کی وسعتوں کو ناپنے کے پیمانے دیتا ہے۔پس عاجزی کا مقام ہے۔

اللہ تعالی کی تین صفات کا ذکر کر کے ہم اس کی پناہ میں جارہے ہیں۔

*وہ انسانوں کا رب ہے۔

*انسانوں کا بادشاہ ہے۔

*انسانوں کا معبود ہے۔

سورۃ الناس میں خناس کا لفظ دراصل پلٹ پلٹ کر آنے والے کیلیئے استعمال ہوتا ہے۔ہمارے دلوں یا سینوں میں جو وسوسے یا خراب خواہشات پلٹ پلٹ کر آتی ہیں اور ہمارے نفوس پر اثرات کرتی ہیں، وہ شر اور شیطان کی طرف سے ہوتی ہیں۔وسوسہ از خود کیا ہے، اس سلسلہ میں نہ تو موجودہ سائنس نے کھل کر واضح کیا اور نہ روحانی طور پر عام انسان کسی ایسے مقام پر پہنچ سکا ہے کہ

وہ وسوسے کو سمجھ سکے یا وسوسے پر قابو پا سکے۔ سب جن اور انسان، ان شر والے خناس شیطانوں کا حدف ہیں۔

سورۃ الفلق والناس تفسیرِ ضیاء القرآن سے (صفحہ نمبر ۷۱۹)

پہلی سورۃ الفلق ایک رکوع، پانچ آیتوں، تیئس کلموں اور چوہتر حروف پر مشتمل ہے اور دوسری سورۃ الناس میں ایک رکوع، چھ آیات، بیس کلمے اور اناسی حروف ہیں۔

عقبہ کہتے ہیں ایک روز رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: **الم تر آیات انزلت اللیلۃ لم یرمثلھن اعوذبرب الفلق، اعوذ برب الناس** یعنی تمہیں خبر ہے اللہ تعالی نے آج رات مجھ پر ایسی آیتیں نازل فرمائی ہیں جن کی پہلے مثال نظر نہیں آتی۔ قرآن کریم وہ ہے جو حضور ﷺ سے صحابہ کرام نے سنا اور پھر بذریعہ تواتر نقل کیا۔ صحابہ سے تابعین نے اسی تواتر سے سنا۔ یوں ہی سلسلہ وار وہ ہم تک منقول ہوتا چلا آیا ہے۔ الغرض کلام اللہ وہی ہے جو اس مصحفِ عثمانی کے مطابق ہے جس پر تمام صحابکرام کا اجماع ہے اور اس وقت سے لیکر آج تک اس میں نہ کسی لفظ کی کمی بیشی ہوئی نہ کسی آیت میں تقدیم وتاخیر رونما ہوئی نہ کلمات کی ترتیب میں کوئی تغیر روپذیر ہوا۔

حضور ﷺ کا یہ معمول تھا کہ ہر شب آرام کرنے سے پہلے آخری تینوں قل پڑھتے، اپنے مبارک ہاتھوں پر دم فرماتے پھر اپنے سارے جسم پر انہیں پھیر لیتے۔ یہ معمول حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے جو خود عینی شاہد ہیں۔ نیز امام بخاری، امام احمد، ترمذی، ابنِ ماجہ نے حضرت ابنِ عباس سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت سیدنا امام حسنؓ اور سیدنا امام حسینؓ کو یہ پڑھ کر دم فرمایا کرتے:

اُعِیذُ کُمَا بِکلماتِ اللہ التَّامَّۃِ مِن کُلِّ شَیطانٍ وَھامّۃٍ وَمِن کُلِّ عَینٍ لامۃٍ

حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی نے ایک روز عرض کیا: یارسول اللہ ! جب سے مسلمان ہوا ہوں مجھے شدید درد ہوتا ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ جان لیوا ثابت ہوگا۔ حضور نے فرمایا: درد کی جگہ پر اپنا دایاں ہاتھ رکھو، پھر تین بار **بسم اللہ** اور سات مرتبہ یہ پڑھتے ہوئے درد کی جگہ پر ہاتھ رکھو:

اَعُوذُ بِاللّٰهِ وَقُدرَتِه مِن شَرِّمَا اَجِدُوَاُحَاذِرُ۔

صحیح مسلم میں ابوسعید الخذری کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ بیمار ہوئے عیادت کیلیے جبرائیل امین حاضر ہوئے۔ پوچھا: جانِ عالم ! کیا آپ بیمار ہوگئے؟ فرمایاہاں۔ جبرائیلؑ نے یہ پڑھ کر دم کیا:

بِاسمِ اللّٰهِ اَرقِيكَ مِن كُلِ شَیءٍ يُؤذِيكَ مِن شَرِّ كُلِ نَفسٍ اَوعَينِ حَاسِدُ، اَللّٰهُ يَشفِيكَ۔ بِاسمِ اللّٰهِ اَرقِيكَ۔

ترجمہ: میں اللہ کا نام لے کر آپ کر دم کرتا ہوں ہراس چیز سے جو آپ کو اذیت دے، اور ہر نفس اور حاسد کی نظر سے۔ اللہ آپ کو شفا دے۔ میں اللہ کا نام لے کر آپ کو دم کرتا ہوں۔

حضور ﷺ نے فرمایا: جو پڑھ کر تم دم کیا کرتے تھے وہ مجھے سنا۔ جھاڑنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جب تک اس میں شرک نہ ہو۔

سورة الناس

تیسرے اور اعلیٰ قسم کے وہ لوگ ہیں جو محض اس لیے اس سے محبت کا دم بھرتے ہیں، محض اس لیے اس کے دامنِ عاطفت کے سایہ کے طلب گار ہیں کہ وہ ان کا معبود ہے۔ وہ بھوک برداشت کر سکتے ہیں، وہ محرومیوں پر راضی برضا رہ سکتے ہیں، وہ طاغوتی قوتوں کے ہر تیرِ ستم کے سامنے خوشی سے اپنا سینہ تان سکتے ہیں، ان کے ہونٹ حرفِ شکایت سے بھی آشنا نہیں ہوتے، وہ فقط اس لیے اس سے پیار کرتے ہیں کہ وہ معبود برحق ہے، وہ ان کا خداوند کریم ہے۔ ایسے لوگوں کیلیے **اِلٰهِ النَّاس** کے مبارک کلمے ذکر کیے گئے۔

بڑی بے نیازی سے کہا اگر میرے رب کا حکم ہے تو ایک اسماعیل کیا لاکھوں اسماعیل اس کی رضا کے لیے قربان کیے جاسکتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کی حالت ہوتی ہے جنہیں ربِ کریم اپنی پناہ میں لے لیا کرتا ہے۔

وسوسہ: حدیثِ نفس کو کہتے ہیں۔ وسواس: دل میں طرح طرح کے خیالات ڈالنے والا۔ خناس: پیچھے کھسک جانے والا، دبک جانے والا۔

الٰہی ! تیرا یہ عاجز بندہ جس کا علم بھی ناقص، فہم بھی نارسا، ہمت بھی پست اور قوتِ مدافعت بھی نہ ہونے کے برابر ہے، اسے اپنی پناہ میں لیلے۔ میرا ایمان، میرا یقین، میرا ذوق، میرا شوق، تیرے محبوبِ کریم ﷺ سے محبت کی ایک ٹمٹماتی ہوئی شمع، سب تیری پناہ میں دیتا ہوں۔ اپنی توفیق سے، اپنی اس کتابِ مقدس کی خدمت کی جو سعادت تو نے اس ذرہ ناچیز، بندہ بے کس کو ارزانی فرمائی ہے، اس کو قبول فرما۔

سورۃ الفلق والناس تفسیرِ انوار البیان سے (صفحہ نمبر ۴۸۵)

اہلِ معرفت نے فرمایا ہے کہ سورۃ الفلق میں دنیاوی آفات و مصائب سے پناہ مانگنے کی تعلیم ہے اور سورۃ الناس میں اخروی آفات سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے، شیاطین ایمان میں بھی وسوسے ڈالتے ہیں اور کفر و شرک کے خیالات بنی آدم کے سینوں میں ڈالتے ہیں اور گناہوں پر بھی ابھارتے ہیں اس لئے شیاطین کے وسوسہ سے پناہ مانگتے رہنا چاہئے۔

شیطان ایمان کا ڈاکو ہے۔ ایمان کی دولت سے محروم کرنے کے لئے وسوسے ڈالتا ہے۔ کافروں کے بارے میں شیطان کی یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ کفر اور شرک پر جمے رہیں۔ اور اہلِ ایمان کے بارے میں اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایمان سے پھر جائیں، ان کا بہت پیچھا کرتا ہے اور مختلف طریقوں سے ستاتا ہے۔ ایمانیات اور اعتقادیات کے بارے میں شک ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور برے برے وسوسے ڈالتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ان وسوسوں کا علاج بتا دیا کہ وسوسہ آئے، تو وہیں رک جائے اور بائیں طرف کو تین بار تھوک دے اور **اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيطٰنِ الرَّجِيمِ** پڑھ لے۔ یہ تھوکنا شیطان کو ذلیل کرنے کیلئے ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ عورت چھپا کر رکھنے کی چیز ہے جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان تاک میں لگ جاتا ہے۔ عورت باہر نکلی اور شیطان نے اسے تا کنا نظریں اٹھا کر دیکھنا اور گزرنے والوں کو اس کی طرف متوجہ کرنا شروع کر دیا۔ شیطان ایک دوسرے کے خلاف بدگمانی کے وسوسے بھی ڈالتا ہے جو انسانوں میں اثر کر جاتے ہیں۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان اپنی سونڈ کو انسان کے دل پر جمائے ہوئے ہے اگر وہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور اگر وہ اللہ کے ذکر سے غافل ہو جاتا ہے تو اس کی دل کا لقمہ بنا لیتا ہے اس کو **الوسواس الخناس** بتایا ہے۔

رسول ﷺ پر جو جادو کا اثر ہوا بعض لوگ اس کا انکار کرتے ہیں یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ جادو سے متاثر ہونا شانِ نبوت کے خلاف ہے ان کا یہ خیال غلط ہے بات یہ ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ بشر تھے اور بشریت کے اثرات ان پر بھی طاری ہو جاتے تھے اور ان کے اجسام تکالیف سے متاثر ہوتے تھے۔ بہت سے انبیاء کرامؑ کو تو ان کی قوموں نے قتل کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کو تیز بخار آ جاتا تھا۔ آپ ایک مرتبہ سواری سے گر گئے تو آپ کی ایک جانب چھل گئی، اس زمانہ میں آپ نے بیٹھ کر نمازیں پڑھائیں، صاحبزادے کی وفات پر آپ کے آنسو جاری ہو گئے۔ بچھو نے بھی آپ کو ڈس لیا آپ نے اس کا علاج کیا آپ کو بھوک بھی لگتی تھی اور پیاس بھی۔

حضرت امام نسائیؒ نے اپنی کتاب سنن کے ختم کرنے سے چند صفحات پہلے کتاب الاستعاذہ کا عنوان قائم کیا ہے اور اچھی خاصی تعداد میں ضرر دینے والی چیزوں سے پناہ مانگنے کا ذکر کیا ہے مثلاً بخل، بزدلی، سینہ کا فتنہ (کفر اور شرک) قبر کا عذاب، سمع بصر، لسان قلب، بہت زیادہ بڑھاپا،

عاجزی، مرض، سستی، غمِ زندگی اور موت کا فتنہ، دجال، تنگ دستی، ذلت، کفر، عذاب النار، خیانت بھوک، شقاق، نفاق، سوء الاخلاق، لغزش کھانا، گمراہ ہونا، ظالم ہونا، دشمن کا غالب ہونا، دشمنوں کا خوش ہونا، بدبختی کا پالینا، برے امراض مثلاً جنون، جذام اور برص کا لاحق ہونا، مظلوم کی بددعا، شیاطین الجن والانس، احیا اور اموات کا فتنہ، زمین میں دھنس جانا، اوپر سے گر پڑنا، کس چیز کے نیچے دب جانا، غرق ہونا، جل جانا، موت کے وقت شیطان کا پچھاڑنا، جہاد میں پشت پھیر کر بھاگتے ہوئے مرجانا، کسی زہریلے جانور کے ڈسنے سے مرنا، علم کا نفع نہ دینا، دل میں خشوع نہ ہونا، نفس کا پیٹ نہ بھرنا، دعا کا مقبول نہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔

قُل اَعُوذ بِرَبِّ الفَلَقِ پڑھتا ہے تو ہر اس چیز کے شر سے اللہ کی پناہ لیتا ہے جو اللہ نے پیدا کی ہے اور رات کے شر سے بھی پناہ لیتا ہے اور گرہوں میں دم کرنیوالی عورتوں کے شر سے بھی پناہ لیتا ہے جو جادو کرتی ہیں اور حسد کرنیوالے کے شر سے بھی پناہ لیتا ہے اور **قُل اَعُوذُ بِرَبِّ النَاسِ** پڑھنے والا سینوں میں وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے پناہ لیتا ہے اتنی چیزوں کے شر سے بچنے کیلئے دعا کی جاتی ہے اسی لئے ان دونوں سورتوں کا پڑھنا ہر طرح کے شر اور بلا مصیبت اور جادو ٹونہ ٹوٹکہ سے محفوظ رہنے کیلئے مفید اور مجرب ہیں۔

سلوک و تصوف کا عملی دستور

صحبت و تعظیمِ مرشد

قرآن حکیم صحابہ کرام کی صحبت و معیت کا خصوصی تذکرہ کرتا ہے۔

سائب بن یزید سے مروی ہے:

یقول ذھبت بی خالتی الی النبی فقالت یا رسول الله ان ابن اختی وقع فمسح راسی ودعا بالبرکه ثم توضا فشربت من وضوه۔ (صحیح بخاری، ۱:۳۱)

فرماتے ہیں کہ مجھے میری خالہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گئیں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ میرا بھانجا بیمار ہے آپ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے لئے برکت کی دعا کی پھر آپ نے وضو فرمایا اور میں نے آپ کے وضو کا غسالہ پی لیا۔

وازع بن عامر صحابی ہیں جو وازع العبدیکے لقب سے مشہور ہیں ان سے مروی ہے:

قال قد منافقیل ذاك رسول الله فاخذ نابید یه ورجلیه نقبلها

(الادب المفرد: ۲۵۳)

فرماتے ہیں کہ ہم آئے تو ہم سے کہا گیا کہ وہ ہیں رسول اللہ ﷺ، ہم نے آپ کے ہاتھ پیر پکڑ لئے اور چومنے لگے۔

یہاں تک کہ جن صحابہ کے ہاتھ حضور ﷺ کے دست اقدس سے مس ہوتے دیگر صحابہ اور تابعین ان کے ہاتھ چومتے اور ان کے لئے احتراما قیام کرتے تھے۔ صحابہ حضور ﷺ کی خدمت میں ہدایا تحائف اور نذرانے پیش کرتے اور حضور ﷺ قبول فرمالیتے تھے اور ان کو بھی وقتا فوقتا ان سے

نوازتے رہتے۔

مجالسِ ذکر وفکر

شاہ ولی اللہ بھی اسی روایت کو یوں بیان کرتے ہیں:

فقال اغمض عینیك واسمع منی ثلاث مرات ثم قل انت ثلاث مرات وانا اسمع فقال لا الہ الا اللّٰہ ثلاث مرات مغمضاعینیه رافعا صوته

پس آپ نے فرمایا اپنی آنکھیں بند کرو اور مجھ سے تین مرتبہ کلمہ سنو اور پھر تو اسی کو تین مرتبہ دہرا اور میں سنوں گا پس انہوں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اونچی آواز سے تین مرتبہ لا الہ الا اللہ کہا۔

عبداللہ بن عباس سے مروی ہے:

قال ان رفع الصوت بالذکر حین ینصرف الناس من المکتوبه کان علی عهد النبی (صحیح بخاری،۱:۱۱۶)

فرماتے ہیں جب لوگ فرضی نماز سے فارغ ہوتے تو عہد رسالت مآب ﷺ میں بلند آواز سے ذکر کرنا رائج تھا۔

حصولِ علم اور طاعتِ حق

طریقت کی بنیاد شریعت ہے۔اور شریعت کا مطالبہ اوّلین ایمان وعمل ہے۔ایمان کو عمل سے یا عمل کو ایمان سے الگ نہیں کیا گیا۔ایمان سراسر علم ہے اور عمل سراسر طاقت ہے۔جب حدیث وسنت کا علم نہ ہوگا اتباع رسول نہ ہوسکے گی اور اتباع رسول کے بغیر طریقت محال و ناممکن ہے۔توجہ الٰہی کا حصول ہی تو تصوف کا مغز ہے۔

امام مالک کا قول ہے:

من تفقه ولم یتصوف فقد تفسق ومن تصوف ولم یتفقه فقد تزندق

ومن جمع بینھما تحقق۔ (مرقاۃ المفاتیح، ۱:۲۵۶)

جو فقہ میں ماہر ہوا اور تصوف کو نہ جانا وہ فسق و فجور میں پڑ گیا اور جو تصوف میں ڈوب گیا اور فقہ سے نابلد رہا وہ زندیق ہو گیا اور جس نے دونوں کو جمع کیا اس نے حق کو پالیا۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد

ایک فقیہ، شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہوتا ہے۔

كَبرَ مَقتًا عِندَاللّٰهِ ان تَقُولُوا مَالَا تفعَلُون۔ (الصّف، ۶۱:۳)

اللہ کو یہ بہت ناگوار ہے کہ تم وہ کہو جو کرو نہیں۔

حضور غوثِ اعظم نے فرمایا: اے علم کے مدعی تیرے علم کا بلا عمل کچھ اعتبار نہیں اور بلا اخلاص تیرا عمل معتبر نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ جسم بلا روح ہے۔ اخلاص کی علامت یہ ہے کہ تو مخلوق کی تعریف و خدمت کی طرف توجہ نہ کرے۔

نبی پاک ﷺ نے فرمایا: گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسے ہے گویا اس کا گناہ تھا ہی نہیں۔ طاعت حق کے لئے جملہ فرائض و واجبات کی پابندی اور سنن کی پیروی کے علاوہ چند معمولات کو اپنانا سالک کے لئے نہایت مفید اور ازبس لازم ہے۔

۱۔ شبانہ روز مسنون نوافل کی ادائیگی

۲۔ تلاوت قرآن مجید

۳۔ کثرت درود و سلام

۴۔ کثرت استغفار

۵۔ صدقہ و خیرات

اہلِ سنت کے فقہی مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک مذہب سے متمسک ہو جائے اور ائمہ اربعہ میں

سے کسی ایک کی تقلید کرے۔

مرتبہ احسان تک رسائی کا ذریعہ

قرآن حکیم میں ارشادِ ربانی ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِینَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُونُوا مَعَ الصّٰدِقِینَ۔ (التوبہ،۹:۱۱۹)

اے ایمان والو ! اللہ سے ڈرو اور اہل صدق کے ساتھ رہا کرو۔

''کونوا مع الصادقین'' صادقوں کی معیت اختیار کرو اور راست بازوں کی صحبت میں رہو''یا ایھا الذین امنوا'' میں تکمیل ایمان ہے''اتقوا اللہ'' میں تکمیل اسلام ہے جو دوسرا درجہ ہے اور ''کونوا مع الصادقین'' میں تکمیل احسان ہے یہی تین چیزیں ہیں جن کی تعلیم نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کو دی تھی حدیث جبرئیل اس امر پر دال ہے جس میں حضور رسول اکرم ﷺ نے ان تینوں مدارج کی توضیح کی۔ ایمان عقائد پر مبنی ہے اسلام اعمال پر اور ان سے بڑھ کر احسان کی منزل ہے جو مشاہدہ و رویت پر مبنی ہے۔

کہتے ہیں انسانیت کا کمال اور بزرگی تین چیزوں پر موقوف ہے۔ اول ظاہر کا تزکیہ) صفائی (دوئم باطن کی صفائی سوئم قلب کا تخلیہ) خالی کرنا (میں کہتا ہوں پہلا اسلام ہے دوسرا ایمان اور تیسرا احسان۔ جیسا کہ حدیث جبرائیل ان تینوں چیزوں پر مشتمل ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِینَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابتَغُوٓا اِلَیہِ الوَسِیلَتَہ وَ جَاھِدُوا فِی سَبِیلِہٖ لَعَلَّکُم تُفلِحُون۔ (المائدہ،۵:۳۵)

اے ایمان والو ! تم اللہ سے ڈرتے رہو اور اس تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرو اللہ کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم فلاح پا۔

یہ آیت پورے مضمون تصوف کو محیط ہے۔ اس میں فلاح نفس کے لئے چار شرائط مذکورہ ہیں:

۱۔ ایمان ۲۔ تقویٰ ۳۔ ابتغا وسیلہ ۴۔ جہاد

سب سے پہلی شرط ایمان ہے کیونکہ مخاطب مومنین ہیں دوسری شرط تقویٰ ہے۔ تقوی پورے اسلام کو محیط ہے۔ اوامر کی اطاعت اور نواہی سے اجتناب کے علاوہ دیگر اعمال صالحہ کے بغیر تقوی کا مفہوم مکمل نہیں ہوتا اس کے بعد تیسرا درجہ تلاش وسیلہ ہے اور اس وسیلہ کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ انسان وصال حق کے مقام پر فائز ہو سکے۔ یہ وسیلہ اہلِ بصیرت کے نزدیک مرشد کامل ہے اور پھر مرشد کامل کی نگرانی میں راہِ حق میں جہاد کیا جائے اس جہاد سے مراد جہاد بالنفس ہے جو جہاد اکبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

کلام، طعام اور منام میں تخفیف

زبان کو زیادہ تر ذکر خدا اور تبلیغ حق میں جنبش دے۔ تو عشاء کے بعد عام گفتگو سے دور رہ خاموشی برقرار رکھ پھر سوجا۔ منہ کی زبان بند رہنے سے دل کی زبان کھلے گی جو تجھے اسرار و معارف پہ آ گاہ کرے گی۔

قلت طعام کے ضمن میں تجھ پر لازم ہے کہ کھانا اس قدر کھا جس سے تو سیری ہرگز محسوس نہ کرے اور اتنا کم بھی نہ کر کہ جسمانی ضعف محسوس کرنے لگے۔ تیرا کام ریاضت و مجاھدہ ہے نفس کو مغلوب کرنا ہے اور روحانیت کو طاقت پہنچانا ہے۔ کم کھانا تیری روحانیت اور نورانیت میں اضافہ کرے گا نوری فرشتوں کی طرح تجھ میں لطافت پیدا کرے گا۔ عبادت میں تجھے خاص لذت وطمانیت اور کف وسرور کی حالت حاصل ہوگی۔

(تمام تر بھلائی جاگنے میں اور تمام تر برائی سونے میں ہے)

کثرتِ ذکر و عبادت

تلاوت کلام پاک کے لئے کوئی وقت مقرر کرے اور باقاعدگی سے انوار تلاوت کے ذریعے اپنے باطن کو منور کرے۔ نوافل کے معاملے میں سالک پر پانچ فرض نمازوں کے علاوہ چار اور نمازیں ہیں۔ تہجد آٹھ رکعت، اشراق دو رکعت، چاشت چار رکعت اور اوابین چھ رکعت۔ ان

نمازوں کے علاوہ سالک کو چاہئے کہ ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ صلوۃ التسبیح پڑھے اس کے لئے جمعہ کا دن موزوں تر ہے۔

زیارتِ قبور

بہتر ہے کہ سالک زیارت قبور عام المسلمین و مزارات اولیا کی حاضری میں پابندی اختیار کرے۔ عام قبور سے موت و آخرت کی یاد تازہ ہوتی ہے اور مزارات اولیا پر حاضری دینے سے جذب وشوق کی توفیق ملتی ہے۔ زیارتِ قبور و مزارات کیلئے جمعرات کو بعد نمازِ عصر یا جمعہ کو بعد نمازِ فجر و اشراق جائے یہ دو وقت بہت اچھے ہیں۔

آدابِ ذکر

آدابِ ذکر میں جو شرائط ضروری شمار ہوتی ہیں ان میں سے کم سیری، فراغت، خلوت، بند حجرہ، نیم اندھیرا، پاکیزہ مقام، اجلے کپڑے، قبلہ رو رخ، دوزانو یا چارزانو (دوزانوں زیادہ بہتر ہے) بیٹھنا اور حضور شیخ کا تصور وغیرہ تمثیلاً عرض کی جاتی ہیں۔ آغاز ذکر سے قبل سالک کو چاہیے کہ نوافل، استغفار، درود وسلام اور آیات قرآنی کے ذریعے وساوس دنیاوی سے اپنے دل و دماغ کو پاک کر لے۔ تاکہ ذکر سے نفع حاصل ہو۔

طریقہ ذکر

اے سالک تو ''لا اِلٰہَ اِلا اللہ'' کا ذکر مسلسل اور با آواز بلند کر۔ دورانِ ذکر اپنی آنکھیں بند کر لے 'لاٰ' کو اپنی ناف کے اوپر اور دل کے نیچے سے کھینچ حتی کہ اسے دائیں شانے تک لا پھر یہاں 'الٰہ' کہہ اب 'الا اللہ' کی ضرب زور سے دل پر لگا۔

سماحت

سماحت کے معنی ہیں کہ انسان لذتوں، انتقام، بخل، حرص اور اس طرح کی اور بری باتوں کے پیچھے

اپنے نفس کی سفلی خواہشات کا غلام نہ ہو۔ انسان میں جتنی خواہشات ہیں، اسی قدر سماحت کے بھی شعبے ہیں۔ چنانچہ ہر خواہش کے مقابلے میں سماحت کے اس شعبے کو الگ نام دیا گیا ہے۔

۱۔ شھوانی اور نفسانی خواہشات کا اثر قبول نہ کرنا عفت ہے۔

۲۔ تن آسانی اور ترک عمل کی خواہش سے مغلوب نہ ہونا اجتہاد ہے۔

۳۔ گھبراہٹ اور پریشانی کی خواہش کو روکنا صبر ہے۔

۴۔ انتقام کی خواہش سے مغلوب نہ ہونا عفو ہے۔

۵۔ حرص کی خواہش سے بچنا قناعت ہے۔

۶۔ شریعت نے جو حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز کرنے کی خواہشات کو دبانا تقویٰ ہے۔

۷۔ عقل کے پاکیزہ احکام کو نفس کی بہیمی خواہشات پر پورا غلبہ حاصل ہو جائے۔

نفس سماحت کی اس کیفیت کو ایک مستقل ملکہ بنالے۔ صوفیا نے اس خصلت کا نام زہد، حریت اور ترک دنیا بھی رکھا ہے۔

عدالت

عدالت ہی پر دنیا میں عادلانہ نظام اور سیاسی اصول وکلیات کا دارومدار ہے۔ عدالت کے بہت سے شعبے ہیں۔ ان میں سے ایک شعبہ ادب کا ہے۔ ایک آدمی اپنی حرکات وسکنات پر برابر نظر رکھتا ہے اور اس ضمن میں جو بہتر وضع ہوتی ہے اسے وہ اختیار کرتا اور اس پر چلتا ہے۔ جو بھی معاملہ اسے پیش آتا ہے اس میں وہ مناسب ترین پیرایہ اختیار کرتا ہے اور اس کی طبیعت کا فطری طور پر اسی طرف میلان بھی ہوتا ہے۔ اس شخص میں جب یہ کیفیت بطور عادت کے پیدا ہو جاتی ہے تو اسے ادب کہتے ہیں۔

انسان کا نفس ناطقہ خود اپنی فطرت کے تقاضے سے عادلانہ نظام اختیار کرے اور نہ صرف اختیار کرے بلکہ وہ اس نظام کو برسر کار لانے میں کوشاں بھی ہو۔ جس شخص میں عدالت کی خصلت بدرجہ

اتم پائی جاتی ہے۔ اس شخص پر ملا اعلی کے ان افراد کے دلوں سے سورج کی شعاعوں کی طرح نور کی بارش ہوتی ہے۔ جو شخص دنیا میں عادلانہ نظام کی مخالفت کرتا ہے۔ اس شخص پر ظلمت و تاریکی کی بارش ہوتی ہے۔

ا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے صفت طہارت کے اکتساب کے لئے وضو، غسل اور اس طرح کی اور چیزیں ضروری قرار دی ہیں۔ خشوع و خضوع کی خصلت کے حصول کیلئے نمازیں، نوافل، دعاو مناجات، تلاوتِ قرآن، ذکرواذکار اور توبہ واستغفار وغیرہ کے اعمال مشروع فرمائے ہیں۔

۲۔ اسی طرح سماحت کے حصول کیلئے عفو درگزر، ایثار، انفاق، حسن خلق اور اس طرح کے دیگر اخلاق حسنہ معین کیے ہیں۔

۳۔ عدالت کی خصلت پیدا کرنے کے لئے شارع علیہ الصلوۃ والسلام نے بیماروں کی عیادت کا حکم، ہر ایک کو السلام علیکم کی تلقین اور اس کے علاوہ کئی شرعی حدود اور آداب معین کیئے ہیں۔

ایک شخص ہے جس نے صفت 'احسان' کو جو نور طہارت اور خلاصہ مناجات سے عبارت ہے جان لیا پھر اس نے 'احسان' کی اس صفت کو حاصل بھی کر لیا لیکن وہ کسی وجہ سے 'احسان' کی کیفیت کو اپنے اندر نہیں پاتا اگر پاتا بھی ہے تو بہت کم درجے میں۔ اس شخص کو چاہئے کہ وہ اس امر کی تحقیق کرے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اگر اس کا سبب

ا۔ اس شخص کی طبیعت کی سرکشی ہے تو وہ اس کا تدراک روزوں کے ذریعے کرے۔

۲۔ اگر شہوانیت کا غلبہ ہے تو اس کا مداوا نکاح سے کرے۔

۳۔ اگر صفت احسانکی یہ حالت لوگوں کے ساتھ بہت زیادہ اٹھنے بیٹھنے سے ہوئی ہے تو وہ اعتکاف اور خلوت میں بیٹھے اور لوگوں سے ملنا جلنا بھی کم کردے۔

۴۔ اس کے دماغ میں ادھر ادھر کے چند پریشان کن خیالات جمع ہو گئے ہیں اور اس کی صفت احسان پر برا اثر پڑا ہے تو وہ کافی عرصے تک ذکرواذکار اور عبادات کرے۔

۵۔ اہلِ وطن کے رسوم ورواج اور گردوپیش کے حالات نے طبیعت پر اثر کیا ہے اور یہی چیز کیفیت

احسان میں مخل ہو رہی ہے تو اسے چاہئے کہ عارضی ہجرت کرے یا خلوت اختیار کرے اور فکر و مراقبہ کی کثرت کرے۔

سات نفسوں کا بیان

اللہ تعالیٰ نے انسانی قالب میں عقل، قلب اور روح نفسکو بھی ایک مستقل جوہر کے طور پر پیدا فرمایا ہے۔اس کی سات اقسام ہیں۔

۱۔ نفسِ امارہ -------- لَااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ --------نیلا رنگ

۲۔ نفسِ لوّامہ-------- یااللہ --------زرد رنگ

۳۔ نفسِ ملہمہ-------- ھو --------سرخ رنگ

۴۔ نفسِ مطمئنہ-------- حق --------سفید رنگ

۵۔ نفسِ راضیہ-------- یاحیُّ اَنتَ الحیُّ --------سبز رنگ

۶۔ نفسِ مرضیہ-------- یاقیومُ --------کالا رنگ

۷۔ نفسِ کاملہ-------- یاقہّار --------بے رنگ

۱- نفسِ امارہ: یہ سات اقسامِ نفس میں سے پہلا نفس ہے۔ یہ سب سے زیادہ گناہوں کی طرف مائل کرنے والا اور دینوی رغبتوں کی جانب کھینچ لے جانے والا ہے۔فواحش ومنکرات، لذات وشہوات اور جملہ بدکاریوں کی طرف بھی یہی نفس راغب کرتا ہے۔نفسِ امارہ سے خلاصی پانے کیلئے مؤثر ذکر' لَااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ' ہے۔اور اس کا نور نیلے رنگ کا ہے۔

2- نفسِ لوامہ: یہ دوسرا نفس ہے۔ اس مقام پر دل میں نور پیدا ہو جاتا ہے جو باطنی طور پر ہدایت کا باعث بنتا ہے جب نفسِ لوامہ کا حامل انسان کسی گناہ یا زیادتی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے تو اس کا نفس اسے فوری طور پر سخت ملامت کرنے لگتا ہے۔ یہ اچھا نفس ہے، یہ نیکی اور بدی میں تمیز کرتا ہے بلکہ اپنے داخلی نور کے باعث بدی سے نفرت بھی پیدا کرتا ہے۔نفسِ لوامہ سے خلاصی

پا کر آگے ترقی کرنے کیلئے مؤثر ذکر 'یا اللہ' ہے۔ اور اس کا نور زرد رنگ کا ہے۔

3- نفسِ ملھمہ: یہ تیسرا نفس ہے۔ یہ دل میں نیکی اور اطاعت کے خیالات ڈالتا ہے۔ جس طرح نفسِ لوامہ اپنے داخلی نور کے باعث بدی سے نفرت پیدا کرتا ہے اسی طرح نفسِ ملھمہ اپنے داخلی نور کے فیض سے دل اور طبیعت میں نیکی اور تقوی کی رغبت پیدا کرتا ہے اور نیک خیالات کو اچھے خوابوں کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ نفسِ ملھمہ کیلئے مؤثر ذکر اسم 'ھو' ہے۔ اس کا نور سرخ رنگ کا ہے۔

4- نفسِ مطمئنہ: یہ چوتھا نفس ہے جو بری خصلتوں سے بالکل پاک اور صاف ہو جاتا ہے، نیک اور پاکیزہ خصائل سے متصف ہو جاتا ہے۔ اور بارگاہِ الٰہی سے اپنا ربط و تعلق قائم کر کے حالت اطمینان پر فائز ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اسے نفسِ مطمئنہ کہا گیا ہے۔ 'حق' نفسِ مطمئنہ کا مؤثر ذکر ہے اور اس کا نور 'سفید رنگ' کا ہے۔

5- نفسِ راضیہ: یہ پانچواں نفس ہے۔ بعض صوفیا نے نفس کی مختلف اقسام کی بجائے مطلقا نفس کو ایک ہی مانا ہے۔ 'نفسِ راضیہ' وہ نفس ہے جس میں باری تعالی کے جملہ فیصلوں پر اور اسکی مشیت کے تمام احکام پر راضی اور خوش ہونے کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر حال میں اللہ تعالی سے راضی رہنے کے باعث اسے 'نفسِ راضیہ' کا نام دیا گیا ہے۔ اس کی تسبیحات 'یا حی انت الحی' کے کلمات کے ساتھ کی جائیں۔ اور اس کا نور 'سبز رنگ' کا ہے۔

6- نفسِ مرضیہ: یہ چھٹا نفس ہے اور یہی نفس کا سب سے کامل درجہ ہے۔ جب نفس انسانی حال میں اللہ سے راضی رہنے لگتا ہے اور اسکے مقام رضا میں لغزش یا تزلزل نہیں آتا تو مقام کی یہی استقامت اسے 'مرضیہ' کے درجہ پر فائز کر دیتی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے: **كَانَ يَأْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا** ۔ (مریم،۱۹:۵۵)

وہ اپنے اہل وعیال کو نماز اور زکوۃ کا حکم فرماتے تھے اور وہ اپنے رب کے حضور مقام مرضیہ پر فائز تھے۔(یعنی اللہ ان سے بہت راضی تھا)۔

نفسِ مرضیہ کے مؤثر ذکر کا اسم 'قیوم' کی تسبیحات کی صورت میں کیا جائے۔اور اس کا نور 'سیاہ رنگ' کا ہے۔

7- نفسِ کاملہ (صافیہ): یہ ساتواں نفس ہے اور یہی آخری کاملیت کا آخری مقام ہے۔

ارشاد ہے:

اے نفسِ مطمئنہ ! اپنے رب کی طرف راضیہ ومرضیہ کی حالتوں میں لوٹ آ۔ پھر تو میرے (کامل) بندوں میں داخل ہو جا اور میری (اعلیٰ) جنت میں بسیرا کر لے۔

سیدنا غوث اعظم جیلانی نے فرمایا ہے کہ جنت کی چند اقسام اور درجات ہیں۔

۱۔ جنت الماویٰ

۲۔ جنت النعیم

۳۔ جنت الفردوس

۴۔ القربہ

اہلِ قربت کر روح، ریحان اور جنت نعیم تینوں نعمتیں بیک وقت عطا ہونگی۔ حقیقت یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے 'وَادخُلِی جَنَّتِی' (اور میری جنت میں آجا) کے الفاظ میں اسی آخری مقام یعنی 'منزل قربت وراحت' کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔'یا قہار' نفسِ کاملہ صافیہ کیلئے مؤثر ذکر ہے۔اور اس کا نور 'بے رنگ' ہے۔

نفسِ کاملہ، مقامِ محمدیت اور حضرت الوہیت

جب نفسِ مرضیہ وارد حقیقت کا سفر مکمل کرتا ہے تو وہ عالم جبروت کے درجات کی تکمیل کر لیتا ہے جب وہ اس کنارے پر پہنچتا ہے تو اسے 'فادخلی فی عِبادِی' کی ندا سے 'عالم لاہوت' میں داخل کر لیا

جاتا ہے جہاں اسے قربت خاصہ کے حریم میں بٹھایا جاتا ہے، یہی مقام کاملہ ہے یہاں اس سے جملہ حجابات اٹھا دیئے جاتے ہیں۔ ان تمام حجابات کے اٹھتے ہی اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ 'ورود محمدیت' کے سمندر میں آ گیا ہے۔

'ورود محمدیت' کا مقام جو منازل شریعت، مقامات طریقت، 'مراتب معرفت' اور 'درجات حقیقت' سب سے بلند ہے اسی سے آگے 'حقیقت محمدیت' ہے یہ مقام ایک ہزار نور کے پردوں میں مخفی ہے، جن کے بارے میں حضرت سلطان العارفین شیخ بایزید سطامی فرماتے ہیں کہ میں نے 'حقیقت محمدیت' کے مقام کو جاننے کیلئے ان ایک ہزار حجابات نور میں سے پہلے پردے کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا تو مجھے بتایا گیا کہ اگر تم پہلے پردے کے بھی قریب جاگے تو جل کر راکھ ہو جاگے۔

(جواہر البحار، امام یوسف بن اسماعیل نبہانیؒ)

'حقیقت محمدیت' تک کسی کی رسائی نہیں ہوتی وہاں جبرئیل امین کے پر بھی جلتے ہیں۔ پھر اس 'حقیقت محمدیت' کے اوپر 'حضرت الوہیت' ہے۔ یہ حقیقت امکان ہے اور وہ حقیقت وجوب۔ یہ حقیقت عبدیت ہے اور وہ حقیقت معبودیت یہ دونوں حقیقتیں آپس میں کس طرح ملاقات اور وصال کرتی ہیں کسی کو خبر نہیں کیونکہ سب سے زیادہ باخبر ملائکہ بھی سدرۃ المنتہی پر روک دیئے جاتے ہیں۔

1-ان کی ملاقات کبھی 'دَنیٰ' اور 'تدَلّیٰ' (دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوئے) کے رنگ میں ہوتی ہے۔

2-اور کبھی 'قابَ قوسینِ' (وہ ملاقات دو کمانوں کی مانند) قربت میں بدل جاتی ہے۔

3-اور کبھی 'اَوْ اَدنیٰ' (یا اس سے بھی قریب تر) فرما کر سوچنے والوں کی سوچ پر اور بولنے والوں کی زبانوں پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔

تاریخ جمالیات

مقدمہ

Aesthetics کے لغوی معنی ہراس چیز کے ہیں جس کا تعلق حِس سے اور بالخصوص حسِ لطیف سے ہو۔ Aesthetics کا موضوع حسن اور فنون لطیفہ ہے۔اول اول ہیگل نے اس لفظ کو فلسفہ فنون لطیفہ کے معنوں میں استعمال کیا۔اسی رعایت سے عربی اور اردو میں اس کا ترجمہ جمالیات کیا گیا۔اوراب اس کو اردو میں قبول کرلیا گیا ہے۔ جمالیات فلسفہ ہے حسن اور فنکاری کا۔ یہ تعریف بہت مختصر اور مبہم ہے۔ حسین چیز ایک ابدی مسرت ہے۔تشبیہات و استعارات کے پردوں کو ذرا ہٹا کر سینیے تو معلوم ہوگا سب ایک ہی بات کہہ رہے ہیں۔حسن فاتح عالم ہے۔یہودیوں کے مطرب پیغمبر کا تو یہ کہنا ہے کہ صیہون یعنی کمالِ حسن سے خدا جلوہ گر ہوا۔

بعضوں نے حسن کی کیمیاوی تحلیل کی اور کہا حسن ایک مقناطیسی کشش ہے۔پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ حسن تناسل اور جہد للبقا کی گراں باری اور تکان کو محسوس نہیں ہونے دیتا۔

حسن مجرد ہے، مطلق ہے، لامحدود ہے۔ وہ ایک مارج طاری حقیقت ہے جس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔صناع جانتا ہے کہ حقیقت ہاتھ لگنے والی چیز نہیں اور اگر ہاتھ لگے بھی تو خلق اللہ کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

کنفوشئیس جو چین والوں میں اب تک نبی مرسل سمجھا جاتا ہے اور جس کا زمانہ مسیح سے تقریبا چھ سو سال پہلے بتایا جاتا ہے: اپنی کتابوں میں تہذیب نفس اور تزکئیہ اخلاق کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ کی تعلیم دیتا ہے۔

یونان اور روم میں

جمالیات کا تاریخی ارتقا

حسن اس چیز کا نام ہے جو کسی غرض کو پورا کرے۔اور دوسرا قول یہ ہے کہ:

علم وحکمت کی بدولت انسان کی روح آزاد رہتی ہے اور خیر اعلی تک پہنچ جاتی ہے۔شاعری میں اگر حکیمانہ خیالات کا اظہار کیا جائے تو شاعری بھی حکمت وفلسفہ کی طرح خیر و برکت کا سبب بن سکتی ہے ورنہ نہیں۔

فلاطینوس کا خیال ہے کہ خدا اور مادہ دونوں حقیقی وجود رکھتے ہیں، مادہ خدا نہیں ہے مگر خدا کی ذات سے نکلا ہے۔یعنی مادے میں الوہیت موجود ہے جب ہستی الٰہی کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک پڑتا ہے تو کائنات کا وجود ہوتا ہے۔ہستی کی غایت دوبارہ پھر اسی الوہیت یا نفس کل میں مل جانا ہے۔خدا سے ہستی کا جو صدور ہوتا ہے اس کی تین منزلیں ہیں:

(۱) روحانیت (۲) حیوانیت (۳) جسمانیت

مصور اور شاعر جب کسی چیز کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں تو وہ اپنی اصل مجازی ہیئت سے زیادہ پر کیف ہوتی ہے اس لئے کہ اس میں حقیقت کے بعض وہ رخ بھی آجاتے ہیں جو مجاز میں چھپ کر رہ گئے ہیں۔

حسن تناسب یا توازن کا نام نہیں۔حسن صرف مادی اشیا میں پایا جاتا ہے۔حسن کے معانی ہیں لطیف کے کثیف پر اور اعلی کے ادنی پر حاوی ہونے کا جب تصور مادہ پر اور روح جسم پر خیر شر پر غالب ہو تو اس کو حسن سمجھو اور اگر یہ نظام الٹ جائے تو اسی کو قبح سمجھو، حسن کا تعلق باطن سے ہے نہ کہ ظاہر سے، عالم باطن عالم ظاہر سے برتر ہے۔فنون لطیفہ کا موضوع چونکہ حسن ہے اس لئے ان کا تعلق بھی عالمِ باطن سے ہے۔شاعر کو عالمِ باطن کی کیفیتیں نظر آتی ہیں اور اسی بصیرت کا نام شاعری ہے۔

ازمنہ وسطی

اور نشاۃ الثانیہ

ازمنہ وسطی کے تمام خیالات ونظریات صرف بازگشت صدائیں ہیں، حکمائے یونان کی اور بالخصوص مشاہیئت اور اشراقیت کے آثار سارے دور پر چھائے ہوئے ہیں۔ گویا یونانیت نے ادھر آخری سانس لی۔ ادھر اس کی روح مسیحیت کے قالب میں آ گئی۔ انجیلی تعلیم پر کبھی اشراقیت کا رنگ چڑھتا رہا اور کبھی مشائیت کا۔

آگسین سارے کائنات میں حسن دیکھتا ہے وہ وحدۃ الوجود کا قائل ہے وحدت کیلئے کثرت کا ہونا ضروری ہے۔ کثرت ہی نہیں بلکہ تضاد وتخالف کا بھی ہونا ایک قدرتی بات ہے اس سے کائنات کا حسن قائم ہے۔ حسن نام ہے تنوع تلون کا۔ زندگی میں جتنی برائیاں جتنی مصیبتیں اور جتنی بدنمائیاں ہیں وہ سب حسن کائنات کے عناصر ترکیبی ہیں۔ حسن ایک آہنگ ہے جو مختلف اور متضاد سروں سے مرکب ہے۔ حسن نام ہے خوش آہنگی کا جو عالمِ عناصر میں مادی توازن اور جسمانی تناسب کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ حسن ہم کو آسودگی بخشتا ہے۔ اس کے معنے یہ بھی ہوتے ہیں کہ حسین چیزیں ہماری جسمانی خواہشوں کو آسودہ کرنے کے لئے بنی ہیں۔

تیرھویں صدی سے لے کر سولھویں صدی تک سکوت اور غفلت کا دور ہے۔ نشاۃ الثانیہ کا دور کرب واضطراب کا دور تھا، دنیا تذبذب اور بے اطمینانی کی کڑی منزل سے گزر رہی تھی۔

دور جدید کروچے سے پہلے

شاعری کو بیکن خواب وخیال کی بات کہتا ہے، اس کا تعلق علم وحکمت سے نہیں بلکہ حسیات سے ہے، شاعری ہمارے لئے سامانِ لطف فراہم کر دیتی ہے اور بس ! شاعری موسیقی، مصوری، غرضیکہ تمام فنون لطیفہ کا کام سوائے جی بہلانے کے اور کچھ نہیں۔ بیکن کے خیال میں

انسانی ذہن کے تین حصے ہیں۔اور تینوں کے وظائف الگ الگ ہیں۔

(۱) تخیل شاعری پیدا کرتا ہے　　(۲) حافظہ تواریخ　　(۳) عقل فلسفہ

تخیل اور اس کے کرشموں کو وہ نفس حیوانی کے اشتعال کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ کھلم کھلا اس نے شاعری کو بیخ دین سے مٹا ڈالنے کی تلقین تو نہیں کی ہے مگر اس کو عقل کے تابع رکھنے کی سخت تاکید کی ہے۔ یہ اس تحریک بیداری کا خالص نتیجہ تھا جس کو نشاۃ الثانیہ کہا گیا ہے۔ یہ دور عقلیت کے زور سے اندھا نظر آتا ہے اور جہاں دیکھیے استشہار اور استدلال کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ ذوق حسن ایک فطری قوت ہے۔ جو عقل اور حواسِ ظاہری دونوں کے درمیان ہے۔ جسم، روح اور خدا حسن کے تین مدارج ہیں اور تینوں اپنا جداگانہ اعتبار رکھتے ہیں۔

افلاطون نے شاعری کو نفس حیوانیکی چیز بتایا تھا، وائیکو نے شاعری کو اسفل السافلیں سے ابھارا اور اعلی علیین میں پہنچا دیا۔

شاعری شعور کے ارتقا کی تاریخ میں ایک لازمی منزل ہے جو حسن کے بعد اور عقل سے پہلے آتی ہے۔ افلاطون نے شاعری کو حسِ ادنی کی پیداوار سمجھ کر اپنی جمہوریت سے خارج کر دیا تھا۔ وائیکو نے افلاطون کی غلطی کو بے نقاب کیا۔ وہ کہتا ہے پہلے ہم محسوس کرتے ہیں پھر ہم کو مشاہدہ ہوتا ہے اور اس کے بعد ہم عقل سے کام لیکر قیاس وفکر کرتے ہیں۔ شاعری مشاہدہ کا نتیجہ ہوتی ہے اور اس کی امتیازی شان یہ ہے کہ اپنے کو جزئیات تک محدود رکھے۔ عقل حقیقت کو پرزے پرزے کر دیتی ہے۔

وائیکو نے شاعری اور مابعد لطبیعیات کو ایک دوسرے کی ضد بتایا ہے وہ کہتا ہے شعرا کو بنی نوع انسان کی حس لطیف اور حکما کو اس کی عقل کہا جا سکتا ہے۔ جتنا ہی زیادہ عقل کمزور ہوگی اتنا ہی زیادہ تخیل قوی ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جوں جوں دنیا میں عقلیت کا زور ہوتا گیا وجدانیت کمزور پڑتی گئی اور شاعری مٹتی گئی۔ حکمت وفلسفہ کے دور سے پہلے شاعری یا صناعی کا دور تھا۔ ہومر کچھ کم

دانا نہ تھا مگر اس کی دانائی شاعری تھی۔

ونکل مان کے نظام فکر میں ایک بات بالکل نئی ہے اور جو قابل توجہ ہے یہ ہے کہ وہ عورت کے حسن پر مرد کے حسن کو ترجیح دیتا ہے اس لئے کہ اس کے خیال میں مرد اس حسن ازل کا بہترین مظہر ہے۔

حس عقل اور ارادہ دونوں سے مختلف ہے اور اپنی ایک جداگانہ ہستی رکھتی ہے۔ جمالی حس، عقل اور ارادہ میں صرف ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ تینوں کی بنیاد کلیۃ ذہنی ہے۔ عقل حقیقت کی تلاش کرتی ہے۔ ارادہ خیر کی۔ اور جمالی حس حسن کی۔ لیکن جس طرح حقیقت اور غیر ذہن کی خود ساختہ صورتیں ہیں اسی طرح حسن بھی ذہن کی پیدا کی ہوئی صورت ہے۔ جمالی حس سے باہر حسن کا کوئی وجود نہیں۔

کانٹ نے جمیل اور جلیل میں ایک امتیاز قائم کیا ہے۔ جمیل سے ہمارے اندر ایک ہم آہنگی کا احساس پیدا ہوتا ہے جس سے ہماری روح کو سکون ہوتا ہے، برخلاف اس کے جلیل سے بے ربطی اور عدم تناسب کا احساس ہوتا ہے اور ہمارے اندر ایک ہیجان، ایک تلاطم پیدا ہو جاتا ہے۔

فنونِ لطیفہ کیا ہیں؟ اس کا جواب وہی ہے جو بام گارٹن دے گیا تھا۔ یعنی حکمت و منطق کی ابتدائی صورتیں ہیں۔ چنانچہ کانٹ کہتا ہے کہ شاعری حس اور فکر کے اختلاط سے وجود میں آئی۔ کانٹ جمالیات اور منطق کو علم انسانی کی دو ہمزاد شاخیں مانتا ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ حقائق کی تلاش کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ سورج سمندر میں ڈوب گیا۔ شاعری کی اصلاح میں یہ اتنا ہی صحیح ہے جتنا طبیعیات کی اصطلاح میں غلط ہے۔ شاعری ہمارے منطقی تصورات کے لئے ایک حسی نقاب ہے جس پر تخیل نے تشبیہات و استعارات سے رنگ برنگ کے بیل بوٹے بنائے ہیں۔ شاعری کا کام فضائل اخلاق اور تصورات عقلی جیسی غیر محسوس چیزوں کو محسوس بنا دینا ہے۔ شاعری کسی بھدی صورت یا کسی غم ناک واقعہ یا کسی مخرب اخلاق بات کو حسین اور دل نشین پیرایہ میں بیان کر سکتا

ہے۔

فنون لطیفہ میں تین چیزوں کی ضرورت ہے: ۱۔حس ۲۔تخیل ۳۔ذوق

ذوق حس اور تخیل کو باہم مربوط کرتا ہے۔

اس بحث میں کانٹ کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ تخیل کی واضح تعریف نہیں کرسکا ہے۔ کانٹ اس قدر تسلیم کرتا ہے کہ عقل سے علیحدہ بھی ایک قوت ہے جس کو وجدان کہتے ہیں اور جو نہ تو عقل ہے اور نہ حس۔ بلکہ دونوں کے درمیان کا رابطہ ہے۔

کانٹ نے حسن کی چار حدیں متعین کی ہیں اور اس طرح گویا حسن کی ایک تعریف پیش کی ہے۔

ان میں سے دو سلبی (Negative) ہیں:

(۱) اس چیز کو حسین کہتے ہیں جو بغیر کسی غرض وغایت کے ہم کو مسرور کر سکے۔ یہ لذتیوں اور افادیوں کے نظریہ حسن کی تردید ہے۔

(۲) وہ چیز حسین ہے جو بغیر کسی خاص تصور کے ہم کو مسرور کر سکے۔ یہ عقلیت کے حامیوں کا جواب تھا۔

اس طرح کانٹ نے ایک ماورائی عالم کا وجود تسلیم کیا جو ایک روحانی عالم ہے اور جو جسمانی لذاتِ مادی نفع وضرر اور عقلی تصورات کے حدود سے بالاتر ہے۔

حسن کی دو ایجابی حدیں یہ ہیں:

(۱) وہ چیز حسین ہے جو بظاہر ایک انتہا کا پتہ دے۔ لیکن دراصل کہیں کوئی انتہا یا غایت نہ ہو۔

(۲) وہ چیز حسین ہے جو انبساط کلی کا سبب ہو سکے۔

کروچے کا نظریۂ جمالیات

بیسویں صدی کے اوائل کی سب سے زیادہ حیرت ناک خصوصیت یہ رہی ہے کہ انسان کی روزمرہ کی زندگی میں جتنا ہی زیادہ مادیت اور افادیت کا استیلا ہے اتنا ہی زیادہ انسان مادیت

اورافادیت سے بیزار ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کیمیا اور طبیعیات جن کا موضوع صرف مادیات بتایا جاتا ہے مادہ سے اگر قطع نظر نہیں کر رہے ہیں تو کم ازکم یہ کوشش ضرور کی جارہی ہے کہ مادہ کو جہاں تک ممکن ہو لطیف بنایا جائے۔اب تک وہ ایثریہ (ETHEREON) پہنچے ہیں اور بہتیرے ایسے ہیں جو اس جوہر لطیف کو بھی ایک قسم کی قوت بتاتے ہیں۔

بریڈلے نے حقیقت پر علمیاتی (EFISTEMOLOGICAL) نظر ڈالی ہے اور اپنی معرکتہ الآرا تصنیف مظہر اور حقیقت (APPEARANCE & REALITY) میں یہ ثابت کیا ہے کہ جس چیز کو منطق مابعد الطبیعیات اور اخلاقیات نے حقیقت سمجھ رکھا ہے وہ دراصل حقیقت نہیں ہے کیونکہ اگر غور کیا جائے تو وہ آپ اپنی تردید کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔اور جو چیز آپ اپنی تردید کرے وہ مظہر ہوتی ہے نہ کہ حقیقت۔ حقیقت ایک روحانی چیز ہے۔ حقیقت روحانی دنیا کی چیز ہے اور یہ رہنمائی دنیا دنیائے انسانیت سے باہر نہیں جیسا کہ اگلے زمانہ کے متصوفین سمجھتے رہے بلکہ دنیائے انسانیت کے اندر ہی موجود ہے۔ آئیکن روحانیت کو کوئی مجہولی کیفیت یا محویت واستغراق نہیں مانتا۔

فرانس کا مشہور حکیم بیرگسان بھی حقیقت اولی کو ایک قوت حیاتیہ EL ANVITAL کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ یہ قوت حیاتیہ سارے ہنگامہ ہستی کی جڑ ہے اس قوت کو کہیں ایک جگہ قرار نہیں۔ زندگی کی ماہیت جاننے کیلئے وجدان ہے۔ شاعر کا وجدان بیک وقت اور بیک نگاہ زندگی کے پورے بہاؤ پر محیط ہوجاتا ہے۔

وجدان کا کام تشخیص اور فردیت اور صورت پیدا کرنا ہے وجدان کا دوسرا نام اظہار ہے۔اظہار کے لفظ سے لوگ دھوکے میں پڑ جائیں گے۔ اظہار سے عموماً الفاظ میں بیان کرنا سمجھا جاتا ہے۔ یہ مفہوم بہت تنگ ہے۔ مصور رنگ اور خطوط کے ذریعہ سے اور بھاکے ذریعہ سے اسی چیز کا اظہار کرتا ہے جس کا اظہار شاعری الفاظ میں کرتا ہے۔ یہ وجدان یا قوت اظہار ایک حد تک ہر

کس و ناکس میں ہے۔ مگر ناقص ہے صناع میں یہی ملکہ سجد کمال موجود ہوتا ہے۔ مصور مصور اس لئے ہے کہ وہ اس چیز کو پوری دیکھتا ہے جس کی عوام صرف ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ وجدان اظہار اور صورت آفرینی کے ملکہ کو کہتے ہیں۔ وجدان عقل کی غلامی سے آزاد اور واقعی اور غیر واقعی۔ تجربی اور تخیلی کے امتیاز سے بیگانہ ہے۔

جدلیاتی مادیت اور جمالیات

انسان تمام اشیا کا پیمانہ ہے۔ فن کاری ایک ماحول سے پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے۔ وہ ماضی اور مستقبل دونوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس میں جبراً اور اختیار دونوں کی علامتیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے اندر اجتماعی شعور اور انفرادی ارادہ دونوں یکساں طور پر کارفرما ہوتے ہیں۔ فن کاری میں خارجی اور داخلی، نظری اور عملی، مادی اور تصوری افادی اور ذاتی، روائتی اور انقلابی عناصر باہم شیر وشکر ہوتے ہیں۔ یہ تہ در تہ تنوعت فن کاری کا اصلی مزاج ہے۔

تبصرہ وتصفیہ

قدرت کی پیدا کی ہوئی تمام مخلوقات میں انسان سے زیادہ نازک، اس سے زیادہ مجبور اور ہر طرح کے آفات ارضی وسماوی میں گھری ہوئی۔ اور اس سے زیادہ غیر محفوظ کوئی دوسری مخلوق نہیں ہے۔

فن کاری کی ابتدا براہ راست محنت سے وابستہ ہے۔ وہ محنت جس نے انسان کی زندگی کو دوسرے مخلوقات کی زندگی سے زیادہ عظیم، زیادہ مقدس، زیادہ مبارک اور مستقل طور پر زیادہ خوش آئندہ بنایا، ظہور انسان کے ابتدائی ایام میں ہمارے نیم حیوان اسلاف اتنے شریف النفس نہیں تھے جتنا کہ ہم سمجھے ہوئے ہیں، خوفناک غیر انسانی مخلوقات میں ایک اجنبی اور بے بس مخلوق کی حیثیت سے ان کو اپنی زندگی گزارنا تھی۔ میمتھ، ماستووں، دیناسار، گینڈے، خنجر نما دانت رکھنے والے چیتے، شیر، دیوزاداژدہے اور دوسرے خونخوار جانور ہر وقت ان کو کھا جانے کے لئے تیار تھے۔ شدید

سردی سخت گرمی، دل ہلا دینے والی بادل کی گرج، بینائی اچک لے جانے والی بجلی کی چمک، بھیانک اندھیرا، ان مہیب اور مہلک قوتوں سے محفوظ رہنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس پر مصیبت یہ کہ بھوک اور پیاس رفع کرنے کے لئے پریشانی اور متواتر ناکامی کے عالم میں دن کے دن اور رات کی رات دوڑ دھوپ میں گزار دینے کے بعد مشکل سے وہ اپنے لئے سامان خورد نوش مہیا کر پاتے تھے جو عموماً ناکافی ہوتا تھا۔ قدیم انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ ناگزیر اور اہم محرکات بھوک اور خوف تھے۔

ایسے حالات اور اسباب میں رہ کر انسان قدرتی طور پر بزدل، خودغرض، حریص، جھگڑالو، اچکا اور فریبی تھا، وہ حیوانات میں سب سے زیادہ کمینہ اور بداطوار حیوان تھا۔ دوسروں کی خوراک چرا لینے، صرف اپنے لئے غذا فراہم کرنے کی غرض سے دوسروں کو، کبھی کبھی خود اپنی اولاد کو بے دردی اور فسادات کے ساتھ مار ڈالنے میں اس کو کوئی دریغ نہ ہوتا تھا۔

کائنات میں جتنے موجودات انسان کو ضرر پہنچانے والے ہیں اور اس کی بقا اور بہبود کے راستے میں جتنے حائلات اور مزاحم ان کو زیر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ مل کر زندگی بسر کریں، اور متفقہ سعی و پیکار سے تمام مرد آزاد طاقتوں کا مقابلہ کریں اور ان پر قابو پائیں۔ اس شعور نے انسان کو جلد ہی جماعت آرائی پر مجبور کر دیا۔ یہیں سے سماجی شعور کی ابتدا ہوتی ہے اور یہی پہلا معاہدہ عمرانی ہی انسان کے ان مساعی جمیلہ کی بنیاد جن کو فنون لطیفہ کہتے ہیں تمدنی تاریخ کے اسی دور میں پڑی۔ فن کاری خلقی طور پر دو عنصری ہے، وہ ایک مرکب ہے۔ دوسرے اجزا داخلی اور انفرادی ہیں۔ ایک کو بسائط سمجھنے اور دوسرے کو عوامل۔ فن کاری کے مزاج میں خارجی مواد اور داخلی محرکات دونوں یکساں داخل ہیں۔ فن کاری واقعہ اور تخّیل کا امتزاج ہے۔

لیکن سو حقیقتوں کی ایک حقیقت یہ ہے کہ جب انسان نے آدمیت کا رنگ روپ پایا وہ اجتماعی رہا، اور اپنے اجتماعی نظام کو روز بروز زیادہ وسیع، زیادہ مستحکم اور زیادہ مہذب بناتا رہا ہے۔ انسان جو

تخلیقی کوشش کرتا ہے ان میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک اجتماعی میلان یا غایت نمایاں یا پوشیدہ ضروری ہوتی ہے اگر ایسا نہیں تو اس کی ہر کوشش ساقط الاعتبار ہے۔ انسان اور دوسرے جانوروں کے درمیان یہ بہت بڑا فرق ہے، فن کاری میں بھی یہ فرق ملے گا۔ بہت سے ادنی درجے کے جانور بھی مثلاً دیمک، شہد کی مکھی، بھڑ اور بیا ہیں جو جبلی طور پر فن کار ہیں، لیکن ان کی فن کاری اضطراری ہوتی ہے اور صرف ذاتی ضرورت اور مفاد پر مبنی ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اپنی فوری ضرورت سے مجبور ہو کر یا اپنی نسل بقا اور تحفظ کے لئے کرتے ہیں، برخلاف اس کے انسان کی فنی کوششیں اس کی ذاتی مسرت اور راحت کا بھی ذریعہ ہوتی ہیں اور پوری جماعت بلکہ اکثر تمام بنی نوع انسان کے لئے خیر و برکت کا سبب ثابت ہوتی ہیں۔

لیکن یہ ادنی درجے کے جانور جو کچھ کرتے ہیں اپنی ذاتی یا زیادہ سے زیادہ اپنی اولاد کی فوری ضرورتوں کو رفع کرنے کے لئے کرتے ہیں، ان کی کوششیں یک طرفہ ہوتی ہیں۔ انسان کے مساعی اجتماعی قدر لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ حیوان جو کچھ کرتے ہیں اپنی قدرتی جسمانی ضرورتوں کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کرتے ہیں، اور انسان یعنی مہذب انسان اپنی جسمانی ضرورتوں سے آزاد ہو کر فنی تخلیق کی طرف متوجہ ہوتا ہے، غیر انسانی حیوانات اپنی اپنی ذاتوں میں کھوئے ہوئے ہیں، وہ زیادہ سے زیادہ اپنے کو پھر سے پیدا کر سکتے ہیں، انسان ساری کائنات کی از سر نو تخلیق کر سکتا ہے۔ دوسرے جانور زیادہ سے زیادہ اپنی نوع کی ضرورت کو اپنی تخلیقات کا پیمانہ بناتے ہیں۔

قدرت کے اندر وہ آہنگ طبعی طور پر موجود ہے جس کو ہم حسن کہتے ہیں۔ افلاطون نے حقیقت، خیر اور حسن کی سہ گانہ تقسیم کر کے ہمیں مغالطے میں ڈال دیا، افلاطون نے ایک عالم تصورات یا عالم مثال کو قدیم اور واجب الوجود تسلیم کر رکھا تھا۔ جو عالم اجسام سے باہر ہے، اور جہاں ہر شے کا ایک ازلی تصور یا نمونہ موجود ہے، پھر ان تصورات سے بلند اور سب پر محیط تصورات کا تصور یا تصور اعلی ہے۔ حسن، خیر اور حقیقت اس تصور اعلی کے تین رخ ہیں۔ افلاطون سقراط کی طرح حسن کو خیر اور

حقیقت کے ماتحت تصور کرتا ہے۔حسن کے بارے میں سقراط کے دو اقوال ہیں ایک تو یہ کہ حسن وہ چیز ہے جو لوگوں کو بھلی معلوم ہو، دوسرا قول یہ ہے جو کسی غرض کو پورا کرے، اور غرض سے مراد عملی مفاد ہے۔

بعد کے اشراقیوں نے اس عالم مثال کے تصور کو اور زیادہ وسعت دی اور ہر ترقی یافتہ زبان میں بڑے بڑے شاعروں اور صوفیوں نے اس سحابی بنیاد پر رنگ برنگ کی نازک عمارتیں تیار کیں۔ان لوگوں نے ازلی حسن، لافانی حسن، لاہوتی حسن، حسن مطلق، حسنِ حقیقی وغیرہ جیسے بت تراشے جن کے آگے سر جھکانے والوں کی آج بھی کمی نہیں ہے۔

حسن تصور اور اس کی جسمانی شبیہ کے درمیان مکمل یگانگت کا نام ہے، یعنی حسن نہ تو تنہا تصور میں ہے، نہ تنہا جسمانی وجود میں بلکہ دونوں کی انتہائی ہم آہنگی میں ہے۔جو چیز زندگی کی بالیدگی اور فروغ میں معین نہ ہو وہ حسین نہیں ہوسکتی۔وہ چیز حسین ہے جس میں ہم اپنی زندگی کی تخئیل کی جھلک پائیں، وہ صورت حسین ہے جو ترقی پذیر زندگی کی علامت ہو اور جو ہمیں زندگی کی نت نئی توانائیوں کا احساس دلائے۔حسن بھی ایک جدلیاتی عمل ہے جس کے دو اجزا ہیں جو بیک وقت باہم مقابل اور رفیق ہیں۔حسن کا تصور نہیں ہوتا بلکہ حسین چیزوں کا وجود ہوتا ہے۔

حسن، خیر اور حقیقت کے درمیان ہزاروں برس سے جو فرق بتایا جا رہا ہے وہ کوئی اصلی اور اساسی فرق نہیں ہے۔وہ محض رخ اور زاویہء نظر کا فرق ہے۔تینوں کی اصلیت ایک ہے جو افادی ہے۔

گلدستہ تفاسیر میری رائے میں

(PHD) Post Doctorate.UK
0336-5359036

''گلدستہ تفاسیر'' ایک ایسی علمی اور روحانی کاوش ہے جو نہ صرف قرآن پاک کی گہری تفہیم کو عام فہم انداز میں پیش کرتی ہے، بلکہ قارئین کو اسلامی علوم کی خوشبو سے بھی مہکاتی ہے۔ اس کتاب کے مصنف، محترم سیف اللہ ضیاء صاحب، ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ایک کامیاب تاجر، فلاحی کارکن، اپنی برادری کے معروف رہنما اور نہایت ہمدرد دل رکھنے والے انسان ہیں۔ اسلامی تعلیمات سے ان کی گہری وابستگی اور مطالعہ کی لگن کا نتیجہ یہ کتاب ہے۔ ''گلدستہ تفاسیر'' ان کے کئی سالوں کے مطالعہ، تحقیق، اور غور و فکر کا نچوڑ ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے مختلف تفاسیر کا مطالعہ کر کے مختلف موضوعات پر ان تفاسیر کے خلاصہ کو آسان اور عام فہم انداز میں یکجا کیا ہے، خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو خود تفاسیر کے بڑے ذخائر سے فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ ایک اہم خصوصیت اس کتاب کی یہ بھی ہے کہ مصنف ہر لفظ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مثلاً ''بسم اللہ'' جیسے ایک ہی لفظ کے بارہ سے زائد پہلو پیش کیے گئے ہیں، جو ان کی علمیت اور موضوع پر مہارت کا ثبوت ہے۔ یہ کتاب صرف علم کا خزانہ نہیں، بلکہ ایک ایسی رہنمائی ہے جو ہر قاری کو قرآن کے قریب لانے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ سیف اللہ ضیاء صاحب اپنی علمی، دینی اور انسانی خدمات کا یہ سلسلہ جاری رکھیں۔ اور ان کی یہ کاوش دنیا و آخرت میں ان کے لیے صدقہ جاریہ بنے۔ قارئین کرام۔ اگر آپ قرآن فہمی کی راہ پر چلنا چاہتے ہیں، مگر روایتی تفاسیر کا مطالعہ آپ کے لیے مشکل لگتا ہے، تو ''گلدستہ تفاسیر'' ایک بہترین کوشش ہے۔ یہ کتاب علم اور حکمت کا حسین گلدستہ ہے، جو ہر گھر کی زینت بننا چاہیے اللہ تعالی اس کوشش کو قبول فرمائے۔ آمین

26 جون 2025

drshoaibahmed71@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

تاثرات

نَحۡمَدُهُ وَ نُصَلِّی عَلَی رَسُولِهِ ، أَمَّا بَعۡدُ:

تمام تعریفیں اس بابرکت اور مقدس ذات کے لئے جس نے قرآن پاک نازل فرما کر تمام مسلمانوں پر احسان فرمایا۔اور قیامت تک سینوں اور کتابوں میں اس کی حفاظت کا ذمہ لیا۔اور اس کی حفاظت کے تتمہ کے طور پر آقائے دوجہاں سید المرسلین ﷺ کی سنت کی حفاظت کا ذمہ بھی لیا۔

درودوسلام سرور کائنات محمد مصطفیٰ ﷺ پر کہ جن کی ذات مطہرہ پر کلام مقدسہ نازل فرما کر اللہ پاک نے اس کلام کا بیان اس کے سپرد کر دیا۔آپ ﷺ واضح اور روشن اسلوب کے ساتھ اپنے افعال ،اقوال،اور تقریرات کے ذریعے اُسے بیان کرنے کے لئے کمربستہ ہو گئے۔

درودوسلام (ہم راضی ہیں اور اللہ تعالیٰ راضی ہو ان وفادار جانثار مطیع اور فرماں بردار) صحابہ کرامؓ پر جنھوں نے پیارے حبیب ﷺ سے احادیث نبویہ کو حاصل کر کے اپنے مبارک سینوں میں محفوظ کیا۔اور بغیر کسی تحریف وتبدیلی کے ہر قسم کے عیوب سے پاک، ان احادیث کو اسی طرح بیان کیا جیسے سنا تھا۔خالق کائنات کی بے شمار رحمتیں نازل ہوں ان سلف صالحینؒ پر جنھوں نے احادیث مطہرہ کو نسل در نسل ، زمانہ در زمانہ نقل فرمایا۔اور داعیانِ باطل کی تحریف سے احادیث کو محفوظ رکھنے اور اس کے نقل وروایت کو سلامت رکھنے کے لئے عمدہ اور عمیق قواعد وضوابط وضع فرمائے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے حاجی سیف اللہ ضیاء کو جنھوں نے نہائت عرق ریزی سے 70 سے زائد قرآنی تفاسیر سے موتی چن کر، قرآن کریم کے تیسویں پارہ کی سورتوں ،سورۃ فاتحہ اور آیت الکرسی پر کی گئی بحث کو ایک جگہ اکٹھا کر کے کتاب ھٰذا کی شکل دے دی ہے۔دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول ومنظور فرمائے۔اور ان کے لئے یہ کتاب عقبیٰ میں سرخ روئی کا سامان ثابت ہو۔

نظام الدین (لسان القرآن کا ادنیٰ سا طالب علم)
0300-5196873

دین اور دین والوں سے محبت

حاجی سیف اللہ ضیاء صاحب دین اور دین والوں سے محبت اور عزت اور خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں ۔اور ایک علم دوست انسان ہیں ۔اس کے ساتھ ساتھ خدمت انسانیت میں ہر وقت ہمہ تن گوش رہتے ہیں۔

کسی بھی کتاب کے مطالعہ کرنے میں تمام چیزوں کا یاد رہنا اور ازبر ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ کچھ الفاظ اور عبارات ایسی ہوتی ہیں جو دل کو چھو لیتی ہیں اور انسان کی زندگی تبدیل کر دیتی ہیں۔

حاجی سیف اللہ ضیاء صاحب نے مختلف مستند اور معروف تفاسیر کے مطالعہ سے منتخب عبارات کو الگ کر کے اس کتاب میں جمع کیا ہے۔ جو یقیناً قارئین کے لئے استفادہ کا باعث ہوں گی۔

اللہ تعالی اس علمی کوشش اور کاوش کو قبول فرمائے اور انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ بنائے۔

مفتی خالد حسین

ناظم اعلی جامعہ علوم القرآن

مسجد الفرقان آئی ایٹ اسلام آباد

muftikhalidnoor@gmail.com

RAJ INTERNATIONAL Educational Institute (Regd) Trust

کامیابی کیسے ملے گی؟

سیف اللہ ضیاء

آفس نمبر 5، 2nd فلور، 80 ویسٹ ملک کمپلیکس بلو ایریا اسلام آباد۔

E-mail: saifullahzia1@gmail.com

اسلامی تعلیمات (قرآن وحدیث)

سیکھنے کا سہل اور آسان طریقہ

www.quranraj.com

قرآن پاک کے موضوعات، پیغامات اور مضامین تلاش کرنے اور مختلف موضوعات پر احادیث سے رہنمائی لینے کے لئے راج انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیر اہتمام انٹرنیٹ پر ایک خصوصی ویب سائٹ جب کہ موبائل سافٹ ویئر Android اور iPhone کے لئے خصوصی Apps تیار کی گئی ہیں۔ مذکورہ ویب سائٹ پر تمام معلومات بلا معاوضہ دستیاب ہیں اسی طرح Google Play Store سے Android Apps اور iPhone مفت Download کی جاسکتی ہیں۔

Search Quran Application and
Search Hadees Application and
Quran Encyclopedia Application
Search whole Holy Quran and Hadees by any Ayat, Word or Topic to seek guidance in English, Urdu and Arabic with translation.

قرآن مجید اور حدیث شریف سے ہر قسم کا ترجمہ پارہ کے حساب سے، سورت کے حساب سے، لفظ کے حساب سے، آیت کے حساب سے یا مضمون کے حساب سے، انگریزی، اردو اور عربی میں پڑھیں، سنیں اور موبائل Android اور iPhone میں فری Download کریں۔ بخاری شریف، مسلم شریف اور مسندِ احمد کی مکمل احادیث سننے کا طریقہ احادیث سننے اور ڈاؤن لوڈ کرنے کیلئے YOUTUBE کے Search آپشن میں جا کر Search Quran لکھیں چینل کو سبسکرائب کریں اور ویڈیوز میں آپ Blue Background والی صحیح مسلم اور صحیح بخاری اور مسندِ احمد والی مکمل احادیث انگلش اور اردو میں دیکھ اور سن سکتے ہیں۔

E-mail
saifullahzia1@gmail.com